سرِ شام

نوشابہ صدیقی

سرِ شام

نوشابہ صدیقی

WELCOME BOOK PORT

سرِ شام

نوشابہ صدّیقی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

اشاعت : 2009ء

طباعت : اے بی سی پرنٹر

کمپوزنگ : محمد آصف

تزئین و آرائش : قمر زیدی

قیمت : 300 روپے

ناشر

ویلکم بک پورٹ

مین اُردو بازار کراچی۔ پاکستان

فون : 021-32639581/32633151

فیکس : 021-32638086

ای میل : wbp@welbooks.com

ویب : www.welbooks.com

ISBN : 978-969-500-007

contact author: ashernoor@gmail.com

گھر سے روسٹرم تک کی ہر ایک شام کا سفر
نثار کے ساتھ طے ہوا
''سرِشام''
زندگی بھر کے ساتھی نثار کے نام
کرتی ہوں

حُسنِ ترتیب

دل کی بات 7
بس اِک گوشۂ بساط اور عالی صاحب 11
اِن ساہوتو سامنے آئے — لطف اللہ خان 18
ذاکر صاحب اور ان کی دو آنکھیں 27
تین ساڑھے تین ملاقاتیں — مشفق خواجہ 36
پھول ابّا — علاّمہ شبیر احمد عثمانی 51
م سے منظر چچا 57
آواز کے جادوگر — زیڈ اے بخاری 65
یادیں ہی یادیں — سیّد محمد جعفری 74
وقت کا دل — مولوی ابوالحسن 82
بڑے باپ کے بڑے بیٹے — ڈاکٹر احسان رشید 90
جن کے مرنے سے مرگئی دِلّی — حکیم اجمل خان 96
ہمارے فرید صاحب 103
صدی کا آدمی — ایس ایچ ہاشمی 109
صلیب کے زخم — اور مجنوں صاحب 114
مادرِ مِلّت — فاطمہ جناح 124
نامی گرامی — حمید نظامی 129
دوست جو ابھی مرا نہیں 133

درخشاں ہیرا — عطیہ بیگم فیضی 149
خاتونِ باکمال و بے مثال - بیگم رعنا لیاقت علی خان 153
مکرّم بھائی — سب کے بھائی 159
سلام ٹیچر — تمام ٹیچر 166
دو اشعر 172
نُور جہاں کے گزرے موسم 177
زندانِ ذات کی شاعرہ — اُمّ سارہ 180
عابدراؤ — فوجی شاعر 186
سورج کی گواہی، حالات اور تم 193
عندلیب صدیقی — چاند کی طلبگار 201
رسالہ تہذیب کی سلور جوبلی کے موقع پر 206
انسانوں کی تازہ فصل کی کہانی 210
شبِ ماہتاب 215
یادگار پکنک معاشیات والوں کی 224
کالج کی یادیں — ساتھیوں کی باتیں 241
ڈبلن اسپیشل اولمپک سمر گیمز 2003ء 250
جامعہ کراچی شعبۂ ابلاغِ عامہ کی گولڈن جوبلی 256
زیرِلب 266

دل کی بات

سرِشام میرے اُن مضامین یا تقاریر کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف تقاریب میں پڑھی یا کی گئیں اور پھر مختلف جگہ شائع بھی ہوئیں۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ پھر باقاعدہ ایک کتاب کی کیا ضرورت تھی؟

ہاں یہ بہت سے لوگوں کی رائے ہوگی لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ بہت سے کام زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم صرف اپنے لیے کرتے ہیں اور اس سے صرف ہم ہی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سو یہ کتاب اگر کسی نہ کسی طرح آپ کے ہاتھوں میں آ گئی ہے تو یہ سمجھ لیں کہ یہ کام تو بس ہم نے صرف اپنے لیے کیا ہے۔

گھر چھوٹا ہے، کتابیں زیادہ ہیں۔ پانچ کمروں اور پانچ بیٹوں والے اس گھر میں ہر کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا ہے اور کئی الماریاں پُرانے اخبار، رسالے اور تراشوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی ڈائریاں بھی ہیں جن میں میرے پسندیدہ اشعار تحریر ہیں۔ پسندیدہ اقوال بھی درج ہیں۔ اچھے اچھے جملے بھی ہیں۔ کچھ یادداشتیں بھی ہیں جن کا شوق برسوں پُرانا ہے، یعنی بچپن سے ہے۔ اَن گنت تصاویر ہیں۔ کچھ قرینے سے البم میں جگہ پا گئی ہیں اور کچھ لفافوں میں بند زندگی کی خوبصورت کہانی سنا رہی ہیں۔ ان تصاویر میں

میرے ساتھ دائیں بائیں کھڑے بہت سے لوگ منظر نامے سے ہٹ گئے ہیں جن کے عکس دیکھ کر آج بھی ان کی یادیں آنکھوں میں آنسو بھر جاتی ہیں۔ آٹو گراف بک جن کے صفحات پر محبت اور نصیحت کے خوبصورت بول تحریر ہیں۔ بہت سے ادھورے افسانے، کہانیاں اور اپنے آپ سے کی گئیں باتیں درج ہیں جو مکمل ہو بھی جاتیں یا نہ بھی مکمل ہوئیں لیکن میرے ذہن میں ان کے تانے بانے عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ ادھورے خطوط جو مخاطب تک نہیں پہنچے جنہیں پہنچانا ممکن ہی نہ تھا۔ زیرِلب بہت سی باتیں جو خود کہیں خود سنیں، لکھیں اور لکھ کر ان سے انجان بن گئی۔ تنہائی میں وہ مجھ سے اکثر مخاطب ہوتیں، شکوہ بھی کرتی ہیں۔ میں ان تمام تحریروں کو کیونکر سمیٹوں کہ یہ تو صرف میرے کام کی چیزیں ہیں دوسروں کے لیے محض کاغذ کے پُرزے ہیں۔ جس دن میں انہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی یہ تحریریں گونگی ہو جائیں گی کہ یہ ہر اس تحریر اور تصویر کا مقدر ہے جو کتاب کے اوراق میں سما نہ سکی ہوں۔

یہ احساس دھیرے دھیرے مجھ میں سما چکا ہے کہ میری زندگی کی شام شروع ہو چکی ہے۔ موجودہ ملی ہوئی زندگی محض اضافی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنے بچوں کو اس امتحان میں ڈالوں کہ میرے بعد جب وہ میری چیزوں کو بانٹیں تو کتابوں، کاغذوں، ڈائریوں اور تحریروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپیں اور انہیں ضائع کرتے وقت وہ دل میں کسی گناہ کا احساس پیدا ہونے پر شرمندہ ہوں کہ وہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ مجھے اپنے پُرزے پُرزے کتنے پیارے ہیں۔

میں نے سوچا انہیں اپنے ہاتھوں سے تلف کر کے الماریاں خالی کردوں تاکہ میرے بعد ان خالی جگہوں میں میرے بچوں کے بچے اپنے کھلونوں سے انہیں بھر دیں اور کتاب کی صورت میں میرے یہ چند مضامین محفوظ بھی ہو جائیں اور جگہ بھی کم گھیریں۔

ان مضامین یا تقاریر کے بارے میں مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ انہیں شامل کرتے وقت

نہ ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے نہ شخصیتوں کے قد کاٹھ کا، نہ تاریخ نہ موقع زیرِ غور رہا۔ بس ایک کے بعد دوسرا مضمون جگہ پاتا رہا بعض کی تاریخیں موجود نہیں، سو انہیں بغیر تاریخ کے شامل کرلیا۔ بعض مضامین بہت پُرانے ہیں ان میں حالات کے مطابق کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بعض بڑی بڑی شخصیتوں پر اپنی کم علمی کے باعث بہت معمولی مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ شخصیت پر تو خیر کوئی فرق نہیں پڑا ہاں میری جہالت نمایاں ضرور ہوگئی۔ کچھ تحریریں تو بس ایک دن کی مہلت میں مکمل ہوئیں۔ ہاں چونکہ یہ میرے اپنے قلم سے رقم ہیں تو مجھے عزیز ہیں میں انہیں پان لپیٹ کر یا پڑیا بنا کر ضائع ہونے سے بچانے کا تو حق رکھتی ہوں۔ کچھ تقاریر اور مضامین شریک ہونے سے رہ گئے کہ سمجھئے ان کا یہی نصیب تھا۔

اپنے چلے جانے سے قبل میں ان تمام شاموں کو ایک بار ذہن میں تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ دن، تاریخ، سال، موقع، وہ شخصیتیں جن پر میں نے کچھ کہا اور وہ سامعین جو میرے سامنے بیٹھے تھے، وہ ناگواریاں، وہ خوشگوار مسکراہٹیں، وہ ہوٹنگ جو نہیں ہوئیں، وہ تالیاں جو بجیں۔ میں سب کچھ یاد کرنا چاہتی ہوں۔ ان تحریروں کو مرتب کرتے ہوئے وہ تمام شامیں جو مجھے یاد آگئیں مجھے سکون بخش گئیں۔ میں نے ان لمحوں، ان جذبوں کو شدت سے محسوس کیا کہ گزرے لمحے ٹھنڈے میٹھے شربت کی طرح ہیں جو انتہائی گرم موسم میں سارے وجود کو ٹھنڈک بخش دیتے ہیں۔

کسی کسی شام میں نے یہ لمحات اپنی گھریلو مصروفیات میں سے بڑی مشکل سے چھینے تھے۔ بچے چھوٹے تھے وہ وقت ان کا تھا۔ ان کے ہوم ورک سے نظریں بچانا، ان کی بیماریاں، عزیزوں کی تقاریب سے ان کا تصادم، بہت کچھ ہوا، بچ بچا کر جو لمحات میں چُرا پائی وہ شامیں اس وقت مشکل مگر آج میری بڑی خوبصورت یادیں ہیں جو "سرِشام" کے عنوان سے مرتّب ہو چکی ہیں اور کسی نہ کسی طرح آپ کے ہاتھوں میں آگئی ہیں۔ میں چاہوں گی کہ اس کے مطالعے کے لیے میں آپ کی زندگی کی ایک شام چُرالوں اگر آپ کو بُرا نہ لگے۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ 1975ء کے بعد کی تمام شامیں نثار کے بغیر گزارنی ممکن ہی نہ تھیں۔ میں آج اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ ان کی ہمراہی کے بغیر گھر سے روسٹرم تک میں پہنچ ہی نہیں پاتی کہ اکیلے سفر کے خوف میں ہمیشہ ہی مبتلا رہی۔

میں زندگی کی بقیہ شاموں کو بھی اپنے گھر، اپنے بچوں، اور اپنے نثار کے ساتھ گزارنا چاہوں گی۔ اس وقت تک کہ وہ آخری شام نہ آجائے کہ جس کے بعد پھر کوئی شام نہ ہو۔

نوشابہ صدیقی

E-mail : ashernoor@yahoo.com
Phone : (021)35870600

بس اِک گوشۂ بساط اور عالی صاحب

آج کی تقریب میں ڈائس پر میرا ہونا باعثِ حیرت ہے۔ بڑوں کی محفل بڑوں کیلئے سجائی جاتی ہے تاکہ کہنے والے جو کچھ کہیں وہی سننے والے سمجھ بھی سکیں اور جب سننے والے پائے کے ہوں تو کوتاہ قد کہنے والے کے پاؤں نہ ڈگمگا جائیں۔ وہ تو بھلا ہو کہ ہر صبح میرے سامنے روسٹرم اور مائیک ہوتا ہے اگرچہ سننے والے صرف طالب علم ہی ہوتے ہیں مگر اس سے یہ فائدہ تو ہے کہ زمین پر پاؤں جم جاتے ہیں ورنہ پاؤں کا جمانا مذاق نہیں۔

مجھے ایسے موقعہ پر محسوس ہو رہا ہے کہ سمجھداروں کی محفل میں ایک کم عقل، کم عمر بچے کو منہ کا ذائقہ بدلنے کیلئے اس کی استانی کی سکھائی ہوئی POEM سنانے کیلئے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں بچہ بغور ایک ایک شخص پر نظریں جماتا ہے اور ہر طرف سے جب داد اور واہ واہ ملنے کی امید ہوتی ہے تب وہ اپنی تمامتر ہمتوں کو جمع کرتا ہے اور POEM شروع کر دیتا ہے۔ آیئے اسی کم عقل کم سمجھ نادان بچے کی طرح میں بھی آپ کو وہی POEM سناؤں جو برسوں پہلے میری استانی نے مجھے یاد کرائی تھی۔ اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کی نہ تب کوشش کی تھی اور نہ اب۔ لیکن آج اچانک مجھے اس کی چاروں لائنیں یا یوں کہیے چاروں مصرعے سمجھ میں آ گئے۔

Twinkle twinkle little star
How I wonder what you are
Up above the world so high
Like a diamond in the sky

آج میرا ظاہری قد دیکھ کر داد دیں یا نہ دیں لیکن یہ اجازت ضرور دیں کہ میں آج

اس POEM کو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اس شخص کے نام کردوں جس کا نام جمیل الدّین عالؔی ہے۔ اور جسے پڑھنے کی میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ شاعر نثر نگار، دوہا نگار، کالم نگار، خاکہ نگار اور بینکار جس کی شاعری کی ہر صنف نے اپنا جائز مقام حاصل کیا۔ لیکن جہاں اس نے بہتوں کو متاثر کیا، چند ایک کے دل بھی جلے، تب میں نے ایک تنقید پڑھی کہ لکھنے والے نے لکھا اور کہنے والے نے کہا کہ آٹھ لفظ کے ایک مصرعہ میں چار بار جیوے اور چار بار پاکستان لکھ دینے سے کوئی شاعر تھوڑی ہو جاتا ہے۔ تب ایک شعر میری نظر سے گزرا۔

؎ انجمن کی انجمن مجھ سے مخاطب ہوگئی
آپ نے دیکھا تھا شاید بے نیازانہ مجھے

عالؔی صاحب کے فن پر اور ان کی شخصیت پر بڑی بے معنی تنقیدیں اور جان لیوا حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ حوصلے کے ساتھ ان تنقیدوں اور حملوں کا مقابلہ کیا۔ بہادری سے اپنی جگہ کھڑے رہے ایک کے بعد ایک تخلیق سامنے لاتے رہے، ادب کو مالا مال کرتے رہے اور ادارے مستحکم کرتے رہے مجھے اجازت دیجئے کہ میں عالی صاحب کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر کہوں۔

Twinkle Twinkle Little Star
How I wonder what you are

زیر گفتگو کتاب ''بس اک گوشۂ بساط'' بقول ادیب سہیل بس اک گوشۂ بساط کا ہے کو ہے یہ تو ایک مکمل بساط کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل تحریروں میں کچھ تو خاکے ہیں۔ کچھ مضامین اور کچھ تاثرات ہیں لیکن جس پر تھوڑا بہت بول پاؤں گی یا بولنا چاہوں گی وہ ہے ان کی خاکہ نگاری۔

ہر شخص اپنے آپ کو آسودہ کرنے کیلئے اپنی اپنی پسند کی صنف کو چُنتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے آپ بیتی یا دوسروں کے خاکے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جنہیں ہم نے زندہ نہیں دیکھا انہیں دوسروں کی نظروں سے ہی دیکھ لیا جائے۔ اور اپنے ہی

زمانے کے جن لوگوں سے ہم مل نہ سکے انہیں دوسروں کی تحریروں کے ذریعے پہچان پائیں۔ میں یہ بات حتمی طور پر یوں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا لیکن ''گنج ہائے گرانمایہ'' میں انہیں میں نے رشید احمد صدیقی کی نظروں سے دیکھ لیا۔

اسکیچ کیلئے اردو میں خاکہ نگاری کا لفظ مروّج ہے۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے کہ جس میں کسی انسان کے کردار اور افکار دونوں کی جھلک ہو۔ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت' اس کی سیرت' اس کا مزاج' اس کے ذہن کی افتاد' اس کا زاویۂ نظر' اس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آ جائیں۔ شاعری میں مبالغہ ہوسکتا ہے۔ نثر میں عبارت آرائی اور تخیل کی آمیزش ہوسکتی ہے لیکن خاکہ ایسی صنف ہے کہ جس میں رورعایت ہو یا مبالغہ اور مدح سرائی تو پھر وہ خاکہ نہیں ہوتا' وہ تاریخ اور سوانح بھی نہیں۔ خاکے میں تو کارناموں سے زیادہ کارگزاریاں شامل ہوتی ہیں۔ خاکے میں لطیف مزاح اور نکتہ آفرینی ضروری ہے لیکن طنز کی گنجائش نہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کا بیان بھی خاکہ نہیں۔ مولوی عبدالحق کے' نام دیو مالائی اور نور خان کے خاکے اعلیٰ درجے کے' اور وہ معمولی لوگ تھے لیکن انہیں پڑھ کر ماحول میں روشنی محسوس ہوتی ہے۔

اگر ہم شخصی خاکوں کی تاریخ میں جائیں تو انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت سے بات شروع کرتے ہیں اسے ہم خاکہ نگاری کا پہلا دور قرار دیں گے۔

محمد حسین آزاد کی آب حیات' فرحت اللہ بیگ نذیر احمد کی کہانی' خواجہ حسن نظامی کے خاکے' مولوی عبدالحق کے چند ہم عصر' عبدالرزاق کانپوری کی یاد ایام' آغا حیدر دہلوی کی پس پردہ' برج نارائن چکبست کے مضامین چکبست' عبدالماجد دریا آبادی' رشید احمد صدیقی' عبدالمجید سالک کی یارانِ کہن' اپنے فن کی آپ مثالیں ہیں۔

دوسرے دور میں سردار دیوان سنگھ مفتون کے خاکے' ناقابل فراموش' مالک رام کے خاکے' تمکین کاظمی' اعجاز حسین' اشرف صبوحی' شاہد احمد دہلوی' غلام احمد فرقت اور تیسرے دور میں بڑے نام چراغ حسن حسرت' شوکت تھانوی' عصمت چغتائی' منٹو' ممتاز مفتی' محمد طفیل

فکر تونسوی، ابوالفضل صدیقی، معین الدین دردائی، تابش دہلوی اور بالکل حال اسلم فرخی اور نذر الحسن صدیقی۔

ہم نے آبِ حیات یعنی محمد حسین آزاد کے دور کے لوگوں کے ناک نقشے اور ان کی کارگزاریاں خاکے کے فن کے ذریعے تعارف حاصل کیا۔ اور اسلم فرخی کے "آنگن میں تارے" تک آتے آتے ہمیں وہ لوگ ملے جو ہمارے ہی دور کے لوگ تھے، ہم نے ان کے نام سن رکھے تھے انہیں پڑھا بھی تھا لیکن اس قدر متعارف نہیں ہوئے تھے کہ خاکے کے ذریعے ان سے مل لئے اور جن سے نہیں مل پائے تھے جناب جمیل الدین عالی نے اپنی صحبتوں میں گزارے ہوئے دنوں کی تفصیل اپنے انداز سے سنا دی۔

"سراج الدین خاں سائل کا خاکہ پڑھیے آپ کی ملاقات وہاں خاکہ نگار عالی سے بھی ہوگی۔ ساتھ ساتھ سراج الدین خاں سائل جس دور میں زندہ تھے اس کی تصویر قلم سے نہیں بلکہ کیمرے سے کھینچی گئی تصویر لگے گی۔" سائل نے بیٹی کے انتقال پر دامنِ صبر نہ چھوڑا مگر اندر ہی اندر گھلتے گئے۔ آہیں بھی بھرتے اور مسکراتے بھی۔ اور پھر جب پوچھا گیا کہ کیا یہ آپ کی زندگی کا سب سے تلخ تجربہ ہے۔ تب کہتے تلخ نہ کہو۔ تجربہ نہ کہو۔ اللہ کی مرضی ہے وہ سسکیاں روک لیتے۔ 75 برس کا بوڑھا اپنے پیاروں کی موت سے بڑی ملنساری کے ساتھ پیش آتا۔"

"شیخ عبدالقادر کے بارے میں استفسار پر بولے ہاں وہ لاہور کے ہیں۔ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور بہترین اردو لکھتے ہیں۔ بیٹا پہلے پڑھو، لکھو اور پھر لوگوں کے وطن تلاش کرو"

اُن کے پاس مُشک ہمیشہ رہتا تھا اور ان کی بیاضوں سے لے کر ان کے کمرے، دالان اور آنگن تک میں مہکیں آتیں۔ میں نے ان کا تھوڑا مُشک چرا لیا۔ انہیں پتہ چلا تو پورا نافہ لے کر آ گئے اور عنایت کر گئے۔ وہ مُشک آج بھی میرے پاس ہے مگر اس میں وہ پہلی سی مہک نہیں رہی۔ وہ مہک شاید مُشک والے کی اپنی تھی۔ وہ مہک شاید صدیوں کی

مہک تھی ان اقدار کی جنہوں نے سائل دہلوی کو جنم دیا تھا۔

ایک سائل کے خاکے سے آپ خود ظاہر ہو جائیں گے۔ بےخود عریاں ہو جائیں گے۔ آپ جگر کو جان جائیں گے۔ میرا جی کو پہچان جائیں گے۔ انیسویں صدی کی تہذیب و تمدن کا سارا ذائقہ چکھ سکیں گے۔ پڑھتے جائیں گے۔ جی نہیں بھرے گا اور پھر آپ کہہ اٹھیں گے۔

Twinkle twinkle little star
How I wonder what you are

مخدوم طالب المولیٰ کا خاکہ اس اعتراف کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ خاکہ نگار کی ان سے صرف چند ملاقاتیں تھیں لیکن اتنی متاثر کن کہ ان پر بھرپور خاکہ لکھا گیا وہ کہتے ہیں کہ یہ خاکہ تو ایک بڑے رجسٹر میں صرف حاضری لگانے کی سعادت ہے۔

خاکہ سورج جیسا آدمی۔ ممتاز حسن کی شخصیت کی ساری کہانی دھیرے دھیرے سنا دیتا ہے۔ وہ ایک بیوروکریٹ' ایک ماہر مالیات' بینکر' منتظم' اسکالر' دانشور' ادیب' مقرر اور کیا کچھ نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت کی تتلی کے یہ سارے رنگ یہ کہتے تھے کہ اللہ مہربان ہو تو ایک آدمی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک سورج کی طرح تھے جس سے تمام ستارے اور سیّارے روشنی پاتے تھے۔ ان کے ظاہری تضادات' ان کرنوں کی سمتیں اور رنگ تھے جو ان کا مخزن حاصل کر لیتا تھا وہ انہیں جان لیتا تھا۔ بتائیے صرف ان چند لائینوں سے ممتاز حسن کیا آپ کے سامنے آ کر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ بس یہی تو خاکہ نگاری ہے۔ کیا آپ خاکہ نگار کیلئے نہیں کہیں گے۔ How I wonder what you are

جمیل نشتر کیلئے چند لائنیں بھی پڑھ لیں تو جمیل نشتر کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں "جس حد تک بھی ممکن ہو وہ کسی لینے والے کو کچھ دینے میں پہل کرتے تھے۔ وہ تو اندازہ کر لیتے تھے کہ کوئی ملنے والا ماتحت ساتھی کچھ طلب کرنیوالا ہے۔ پھر وہ بڑی ذہانت سے اسے طلب کرنے سے بچا لیتے اور بات سے بات نکال کر حتی الامکان اس کی غرض اسی طرح پوری کر دیتے کہ اسے سوال کی خجالت محسوس نہ ہو"

بے شک یہ جمیل نشتر کی شخصیت کی خوبی تھی لیکن کیا یہ خاکہ نگار کی تحریر کا حسن نہیں' دلکش

انداز نہیں کہ جو سارے سراپے میں روشنی سی بکھیر دے۔ خاکہ نگار کی طرف دیکھئے اور کہیے۔

How I wonder what you are

سلیم احمد کا خاکہ تو لگتا ہے دل خون کیا تب لکھا۔ محبت سے لکھا اور مسحور ہو کر لکھا۔ جذب ہو کر لکھا۔ اور گم صُم ہو کر لکھا۔

''جب وہ بولتا تھا تو ایسا لگتا کہ وہ آپ کو پکڑ کر اللہ کے حضور لے جا رہا ہے۔ اور روشنی کا ایک دربار کُھل گیا ہے۔ اس سے گفتگو کر کے مجھے محسوس ہوتا کہ زندگی کے اَن گنت بند دریچے کھل گئے ہیں۔

اختر الایمان کا خاکہ بھی گویا یادوں کا بہتا دریا ہے۔ خیالات' واقعات' احساسات' جذبات' سب کچھ کا بیکراں اور ٹھاٹیں مارتا سمندر ہے۔ شیفرز قلم میں بھری ہوئی کوئینک (Quink) روشنائی نے صفحے پر لفظ بن کر خاکہ کا تانا بانا بنا ہے۔ اُختر الایمان اپنے کارناموں اور کمزوریوں سے زندہ ہوتے گئے۔ خاکہ نگار کے روئیں روئیں میں سماتے گئے۔ زندگی میں جتنے بھی احسان اس نے محض دوستی سمجھ کر کئے تھے خاکہ نگار نے قلم کے ذریعے قرض ادا کر دیا۔ لگا کہ اختر الایمان کو ہم نے بھی دیکھا ہے اور ہم پھر یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

How I wonder what you are

میر خلیل الرحمٰن ابھی ہماری یادوں میں موجود ہیں کہ ہمارے ہی دور کے انسان تھے لیکن خاکہ نگار نے تو گویا خلیل الرحمٰن کو مرنے ہی نہیں دیا۔

How I Wonder What You are

محمد حسن عسکری' حکیم یوسف حسن' الطاف بریلوی' محشؔر بدایونی اور پھر رفعت سروشؔ' کاش رفعت سروشؔ سے ہم بھی ملتے!

خاکے کے ذریعے ملاقات کا اشتیاق پیدا کرنا آسان بات تو نہیں۔ نہیں جناب اس کیلئے آپ کو تو اعتراف کرنا ہی ہوگا۔ How I wonder what you are

حمید کاشمیری پر کارلائل کا صرف ایک فقرہ لکھ کر گویا حمید کاشمیری کو سند دلادی۔

''بہتر انسانوں کی برتری کا اعتراف نہ کرنا اپنے ہی۔ چھٹ پن کو چھپانا ہے۔''

عالؔی صاحب نے خاکہ آدمیوں کا لکھا ہے کہ خاکہ تو آدمیوں کا ہی لکھا جاتا ہے جہاں خیر و شر ساتھ ساتھ رہتے ہیں خاکہ فرشتے کا نہیں لکھا جاتا نہ ہی خاکہ بڑے بڑے لوگوں سے اپنے رشتے جوڑنے کا نام ہے۔ غزل کی مانند خاکہ نگاری بھی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی وہ خوردبین ہے جس کی ہر جنبش سے زندگی کے نت نئے نقوش بنتے نظر آتے ہیں۔ یہ نقوش ہم نے ''بس اک گوشۂ بساط'' میں دیکھے۔

میں اپنی Poem پوری کرنے کیطرف آتی ہوں۔ Up above the world so high عالؔی صاحب اگر آپ کسی سے صرف چند ملاقات پر اپنا خاکہ تعمیر کرسکتے ہیں تو ہم نے تو آپ کی بے شمار تحریریں پڑھی ہیں۔ اَن گنت مشاعرے سُنے ہیں۔ روسٹرم پر ادبی اور باغیانہ تقریر کرتے سنا ہے۔ صدارت کرتے' کھانا کھاتے' جُملے چباتے' مسکراتے' ہاں' نہیں کرتے اور ایک دوسرے کے کام آتے دیکھا ہے۔ دنیا میرے آگے کی ڈیڑھ سو قسطیں پڑھی ہیں۔ آپ کے اظہاریے سے ہر اتوار کی ابتدا ہوتے دیکھی ہے۔ دوہے پر لوگوں کو سر دُھنتے دیکھا ہے۔ قومی نغموں پر جھومتے گاتے دیکھا ہے۔ ہم نے تو آپ کو بے غرضی سے غرض مند کی غرض پوری کرتے دیکھا ہے۔ پھر نظریں پھیرتے بھی دیکھا ہے۔ ربط توڑتے بھی دیکھا ہے۔ رشتے نبھاتے بھی دیکھا ہے اور یہ سب کچھ بھی جانا ہے کہ آپ احسان کرکے بھول جانے پر مصر رہتے ہیں۔

آیئے! پھر سے چھوٹا منہ بڑی بات۔ میں اپنی بساط بھر آپ پر کیوں نہ خاکہ لکھ دوں۔ لیجیے! میں نے اپنے خاکے کا تو عنوان رکھ بھی دیا ہے۔

Likc a diamond in the sky

اور لیجیے میں نے تو اپنا خاکہ مکمل بھی کر دیا۔

''Like a diamond in the sky''

(17 اپریل 2004ء، دائرہ ادب و ثقافت کی جانب سے منعقد کردہ تقریب بمقام ریجنٹ پلازہ کراچی، صدر: آفتاب احمد خان، مہمانِ خصوصی: محمد میاں سومرو)

☆☆☆☆

اِن سا ہوتو سامنے آئے ـــــ لطف اللہ خان

بیسویں صدی اس لحاظ سے بڑی اہم صدی ہے کہ اس دور میں ادب' آرٹ' ثقافت' سائنس' اور تاریخ میں بڑا نام پیدا کرنے والی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے شعبے میں کمال حاصل کیا۔ تاریخ میں اپنا نام یوں درج کرایا کہ ثانی پیدا ہونے میں شاید کئی اور صدیاں درکار ہوں۔ وہ لوگ صدیوں کی پہچان بن گئے۔ بڑی بڑی تحریکیں شروع ہوئیں۔ نقطۂ کمال تک پہنچیں۔ اہم ایجادات ہوئیں جو جادوگری سے مشابہ قرار پائیں۔ تباہ کن آلاتِ حرب بنائے گئے۔ تباہیاں ہوئیں اور اسی صدی میں ان نام ونشان تک مٹا دینے والی قوموں نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ دنیا کے نقشے پر ایک ایسے ملک کا جغرافیہ تحریر ہوا جس کے لیے فکری جنگ ہوئی اور ہتھیاروں کی لڑائی کے بغیر ایک نیا پرچم فضا میں لہرا گیا۔ گویا معجزے بھی ہوئے۔

لطف کی بات ہے کہ بیسویں صدی نے اپنے آغاز سے اپنے انجام اور پھر نمائندگی کے لیے آئندہ صدیوں کیلئے چیلنج کے طور پر ایک لطف اللہ بھی پیدا کیا جس کا ثانی ساری دنیا میں آپ تلاش کر لیجئے دوسرا نہیں ملے گا۔

محترم حاضرین اسے میری مبالغہ گوئی پر محمول نہ کیجئے۔ آج کی تقریب کے شرکاء یہاں آئیں گے اور میری بات کی تائید کریں گے۔ 80 برس کے لطف اللہ صاحب جنہوں نے آج تک اپنے آپ کو چھپا چھپا کر رکھا ہے آج ہم فخر کے ساتھ ان کا تعارف آپ سے کراتے ہیں۔

اگر میں ان کے لیے کچھ بھی کہنے سے پہلے ایک شعر پڑھنے کی جسارت کروں تو بہت مختصر الفاظ میں ان کا تعارف آپ سے ہو جائے گا۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

لطف اللہ صاحب سے اگر کسی کا تعارف ہے تو بس اس پہلو سے کہ آپ نے ہندوستان اور پاکستان کی اہم آوازوں کو برسوں سے محفوظ کرنے کا شوق پال رکھا ہے۔ پچاس سال میں کتنے عظیم لوگ آئے اور چلے گئے اور تب آواز محفوظ کرنے کی اہمیت کا بھی کسی کو احساس نہ تھا اور نہ ابھی وہ ذرائع ہر ایک کو میسر تھے کہ آواز محفوظ کی جا سکتی ہو۔ مگر یہ جنون لطف اللہ صاحب کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔

موسیقار، ادیب، شاعر، دانشور، محقق، سیاسی شخصیتیں، علمائے کرام، آرٹسٹ، بعض شعبوں میں اہمیت پا لینے والی ہستیاں ان کی آوازوں کا خزانہ لطف اللہ صاحب کے مثالی خزانے میں محفوظ ہے اور یہاں پھر آپ میری بات کو مبالغہ گوئی پر محمول نہ کیجیے گا کہ اس کام کے کرنے میں ادارے بھی ناکام ہو جاتے ہیں جب ہی تو بی بی سی جیسا ادارہ بھی بعض موقعوں پر لطف اللہ صاحب سے مدد مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یقیناً بی بی سی ایسا ادارہ ہے کہ اس کے پاس نایاب ادبی شخصیتوں کی آوازیں محفوظ ہیں مگر پھر مذہب کا خانہ خالی ہے۔ بائبل سوسائٹی کا نام لیتے ہیں تو مذہب موجود ہے ادب غائب ہے چیدہ چیدہ آپ کو ادھر سے اُدھر کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا لیکن ایک نام اور اتنے پہلو سے سلیقے کے ساتھ یہ کام صرف لطف اللہ صاحب کے خزانے میں موجود ہے۔

حاضرین کرام! لطف اللہ صاحب کی زندگی کے خانے میں کئی فن پوشیدہ ہیں انہیں بیان کرنے کے لیے کسی بڑے مشاق کی ضرورت ہے۔ میں تو بس اپنے علم بلکہ کم علمی کے باعث تھوڑا بہت ہی جانتی اور بتا سکتی ہوں۔

لطف اللہ صاحب فوٹو گرافی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی

کی پہلی تصویر 12 سال کی عمر میں کھنچوائی۔ اس زمانے میں اور ان کے گھرانے میں تصویر کھنچوانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جہاں تصویروں والا کوئی کلینڈر بھی دیوار پر آویزاں کرنے کی اجازت نہ ہو۔

ایک رشتہ دار کی مدد سے لطف اللہ صاحب کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر آئی تو انہوں نے اپنی پھوپھی کی مدد سے تین چار بار صابن لگا لگا کر نہانے کے بعد مختلف لباسوں اور مختلف پوز میں تصویر کھنچوانے کے شوق میں پورا دن اور پوری رات بسر کی۔ مطلوبہ گھڑی بھی آ گئی اور تمام رِیل ان پر صرف ہوگئی۔ چپکے سے لطف اللہ صاحب نے کیمرہ کھول کر رِیل نکالی اور اپنی تصویر بے چینی سے تلاش کی مگر پوری رِیل میں انہیں اپنی تصویر کہیں نظر نہیں آئی۔ بچپن کی اس معصومیت اور ناکامی نے انہیں ماہر فوٹوگرافر بنا دیا۔

1946ء سے بلیک اینڈ وائٹ تصاویر کھینچنے سے لیکر ڈویلپنگ اور پرنٹنگ تک کے مراحل طے کئے۔ ایک وقت تھا کہ مکمل طور پر ڈارک روم بھی ہر قسم کی ضروریات سے خود کفیل تھا۔

16mm کی فلمیں شوٹ کرنے کا بھی پورا سامان ان کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے 56-1951 تک مختلف ڈاکومینٹر یز بھی تیار کیں۔ فوٹوگرافی کا شوق پورے 52 برس پر پھیلا ہوا ہے کوئی برس دو برس کی بات نہیں دراصل لطف اللہ صاحب میں مہارت اور کام کے ہر پہلو میں تیکنیکی باریکیاں پیدا کرنے کا شوق رہا ہے لہٰذا جو کیا پورے تقاضے پورے کرنے کے بعد کیا۔

پھولوں کی نمائشیں ہوں۔ آثارِ قدیمہ کی تصویر کشی ہو' چاہے عراق ایران اور شام کی زیارتیں ہوں ان کی سلائیڈ بنائیں۔ مساجد اور بزرگانِ دین کے مقبروں کی ٹرانسپرنسی بھی بنائیں۔ ایک سلسلہ نامور مسلم شخصیات کا بھی شروع کیا جس میں بابر' غزنوی' ابو طاہر' بوعلی سینا' فردوسی' خیّام' حافظ' سعدی' جامیؔ' صلاح الدّین ایوّبی' جمال الدّین افغانی' کمال اتاترک وغیرہ کی آرام گاہوں کی تصاویر بنائیں۔ بزرگان دین کے مقبروں کی بھی تصاویر

بنائیں۔ ان میں حضرت ابوایوّب انصاریؓ حضرت حسینؓ، عبدالقادر جیلانی، امام ابوحنیفہؒ اور مولانا روم کے مقدّس مزارات کی تصاویر شامل ہیں۔

پھر برّصغیر کے شاعر، ادیب، دانشور، ناقد، محقق، موسیقار اور فائن آرٹ کے نمائندوں کی تقریباً چار سو تصویریں بنائیں۔ صادقین نے سورۃ الرحمٰن کی چالیس پینٹنگ بنائی تھیں۔ انہوں نے ان سب کی تصاویر اتار لیں۔

قائداعظم کے مزار کے نیچے زمیں دوز مزار بنا ہوا ہے۔ یہ اوپر کے ڈھانچے سے مختلف ہے۔ یہی نہیں اس کا پورا نقشہ ہی اور ہے جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے اس ماحول کی تمام وکمال تصویر کشی کی ہے۔

آج بھی کمرشل فوٹو گرافی کا اپنا کام لطف اللہ صاحب اس عمر میں بھی انجام دے رہے ہیں اور اپنے شاہکار پرنٹ سے انہوں نے اپنا اسٹوڈیو آراستہ کیا ہوا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے آگاہ آج کے فوٹو گرافر لطف اللہ صاحب سے مقابلہ کرتے گھبراتے ہیں۔ Three dimension لطف اللہ صاحب کی خود کی تصویر اس فن کا شاہکار ہے۔

لطف اللہ صاحب نے زندگی میں کسی ایک شوق کو نہیں پالا۔ کئی در ہیں اور ہر در حیران کر دینے والا۔ آیئے انہیں اہلِ قلم کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ مدراس میں پیدا ہونے کے ناطے زباں تامل ہے اور اردو اکتسابی زبان ہے۔ پہلا مضمون 1932ء میں چھپا۔ 1943 میں مختصر کہانیوں پر مشتمل ''پہلو'' نامی کتاب شائع ہوئی۔ اپنی خودنوشت صرف اپنے بچوں کیلئے تحریر کی۔ یہ ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہ آج کے بچے اور خاندان کے دیگر لوگ 25 برس پہلے والے جنوبی ہند کے ثقافتی پس منظر کو سمجھیں اور جانیں کہ ان کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ آج کل انگریزی میں ''The music of Pakistan'' پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سے قبل غالبؔ کے مکمل دیوان کو رومن کیریکٹر میں تبدیل کر چکے ہیں جسے Transliteration کہا جاتا ہے۔

''تماشائے اہلِ قلم'' کے نام سے دس مشہور ہستیوں جن میں راشدؔ، جگرؔ، جوشؔ، حفیظؔ،

عصمت، قمر جلالوی وغیرہ شامل ہیں ان کی صحبت میں گزارے ہوئے دن و رات تحریر کر رہے ہیں جو یقیناً ایک چونکا دینے والی کتاب ہوگی۔ ''ہجرتوں کے سلسلے'' ان کی آئندہ آنیوالی اہم کتاب ہے جس میں ان کی ہجرت کے سالوں سال کے مشاہدے اور تجربے ہیں قاری تک پہنچیں گے۔

حاضرینِ کرام! اگر میں آپ کو بتاتی چلوں کہ لطف اللہ صاحب کو یورپ، امریکا، افریقہ کے بے شمار ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا کہ سیاحت بھی اُن کا ایک اور شوق ہے۔ دردر کی سیاحی میں آپ نے جلد سازی کا مطالعہ کیا اور ہر جگہ کی جلدیں اپنے ساتھ لائے لیکن اپنی کتابوں کیلئے کہیں کی جلدیں پسند نہ آئیں۔ تب انہوں نے فن جلد سازی کی تاریخ اور طور طریقے پڑھے۔ اس میں خود مہارت حاصل کرنے کی ٹھانی۔ جب جنون دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو مقصد حاصل کرنے میں انسان ناکام نہیں رہتا۔ آج بہترین جلد ساز ہیں۔

لطف اللہ صاحب نے زندگی کے بیشتر سال کلاسیکل موسیقی کی تربیت حاصل کرنے پر صرف کیے۔ موسیقی کے آلات جس خوبی اور خوبصورتی سے آپ نے اپنے آڈیٹوریم میں سجا رکھے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا چھوٹا سا قیمتی آڈیٹوریم صفائی، خوبصورتی اور سکون کا منہ بولتا ثبوت ہے جہاں جاکر موسیقی کے گہرے سمندر میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔ آڈیٹوریم میں داخل ہوتے ہوئے لطف اللہ کا یہ کہنا کہ

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

دنیا کی بے ثباتی پر جی افسردہ کر دیتا ہے۔ انہوں نے برصغیر کی کلاسیکی موسیقی کے اہم ساز جیسے بین، ستار، سرود سارنگی، تان پورا اور پکھاوج، ان کی بے شمار تصویریں اتاری ہیں۔ ساڑھے تین ہزار سے زائد سلائیڈ کا ذخیرہ لاتعداد موضوعات سمیٹے ہوئے ہیں۔

لیکن پھر جب زندگی سے بھرپور اور پرسکون گوشہ جو لطف اللہ صاحب کی لائبریری ہے جاکر ہم دنیا کی بے ثباتی کو بھول جاتے ہیں اور زندگی پھر سے رواں دواں ہو جاتی ہے۔ چاروں طرف اوپر نیچے نایاب و کمیاب کتابیں سلیقے سے رکھی ہیں اور جہاں ایک ایسا

ریک بھی ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام اوراق فائل میں تاریخ وار چنے ہوئے ہیں۔ انہیں کب کھانسی ہوئی' بلڈ پریشر کا حملہ ہوا' عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے۔ ضعفِ سماعت سے دوچار ہوئے۔ جن ڈاکٹروں سے علاج کرائے' تمام کے نسخے' ہدایات اور ادویات کی فہرست موجود ہے۔ اگرچہ یہ کاغذ کے پرزے ہیں لیکن سوچیئے تو یہ لطف اللہ صاحب کی زندگی کے قرینے اور جینے کے انداز کو ظاہر کرتے ہیں۔

کیا آپ یہاں تک سوچ سکتے ہیں کہ 1920ء سے 1930ء تک کے سینما پمفلٹ جن کی تعداد ایک دو نہیں 641 کے قریب ہیں۔ فلمی اداکاروں کے فوٹو گراف' سیفٹی میچ باکس کے کور لیبل' کمیاب اور نایاب سکے' اسٹیشنری آئٹم' قلم' پن' گوند' نب' کلپ' سگریٹ' سگار' کلر پنسلیں' ان کی تمام مرحلہ وار اقسام' چاک' بال پوائنٹ' پینٹنگ برش' رولر' شارپنر' قینچیاں' چاقو' Clippers لکھنے کی میز کی تمام Accessories سفری آلات' دوستوں' فیملی ممبرز اور ذاتی پسند کے تمام لوگوں کی تصاویر اور دیگر بہت ساری چیزیں جنہیں لطف اللہ صاحب نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں برتا۔ تاریخ کا حصہ بن کر ان کے اسٹوڈیو میں سجی سجائی رکھی ہیں کہ ان سے تو ان تمام چیزوں کی مرحلہ وار ایجادات کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

اور تو اور لطف اللہ صاب نے ایک ورکشاپ بھی بنائی ہوئی ہے جہاں ٹول کیبنٹ میں آپ کو ہر قسم کے اوزار' ہتھیار' کیل' پن ہتھوڑے' اسکرو ڈرائیور اور سینکڑوں اقسام کے دیگر روز مرہ کام آنے والے چھوٹے چھوٹے اوزار سلیقے سے اپنے اپنے نمبر کے خانے میں رکھے نظر آئیں گے۔ ان کا ٹول کیبنٹ' ان کی ورکشاپ' زندگی بھر کی جمع شدہ اشیاء حیرت اور شوق سے دیکھنے کے بعد ہوس کا وہی شعر جو ان کے اسٹوڈیو کے باہر تحریر ہے۔ پڑھئے ۔

تیز رکھیو سرِ ہر کار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

تب لطف اللہ صاحب نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ غالبؔ کے اس مصرعے میں برجستہ جواب دیا اور میں سوچتا رہتا ہوں۔

کس کے سر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

زندگی کے تمام شعبے اور اس میں لطف اللہ صاحب کی مہارت اپنی جگہ لیکن ٹیپ ریکارڈنگ اور آڈیولائبریری کا قیام ان کا سر چکرا دینے والا شوق ہے۔ تاریخی اعتبار سے مرحلہ وار ٹیپ کی دنیا کی تمام ایجاد اور ان کا مسلسل استعمال اتنا طویل اور ٹیکنیکل ہے کہ میں تو اس کے بارے میں سب کچھ دیکھنے کے باوجود زبانی بتا دینے کے بھی قابل نہیں اور سننے والے بھی اس کی تہہ اور گہرائی میں نہیں جا سکتے کہ یہ ایجادات کی وہ دنیا ہے جہاں صرف مشّاق یا جنونی کا گزر ہے۔ مختصراً سنئے ریکارڈنگ میں پہلی نایاب آواز بسم اللہ خان کی شہنائی ہے۔ موسیقی کا شعبہ ہی اگر ہم لے لیں تو یہ پھر سات ذیلی شعبوں یا صیغوں میں بٹا ہوا ہے ایک صیغہ ہے سازوں کی موسیقی کا۔ اس میں برصغیر کے تمام جانے بوجھے سازوں پر بجائے ہوئے پروگرام موجود ہیں۔

سرودنوازوں میں حافظ علی خان، علی اکبر خان، ستارنوازوں میں عنایت اللہ خان، ولایت خان، روی شنکر، شریف خان، چتر بین بجانے والوں میں عبدالعزیز خاں، حبیب خان، شہنائی نوازوں میں بسم اللہ خاں، بانسری بجانے والوں میں پنّالال گھوش، طبلہ نوازوں میں احمد جان، اللہ رکھا، سارنگی بجانے والوں میں بندو خان اور حیرت میں پڑ جائیے کہ سارنگی کے سرخیل بندو خان کے چھیالیس آئیٹم موجود ہیں۔ دوسرا سیکشن وہ ہے جو برصغیر کے کلاسیکی گانوں سے معمور ہے۔ ان کے نام میں کیا لوں کہ آج موسیقی سے متعلق لوگ جو بڑے بڑے دعوے بھی کرتے ہیں ان کے کام تو کیا نام سے بھی واقف نہیں۔ بے شمار فنکار اور پھر فی فنکار تیس سے چالیس فن پارے ان میں دھر پد دھمار سے لیکر خیال اور ترانوں کی گائیکی کے نادر نمونے داخل ہیں۔ ہاں زمانہ حال کی روشن آراء بیگم اور امانت علی خان، فتح علی خاں کا نام ہم سب نے سن رکھا ہے۔ تیسرا سیکشن نیم کلاسیکی آئیٹم کا ہے۔

جس میں ٹھمری، دادرا، ٹپا، کافی، کجری، پہاڑی وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھا سیکشن غزلوں پر مشتمل ہے۔ لائبریری کے اس حصے میں تین سو بیالیس فنکاروں نے تین ہزار آٹھ سو پچیس غزلیں گائی ہیں۔ پانچواں سیکشن گیتوں پر مشتمل ہے۔ چھٹا روایتی لوک گیتوں پر اور ساتواں قوالی سے معمور ہے۔ متفرقات کا بھی ایک چھوٹا سا صیغہ ہے۔ موسیقی کے علاوہ اردو ادب کا شعبہ بھی خاصا وزنی اور اہم ہے۔ آپ برصغیر کے کسی بھی شاعر اور ادیب کا نام ذہن میں لائیں جو لطف اللہ کی زندگی میں سانس لیتے رہے ہوں ان سے بچ کر نہیں نکل سکے ہیں۔

دانشوروں، علمائے کرام، قاری حضرات، ہر ایک کی آواز ان کے یہاں موجود ہے۔ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، آرٹسٹ، ماہر تعلیم افراد کی آواز اور لیکچرز بھی محفوظ ہیں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ 75 برس کی عمر میں لطف اللہ صاحب نے محسوس کیا کہ اپنی تمام چیزوں کو کمپیوٹرائزڈ کر دیا جائے تو بجائے کسی ماہر کی خدمات حاصل کرنے کے انہوں نے کمپیوٹر کلاس جوائن کی۔ یوں 75 سال کے شاگرد نے 25 سال کے استاد سے استفادہ کیا۔ اپنی زندگی کا تمام وقت اور بیشتر سرمایہ اپنے شوق کی تکمیل میں کچھ یوں خرچ کیا کہ اپنے کام کو آمدنی کا ذریعہ بھی نہ بنایا جبکہ ان کے نوادرات سے لاکھوں کمایا بھی جا سکتا تھا۔ یہ ایثار، جینے کا یہ منظّم انداز ان کی شریک سفر کے حصے میں بھی جاتا ہے کہ ہر بڑی شخصیت کے پیچھے کسی بڑی خاتون کی بڑائی بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

حکومت نے اگر ان کے کام پر کوئی ایوارڈ نہ بھی دیا تو یہ کوئی اچنبھے والی بات بھی نہیں کہ حکومت کی آنکھیں ترچھی ہوتی ہیں لیکن ہاں بڑے بڑے دانشوروں نے ان کے کام کو بھرپور داد دی۔ پروفیسر کرار حسین نے ان کے جنون سے متاثر ہو کر کیا خوب کہا۔ ''جاؤ اور باہر سے کسی پاگل کو پکڑ لاؤ کہ وہی تمہارے کام کی قدر کرے گا اور اسے آگے بڑھائے گا اور نہ ملے جس کی قوی امید ہے تو کسی کو بھی لے آؤ اور اسے یہاں لا کر پاگل کر دو۔'' ہم بہرحال خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے ہمیں لطف اللہ دیا۔ اور اللہ نے انہیں

ہمارے عہد میں پیدا کیا۔ آیئے حاضرین ہم اور آپ انتہائی فخر وغرور کے ساتھ لطف اللہ صاحب کو غالب کی اس دعا کے ساتھ کہ ۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔ 21 ویں صدی میں لیکر چلیں اور بیسویں صدی کا یہ فخر وغرور اکیسویں صدی تک پہنچاتے ہوئے ہم نئی صدی کو یہ چیلنج دینا نہ بھولیں۔ ان سا ہوتو سامنے آئے۔

(4 مارچ 1996ء، پاکستان نیشنل اکیڈمی کی تقریب بمقام ہوٹل شیرٹن پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

ذاکر صاحب اور ان کی دو آنکھیں

پہلے انوار عزمی اور پھر جاوید منظر نے مجھ سے کہا کہ آپ کو ذاکر علی خان پر کچھ کہنا ہے میں نے ترتیب برقرار رکھتے ہوئے پہلے انوار عزمی کو بغور دیکھا۔ آیا یہ وہی انوار عزمی ہیں یا ملتے جلتے کوئی اور؟ کیونکہ پہلے تو انہوں نے ایسی انہونی مجھ سے کبھی نہیں کہی "یہ میں نے نہیں کہا ہے۔ خود ذاکر صاحب کی خواہش ہے" میری چبھتی اور حیرت انگیز نظروں کی تاب نہ لاکر عزمی صاحب نے اپنا کہا ذاکر صاحب پر ڈال دیا۔

پھر میں نے جاوید منظر کی جانب اسی حیرت کے ساتھ دیکھا۔ جاوید منظر بھی تاب نہ لا سکے اور بولے۔ "خود ذاکر صاحب نے آپ کا نام لیا ہے۔ جب میں تنہا کھڑی رہ گئی اور یہ دونوں منظر نامے سے غائب ہو گئے تب تصوّر میں میں نے ذاکر صاحب کو محسوس کیا۔ اور زیرِلب سوال کیا۔ "ذاکر صاحب کیا یہ سچ ہے؟؟ آپ نے اپنی شخصیت اور فن کو داؤ پر لگانے کا کیوں سوچا؟؟" پھر میں نے اپنی ہی آنکھیں بند کیں اور حالات کا جائزہ لیا۔

میری ذاکر صاحب کے ساتھ تقریبات کے حوالے سے چند ملاقاتیں ہیں۔ ہاں کتابی حوالہ ضرور مضبوط ہے۔ ان کی تمام تحریریں پڑھی ہیں۔ متاثر ہوئی ہوں۔ لطف اندوز ہوئی ہوں اور ان کی قلم دانی کی قائل ہوئی ہوں۔ مگر ایسا تو میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے ان کی زندگی اور ان کی تحریروں میں ملی ہوں۔ لیکن کیا میں اس قابل ہوں کہ میں ان پر کچھ کہہ سکوں؟؟ نہیں۔ شاید نہیں۔

جب رات آتی ہے تو دن کے ایک ایک لمحے کو سچ کے کٹہرے میں لاکھڑا کرتی

ہے۔ اتنا اچھا محتسب انسان کسی اور لمحے میں کبھی نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب کی خواہش میرے ذہن پر سوار تھی۔ جو عقدہ دن میں حل نہ ہو سکا تھا وہ رات آتے ہی لمحے بھر میں حل ہو گیا ذاکر صاحب پٹھان ہیں۔ کُشتی میں ہر جگہ جیت جاتے ہوں گے۔ قلمکار ہیں اس کے نشتر بھی کاری لگاتے ہیں۔ قد کاٹھ میں بھی دوسروں کو سہما دینے کیلئے کافی ہیں۔ لکھنے لکھانے میں وہ اس مقام تک جا پہنچے ہیں کہ اب میرے جیسا کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا...... وہ اپنے آپ کو مجھ جیسے کم علم لوگوں کی نظر میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جب ذاکر صاحب کو خود اپنے فن اور شخصیت کی پرواہ نہیں تو میری ہچکچاہٹ کیا معنی رکھتی ہے؟

لیکن مجھے پھر بھی یہ حوصلہ کیوں آیا؟؟

'برائے نام'، 'دیوانِ عام'، 'میاں کی اٹریا تلے'، قلم رو۔ 'رَختِ سفر'، 'حدیثِ حرم' کے ذاکر صاحب میرے لیے بہت مشکل موضوع ہیں۔ میں روایاتِ علی گڑھ کے ذاکر صاحب کے دام میں گرفتار ہو گئی۔

فیض کا ایک مصرعہ ہے۔ تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔؟

میں جب بھی کسی ایسے شخص سے ملتی ہوں جو علی گڑھ سے وابستہ رہا ہو یا علی گڑھ گزیدہ رہا ہو اور ایک مخصوص دور میں وہاں موجود رہا ہو تو میں بس اس کی آنکھیں دیکھتی ہوں۔ ذاکر صاحب بھی ان چند شخصیات میں سے ایک ہیں۔ وہ آئے تو رام پور سے۔ لیکن علی گڑھ کے ہو گئے کہ شاید جس کی مٹی میں پاؤں پکڑ لینے کی خوبی ہو یا جس کی ہواؤں میں مسحور کر دینے کی خاصیت کہ پھر وہ شخص پلٹ کر اپنی جنم بھومی کی طرف بھی نہیں جاتا۔ پھر میں ان ہواؤں اور ان مٹی کے خمیر سے گوندھی گئی اور یونیورسٹی کیمپس کے اس مکان میں پیدا ہوئی جو سید محمود کی حویلی سے قریب اور جس کی دیوار ابواللیث صدیقی کے مکان سے جڑی ہوئی تھی۔ اور جس مکان کے آنگن میں بڑے بڑوں کی بیٹھک ہوتی۔ جہاں آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ضیاء الدین اور دیگر بڑوں کا استقبال زور شور اور

عقیدت واحترام سے ہوتا تھا۔ ہمارے گھر کی جامنیں لیث صاحب کے گھر میں گرتیں اور ان کے گھر کے نگرونده ہمارے آنگن میں پھیل جاتے۔ اور تب میرے ابا جان ہاتھ باندھ کر اپنے استادِ محترم رشید احمد صدیقی کے آگے سر بستہ کھڑے رہتے۔ اور بیٹھنا جائز نہیں سمجھتے۔ میں ایک گود سے دوسری گود میں ہمکتی پھرتی۔ آج اس بات پر تو ناز کرتی ہوں کہ اس عظیم مادرِ علمی کے بڑے لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن کیسی محرومی ہے کہ جس سرزمین میں پیدا ہوئی اس کی مٹی پر اپنے قدموں کے ننھے ننھے نقوش بھی نہیں چھوڑے اور گود سے گود تک کے فاصلے میں یہاں تک آ گئی۔

ایک طوفان آیا۔ ایک آندھی چلی اور میں اپنا باپ کھو بیٹھی کہ جسے ابھی اپنی آنکھوں میں بسا بھی نہیں پائی تھی آج ہر اس آنکھ کو دیکھتی ہوں جنہوں نے میرے والد کو دیکھا تھا۔ ذاکر صاحب کے چہرے پر سوچتی اور بولتی دو آنکھوں میں میرے والد کی بھی شبیہ ہے اور یوں ذاکر صاحب مجھے بہت عزیز ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت پر بات کرنے کیلئے یہ محفل سجی ہے۔ ذاکر صاحب سے اگر آپ نہ بھی ملے ہوں تو انہیں ان کی تحریروں میں آپ چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی سی تصنیف کھول بیٹھیں۔ کسی صفحے پر رک جائیے۔ کوئی سی لائین پڑھنا شروع کر دیں۔ ذاکر صاحب آپ کو ہر جگہ ملیں گے۔ سب سے پہلے تو آپ انہیں علی گڑھ زدہ پائیں گے۔ علی گڑھ جو ادب و آداب کا مرکز ہے۔ روایتوں کی جگہ ہے۔ مزاح اور شُستہ گفتگو کا گڑھ ہے۔

بقول ذاکر صاحب علی گڑھ باپ کا سایہ ہے۔ ماں کی آغوش ہے۔ بھائی کا بازوئے شمشیرزن ہے۔ یہ یونیورسٹی بھی ہے اور گھر بھی یہاں روایتی سند کے علاوہ اُخوت کی ڈگری بھی ملتی ہے۔ سو ذاکر صاحب اسی علی گڑھ کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ ان کے فنی سفر، شخصیت اور مزاج میں ایک فقیرانہ بے نیازی اور پیمبرانہ عاجزی اسی کے سبب موجود ہے۔

ذاکر صاحب ایک پٹرول پمپ پر آویزاں بورڈ جس پر تحریر ہے۔ ''مقدار اور معیار

کے ہم ذمہ دار ہیں'' کے مصداق اپنی تحریروں میں نمایاں ہیں۔ گویا انہوں نے جب لکھنے کی ٹھانی ہوگی تو ان کے پیش نظر ''مقدار اور معیار' کے یہ دو الفاظ ضرور رہے ہوں گے اور انہوں نے اپنے آپ پر یہ بندش بھی ضرور لگائی ہوگی کہ وہ اپنی تحریر کی مقدار کو معیار کے ترازو کے ہم پلہ رکھنے کیلئے کاغذ اور قلم کی بازی لگا دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب اپنی تحریروں میں طبیعت کے شریف' حوصلے کے بلند اور خوش اخلاق ہیں۔ لیکن بلند نظری اور بے پروائی ان کے خصائل کا امتیازی جوہر ہے۔ صاف گوئی ان کی ایک اور خصوصیت ہے۔ خطرے اور مصیبت کے وقت وہ اور زیادہ پٹھان' جری اور دلیر ہو جاتے ہیں۔ وہ خوش طبع' بذلہ سنج اور ظریف ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا دائرہ احباب وسیع ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی صاف گوئی نے بہتوں کو ان کا دشمن بنا دیا ہوگا۔ لیکن وہ نظر ایسے آتے ہیں کہ دشمنی کے اظہار میں پہل نہ کرنے پر مجبور ہیں۔

طنز و مزاح میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ کچھ شبہ نہیں اگر طنز و مزاح کوئی شریعت ہوتی تو ذاکر صاحب اس کے پیغمبروں میں سے ایک ہوتے۔ اس میدان میں انہوں نے نہایت اچھوتے' نادر' باریک اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں لطافت' سادگی' عدم تصنع اور پختگی نے ان کی طنز کو ہر طرح کے ابتذال سے پاک رکھا ہے۔ وہ کسی کو براہِ راست کچھ کہنے کے بجائے پہلے اس کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے بعد تیری ایسی کی تیسی پر آ جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب کبھی کبھی مخاطب کی لفظوں سے وہ مرمت اور ٹھکائی کرتے ہیں کہ بے چارہ تلملا اٹھتا ہے۔

طنز و مزاح کو بظاہر دلچسپی اور تفریح کی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں اس کی بدولت خود مزاح نگار کے مزاج کو سمجھنے کا بھرپور مواد ملتا ہے وہاں متعلقہ دور کے معاشرے' معاشرت' حکومت اربابِ حکومت اور بعض دوسرے اداروں کے بارے میں بھی بہت کچھ بلا ڈھونڈے مل جاتا ہے۔

انہوں نے اپنے طنز و مزاح کے اظہار میں کسی بناوٹ اور تصنع سے کام نہیں لیا۔ ان میں جرأتِ اظہار ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح بعض خرابیوں کی نشاندہی کر ہی جاتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو کھل کر بات کہہ ہی دیتے ہیں۔ ان کے اس کہہ دینے میں ہر ہر لفظ موتی کے مانند جھلکتا اور چمکتا ہوا سا رہتا ہے۔ اور موتی بھی کیسا؟ بہت قیمتی، جب ہی تو ان سے لفظ کا اسراف ممکن ہی نہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا پھر کہتی ہوں کہ ذاکر صاحب کی شخصیت ان کی سطر سطر سے جھانکتی ہے۔ اور پھر طنز و مزاح کے پردے میں تو انسان اپنے آپ کو ہی پیش کرتا ہے۔ یا اپنے ماحول کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے اس میں صداقت ہوتی ہے۔ حقیقت و واقعیت ہوتی ہے۔ ایسا کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور تب تخلیق زندگی کیلئے آسودگی بہم پہنچاتی ہے۔ ذاکر صاحب تب ہی لکھتے ہیں جب وہ کسی تجربے سے گزر چکے ہوں

آپ ان کی تحریروں میں سے کہیں بھی ان کی شخصیت کو جدا نہیں کر پائیں گے۔ کیونکہ ان کی شخصیت کا خمیر سر سید کے اجزائے ترکیبی سے گوندھا گیا ہے اس پر علی گڑھ اسپرٹ کی چھاپ ہے۔ قلم وہ بے شک رام پور سے لائے ہوں گے لیکن اس کی روشنائی روایاتِ علی گڑھ ہے۔ جس کے سائے تلے لمحہ لمحہ ٹھہر ٹھہر کر جی بھر کر انہوں نے زندگی بھر کی سانسیں اپنے اندر انڈیلی ہیں۔

انہوں نے مروّت، محبّت، اَنا، ادب و آداب، شرارت، دوستی، صلح جوئی اور بلند ہمّتی کا شربت علی گڑھ کے بازار سے پیا ہے۔ اور جب بھی قلم اٹھایا ہے۔ کسی موضوع کو موضوع بنایا ہے۔ تو ایک سرجن کے مانند ایسا نشتر چلایا ہے کہ نزاکت کے باوجود چبھن تو محسوس ہوتی ہے مگر اس چبھن میں ہلکی ہلکی سی لذّت سرور بخشتی ہے۔ وہ قصاب کی طرح چیر پھاڑ کو جائز نہیں سمجھتے آہستہ آہستہ گرہیں کھولتے ہیں۔ جملوں کی ساخت نپی تلی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک پختہ گویا گانے میں کوئی فالتو سُر نہیں لگاتا ان کی تحریروں میں پڑھنے والے کو کوئی جملہ بھرتی کا نہیں لگتا۔ روانی کا عنصر اتنا شدید ہے کہ ایک دفعہ پڑھنا شروع کیجیے تو

اس وقت تک رکیں گے نہیں جب تک وہ تحریر اپنے اختتام تک نہ پہنچے موضوع کو وہ یوں اپنے قلم میں جکڑ کر رکھتے ہیں کہ فالتو بات اس کی زد میں آ ہی نہیں پاتی۔ اور تاثر کا کمال ذہن پر چھا جاتا ہے۔ یہ تاثر کبھی حیرت کا ہوتا ہے۔ کبھی ندامت و شرمساری کا کبھی اپنے آپ پر ہنسنے کا بھی۔

ذاکر صاحب پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ انجینئر کی حیثیت سے وہ بڑے بڑے دریا' سمندر' جنگل' شہر' میدان اور اونچے اونچے پہاڑ مینار اور فلیٹ کے نقشے کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر آسانی سے بنا دیتے ہیں۔ گویا وقت اور جگہ دونوں کی پیمائش ان کیلئے لڑکوں کا کھیل ہے۔ چنانچہ جو شخص سو میل برابر ایک انچ اور دس سال برابر ایک اینٹ' فرض کر کے زمان و مکان کے طویل فاصلوں کو گراف کی شکل میں ہمیں ایک لمحے میں ناپ کر دکھا سکتا ہے۔ اس کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ جہاں دوسرے ادیبوں کو صفحے کے صفحے لکھنے پڑیں وہاں وہ صرف ایک لفظ سے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔

زندگی کے مسائل پر ان کی نظر چونکا دینے کی حد تک گہری ہے۔ اتنی خوبصورت بامعنی اور فطین تحریر کیلئے ذاکر صاحب پر رشک کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے وہ جس شخص' جگہ' مسئلے یا Situation کا نقشہ کھینچتے ہیں اسے پڑھ کر ان کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دراصل جہاں دریا گہرا ہو وہاں اتھلے پانیوں کا شور سنائی نہیں دیتا۔ یہ معاملہ ذاکر صاحب کی شخصیت کا ہے جو بڑے جانگداز غموں کو زہر خند میں چھپانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ جسے آنسوؤں کو مسکراہٹوں میں لپیٹنے کا قرینہ آتا ہے۔

ذاکر صاحب سے ملیئے۔ ملتے رہنے پر مجبور ہوں گے۔ جب بھی ملیئے وہ کہتے نظر آئیں گے۔ مجھے برائے نام ذاکر علی خان نہ سمجھئے۔ میں روایاتِ علی گڑھ کا پاسدار بھی ہوں سر سید نے حالی کیلئے کہا تھا کہ جب اللہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے دنیا میں کیا کیا تو حالی کی مسدس دکھا کر مغفرت پالوں گا۔

ذاکر صاحب اپنی تصانیف کو کسی بھی ترتیب سے رکھیں اور جسے چاہیں جس آنکھ سے

دیکھیں کہ وہ سب ان کی معنوی اولاد ہیں۔ خوش ذوقوں کی دنیا میں انہیں معافی صرف روایاتِ علی گڑھ سے ملے گی اور آخرت میں ملاقات کیلئے سرسید کے حضور اسی نام کی پرچی پر شرفِ بارگاہی حاصل ہوگی۔

وہ آج اور ہمیشہ اس مادرِ علمی کے مقروض رہیں گے جس نے انہیں رام پور کے سیدھے سادھے ذاکر علی خان کو شستہ و شائستہ ادب و آداب کی پوٹ، کالی شیروانی، سفید پائجامے اور ترکی ٹوپی اوڑھا کر علیگ بنا دیا۔ چاند تارا اور کھجور کے درخت نے ان میں علی گڑھ اسپرٹ پیدا کر دی جس کے سبب ان میں بنی نوع انسان کی خدمت، دکھ درد میں شرکت، آڑے وقت میں کام آنا، دردمندی اور دستگیری کے جذبے سے مالامال ہونے کی خصوصیت پیدا کر دی۔ ہار کے موقع پر خوش دلی کا مظاہرہ، فتح مند ہو کر چھچھورپن کا انداز نہ اپنانا۔ شکست کو مسکرا کر سہنا اور گر گر کر بھی حوصلہ نہ ہارنا سکھایا۔

جس نے جو کام اسے سونپا جائے قطع نظر اس کے کہ اس کو اس کا کوئی سابقہ تجربہ نہ ہو اس پر پورا اترنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینے کی ترغیب دی۔ جب آپ کو اپنی زندگی میں بارہا ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑا کہ آپ کے پاس ان مراحل کو سر کرنے کیلئے نہ مطلوبہ علمیت تھی نہ وسیع تجربہ لیکن الہامی طور سے آپ کے کانوں میں وہاں کے استادوں کے الفاظ گونجتے ہیں اور آپ ان تمام کڑے وقتوں سے سرخرو ہو کر نکل آئے۔

آپ نے بارہا یہ شعر گنگنایا ہوگا۔

یہ احترامِ روایت تو کم نہیں ہوگا
ہمارے خون میں شامل ہے کیا کیا جائے

خربوزہ کھا کر چھلکا پھینکنے کی احتیاط۔ یا اذان سنکر فوراً سجدہ ریز ہونے کی عادت آپ کی گھٹی میں یوں پڑی کہ ایک بڈھے نے آپ کے ساتھ ایک فرضی سجدے میں ساتھ دیا اور آپ کے پھینکے گئے خربوزے کے چھلکے اپنے دامن میں سمیٹ کر آپ کے سامنے خود آ کھڑا ہوا۔ زمانہ بدل گیا مگر نوجوانی کی عادت پیرانہ سالی میں بھی اسی زور شور سے

جاری و ساری ہے یہ ہے کمال علی گڑھ کا آپ کی تحریروں میں آپ کی شخصیت میں علی گڑھ کی روایت، شوخی، ادب و آداب، دل دہی، محبّت و مروّت کی بو باس کر رہ گئی ہے۔ آپ کی لفظیات کی مہک دُور سے پہچانی جا سکتی ہے۔

مزاح نگار عموماً پڑھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی نہیں، لیکن آپ دیکھنے کی چیز بھی ہیں، چند سال پہلے تک خوبرو تھے، مگر اب وجیہہ بھی ہوگئے ہیں بالکل اپنے مزاج کی طرح دلکش اور دلفریب، الامان! کس بے باکی سے سچ بولتے ہیں کہ جھوٹ کا گمان ہوتا ہے۔ نشتر زنی یوں کرتے ہیں کہ نشتر زدہ تک داد دینے پر مجبور ہے۔

ذاکر صاحب! آپ سے ایک سوال ہے۔؟ ابھی جواب نہ بھی دیں تو مضایقہ نہیں۔ کبھی بھی دیدیجئے گا۔ جواب کی صداقت پر شُبہ بھی حرام ہے کہ آپ سیّد کے مرید ہیں۔

سوال ہے کیا علی گڑھ کے بغیر آپ ذاکر علی خان ہوتے؟

آج کی تقریب میں میری گفتگو اسی سوال پر تمام ہوئی۔ لیکن آپ کو بتاتی چلوں مائیک پر بولتے ہوئے پورے وقت میری ٹانگوں میں لرزش رہی۔

اگرچہ میری زندگی کی ہر صبح ایک تقریب سے شروع ہوتی ہے۔ میں اسٹیج پر ہوتی ہوں۔ ہاتھ روسٹرم پر ہوتا ہے۔ مائیک میری آواز دور تک لے جاتا ہے۔ سامنے سامعین اور حاضرین کی ایک کثیر تعداد بیٹھی ہوتی ہے۔ لیکن اُس وقت میں استاد اور میرے سامعین میرے طالبعلم ہوتے ہیں۔ شاید ان کی ٹانگیں کانپ رہی ہوتی ہوں میرے پاؤں جمے جمائے ہوتے ہیں اور میرے الفاظ سجے سجائے ہوتے ہیں۔

لیکن آج کی تقریب میں اسٹیج پر میرے استاد بیٹھے ہیں۔ کہ جن کے ہاتھوں میں اپنے ٹیوٹوریل پکڑاتے ہوئے کم علمی کے احساس کے باوجود اور زیادہ نمبر حاصل کرنے کی طلب ہوتی تھی آج مائیک اور روسٹرم وہی ہیں لیکن حاضرین میں آپ جیسے ذہین اور عالم ہیں اور موضوع میرے مضمون علم معاشیات سے متعلق نہیں بلکہ ذاکر صاحب ہیں۔ ایسے موقع پر محترم مہمانانِ گرامی، آپ کی سمع خراشی اور اپنی بیان بازی اور دیگر غلطیوں کی

طالبعلمانہ معافی کی خواستگار ہوں۔ اور آپ سے شرمساری کے جذبے کے ساتھ رُخصت ہوتی ہوں کہ ذاکر صاحب پر بولنے کی مجھے حامی بھرنی نہیں چاہئے تھی کہ علم والوں کی محفل میں صرف عالم بولتے اچھے لگتے ہیں۔

(دائرہ ادب و ثقافت کی تقریب میں پڑھا گیا)

☆☆☆☆

تین ساڑھے تین ملاقاتیں ــــ مُشفق خواجہ

''مجھ سے وعدہ کرو تم جو اتنا روتی ہو ہر موقع پر اتنا رویا نہیں کروگی'' میں نے یہ سوچ کر کہ کونسا ہر موقع پر مشفق خواجہ سے میرا آمنا سامنا ہوگا۔ جھٹ وعدہ کرلیا۔ آج جبکہ اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ تب مجھے اپنے وعدے کے ٹوٹنے کا ذرّہ برابر بھی احساس نہ تھا کہ کونسا مشفق خواجہ میرے سامنے ہیں۔

لیکن خواجہ صاحب مجھ سے اتنا بڑا وعدہ لیکر آپ کو اتنا جلدی جانے کی کیوں سوجھی کہ ابھی تو جینے کیلئے عمر پڑی تھی۔

حاضرین کرام! مشفق خواجہ ادب کا بڑا نام ہیں۔ ادب اور اردو زبان جن کا اوڑھنا بچھونا تھی ان سے بھلا مجھ جیسے معمولی لوگوں کا تعلق کیونکر ہوسکتا تھا پھر وہ تو مجلسی آدمی بھی نہ تھے کہ میں انہیں اسٹیج پر بیٹھا یا روسٹرم پر کھڑا تقریر کرتے ہی سن لیا کرتی۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے میں تو ان سے بس تین یا ساڑھے تین بار ہی ملی تھی۔ لیکن ہاں ہر بار کی ملاقات میری زندگی کو اتنا مالا مال کرگئی کہ روز کے ملنے والوں سے مجھے اکثر کچھ نہ ملا۔

آج جب مشفق خواجہ اس دنیا سے جاچکے ہیں۔ میں ان سے اپنی پہلی ملاقات کی کہانی آپ کو سناتی ہوں۔

1967 میں جب مجھے چیلنج کیا گیا کہ میں اردو میں ایم اے کرکے دکھاؤں۔ تب مجھے ایک عرصے بعد باقاعدہ ادب پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سے قبل میں اکنامکس میں آنرز کرنے کے بعد ایم اے کرچکی تھی اور کالج میں لیکچرر بن گئی تھی۔ دوسرا

ایم اے صحافت میں کر کے اخبار جہاں کی سب ایڈیٹر بھی مقرر ہو چکی تھی کہ میرے کالج کے پروفیسر محترم مرتضیٰ شفیع نے مجھے اکنامکس اور صحافت سے زیادہ اردو میں دلچسپی لیتا دیکھ کر چیلنج کیا کہ اگر میں اپنے آپ کو بڑا اردو داں سمجھتی ہوں۔ تو فوراً فارم بھروں۔ چھٹی بھی نہ لوں۔ اپنے پرانے مطالعے پر تکیہ کرتے ہوئے ایم اے کا پرچہ دوں۔ روز کالج آؤں صبح امتحان دوں اور دوسرے دن پھر کالج آؤں۔ اور اس طرح ایم اے پاس کر کے دکھاؤں۔

نوجوانی میں چیلنج بڑا اچھا لگتا ہے۔ پھر کچھ آئے نہ آئے۔ اپنے پر اعتماد بھی بہت ہوتا ہے۔ شوقیہ مطالعے نے مجھے پُراعتماد بنایا ہوا تھا۔ یوں میرے تیسرے ایم اے کی ابتدا ہوئی یعنی رجسٹریشن اور امتحان میں صرف دو چار ہفتوں کا وقفہ تھا۔ امتحان میں چند دن باقی تھے اور میرے پاس مطلوبہ کتابیں موجود نہ تھیں۔ نہ ہی وقت کہ کسی لائبریری سے مدد حاصل کروں۔ پابندی یہ بھی کہ چھٹی بھی نہ لوں۔

ان دنوں انور شعور انجمنِ ترقی اُردو میں کام کرتے تھے اور وہاں ان کے سربراہ مشفق خواجہ ہوتے تھے۔ انجمن کی لائبریری میری بچپن کی دیکھی ہوئی تھی جب میں اپنے دادا کی انگلی پکڑ کر بابائے اردو کے پاس جایا کرتی۔ دادا ان سے باتیں کرتے میں الماری میں بند کتابوں کو دیکھا کرتی۔

مشفق خواجہ کو پڑھا کم تھا۔ سنا زیادہ تھا۔ اور سنا بھی ان کے چھوٹے بھائی رحمٰن طارق سے تھا جو ہمارے شعبے کے طالبعلم تھے اور اکنامکس میں ایم اے کر رہے تھے۔ وہ ہم سے سینئر ضرور تھے لیکن بزم معاشیات کے وہ نائب صدر تھے اور میں سیکریٹری جنرل۔ یوں ہمارے درمیان دوستی بھی تھی اور بے تکلفی بھی وہ میرا ادبی ذوق دیکھ کر اکثر اپنے بھائی کا ذکر کرتے اور میں ان کے ادبی معیار کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ اس بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیتی کہ وہ ان کے بھائی ہوسکتے ہیں۔ نام میں بھی ولدیت والی کوئی مناسبت نہ تھی وہ دن بھر مجھے یقین دلاتے اور میں دن بھر اس بات کی منکر ہوتی۔ رحمٰن طارق شوخ و شرارتی طالبعلم کی حیثیت سے مشہور تھے اور شاید اسی لئے ان کا ذوقِ ادب ہم سے چھپا

رہا۔ ہماری اور ان کی دوستی بہت سنجیدہ سی دوستی تھی وہ مجھے اپنے سے بہت چھوٹا۔ کمتر، حقیر اور اکثر کم عقل بھی سمجھا کرتے لیکن اس کے باوجود اپنی محبت، ہدایت اور مشوروں میں شامل رکھتے۔ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد میں نے یقین کر لیا تھا کہ مشفق خواجہ رحمٰن طارق کے بھائی ہوں گے لیکن اب رحمٰن طارق طالبعلمی کے ریل والے سفر کے ساتھی کی حیثیت سے کسی اسٹیشن پر اتر کر گم ہو چکے تھے۔ میں انہیں اپنے یقین میں تو شامل نہیں کر سکتی لیکن یہ سوچ کر گھر سے چلی کہ چلو آج شاید انجمن کے دفتر میں انہیں دیکھ بھی لوں گی۔

انجمن کی لائبریری میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک انتہائی نحیف، ضعیف اور سخت دل لائبریرین سے واسطہ پڑا۔ میں بچپن کی یاد کے ساتھ الماری کے دھندلے شیشوں سے پار کتابوں کے نام پڑھنے میں مصروف ہوگئی کہ انور شعور ابھی تک آئے نہیں تھے کہ اچانک میری نظر اوپر کی جانب رکھی ہوئی ایک موٹے سے تالے میں بند خانے کی جانب پڑی۔ وہاں کلّیاتِ قاری نام کی ایک چھوٹی سی کتاب رکھی تھی۔ میں نے جھٹ اس کا نمبر نوٹ کیا اور ان بزرگ لائبریرین تک گئی۔

مجھے یہ کتاب چاہیے۔

''یہ کتاب نہیں مل سکتی'' انہوں نے اوپر سے نیچے تک مجھ پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ یوں بھی انہوں نے مجھے صرف انور شعور کا انتظار کرنے کیلئے لائبریری میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔

میں نے سوچا آخر ایسی کیا بات ہے مجھے یہ کتاب کیوں نہیں مل سکتی؟

''میں اسی جگہ پڑھ کر آپ کو واپس کر دوں گی۔'' میں نے انہیں یقین دلایا۔ ''تمہیں فارسی آتی ہے۔؟'' انہوں نے عینک کے موٹے موٹے شیشے سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ ان کا انداز ایسا تھا کہ وہ میرا جواب بھی جانتے تھے۔

جواب وہی تھا جو انہیں معلوم تھا۔ ''جی نہیں''

''پھر لے کر کیا کرو گی؟ میں نے ضد کی۔ جواب ملا ''نہیں'' انہوں نے زور دے کر کہا۔ اس لمحے وہ مجھے اور بھی سخت لگے۔ سچی بات یہ ہے کہ اچھے بھی نہ لگے اسی اثناء میں

انور شعور آ گئے۔ میں ان کے پاس چلی گئی۔ انور شعور اور میں بزم امروز کے ممبر اور بچپن کے دوست تھے امروز اخبار میں ساتھ لکھا کرتے۔ بچپن کی دوستی بڑی قیمتی ہوتی ہے یہ دوستی آج تک ویسی ہی قیمتی ہے۔

مجھے ایک کتاب چاہیے اور یہ مولانا مجھے کتاب نہیں دے رہے۔ میں نے انور شعور سے ان کی شکایت کر ڈالی۔ انور شعور نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کے بجائے سیدھا ایک کمرے کا راستہ دکھا دیاجہاں مشفق خواجہ بیٹھے تھے۔ تمہیں اس کتاب کے علاوہ مطلوبہ دیگر کتابیں بھی ان سے مل سکتی ہیں۔

جانتی ہوانہیں۔؟ اس نے پوچھا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہاں یہ رحمٰن طارق کے بھائی ہیں۔ آج مجھے یہ یقین کر لینے میں کوئی نقصان نہ تھا۔ لیکن اس وقت میں ان کتابوں کو بھول چکی تھی۔ کہ جس کیلئے آئی تھی۔ ضد تھی تو یہ کہ مجھے کلّیاتِ قاری چاہیے۔ جب میں کمرے میں داخل ہو رہی تھی تب مجھے رحمٰن طارق بے تحاشہ یاد آئے طالبعلمی کے زمانے کے ساتھیوں سے بڑا دوستی کا اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا میں نے حسب عادت سر پر دوپٹہ لیا۔ اور دبے قدموں ان کے کمرے میں قدم رکھنے کی اجازت طلب کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی اپنے اوپر طالبعلمی کی دھیمی دھیمی باادب سی چھاپ موجود تھی۔ جس میں سر پر دوپٹہ رکھنا پہلی شرط ہوتی تھی۔

انہوں نے سر جھکائے جھکائے اجازت دیدی

''آ جاؤ''

میں نے سلام کیا اور جھٹ فرمائش کر دی

''مجھے کلّیاتِ قاری چاہیے۔ یہ رہا نمبر۔'' میں نے کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا انہوں نے گھنٹی بجائی ان بزرگ کو بلایا۔ معلومات حاصل کیں۔ اس بار اوپر سے نیچے تک مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ''

میں کرسی پر ٹک گئی کہ ان دنوں میری عمر بڑوں کے سامنے کرسی پر مکمل بیٹھنے کی نہ تھی۔

کون ہو تم۔؟ انہوں نے جانے کیا جاننا چاہا۔

میرا نام نوشابہ ہے۔ میں انور شعور کو جانتی ہوں۔ میں رحمٰن طارق کو بھی جانتی ہوں۔ میں ایک کالج میں معاشیات پڑھاتی ہوں۔ اخبار جہاں کی سب ایڈیٹر بھی رہی ہوں۔ ایم اے اردو کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تھا میرا مکمل تعارف۔ شاید یہ سارے جملے اس لیے تھے کہ میں وہ کتاب دیکھنے کی حقدار قرار پا جاؤں۔

کلیّاتِ قاری فارسی زبان میں ہے۔ تمہیں فارسی آتی ہے؟ ان کا بھی یہی سوال تھا۔

میرا جواب پھر نفی میں تھا۔ لیکن وہ کتاب تھوڑی دیر کیلئے مجھے ضرور چاہیے۔

کیا کروگی اس کا جبکہ تم پڑھ بھی نہیں سکتیں سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ اب وہ میری باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔

''بس اسے چُھوکر۔ ورق الٹ کر واپس کر دوں گی۔'' میری آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو تھے۔

وہ مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ چند ایک قطرے آنکھوں سے ٹپک بھی پڑے۔ جنہیں میں ان سے چھپا کر دوپٹے کے پلو سے پونچھتی رہی۔

اسی اثناء میں کتاب میرے سامنے آ گئی۔ ان کی نظریں بدستور مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں جھکی پلکوں سے ان کی نظروں کو اپنے اردگرد چبھتا محسوس کر رہی تھی۔

انہوں نے کتاب میرے آگے بڑھائی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب پر ہاتھ پھیرا۔ پہلا ورق الٹا ہمارا شجرہ نسب سامنے تھا۔ کسی ایک نسل پر آ کر رک چکا تھا۔ میری آنکھوں میں رکے ہوئے چھپے ہوئے تمام آنسو ایک دم سے چھلک پڑے اور پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دوپٹے کے پلو سے ڈھانک کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اور دیر تک روتی رہی۔ وہ دیر تک مجھے دیکھتے رہے۔ اور خاموش تھے۔ یہ ایک عجب لمحہ تھا جو نہ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا نہ میرے قابو میں تھا۔ جس کتاب کو میں نے بے حد اصرار اور جدوجہد سے

حاصل کیا تھا وہ میز پر جوں کی توں پڑی تھی پہلا اُلٹا ہوا صفحہ بس میرے سامنے تھا صدی سے زیادہ کا عرصہ اس پر گزر چکا تھا۔ اس کی خستہ حالی اور صفحات کی پیلاہٹ زمانہ گزرنے کی داستان سنا رہی تھی۔ یہ ایک شاعر کا دیوان تھا اور وہ شاعر ایک نامی گرامی خاندان کا وارث تھا پیشے کے اعتبار سے جج تھا اور اس زمانے کا قانون دان جب مائیں اپنے بچوں کو ٹانگوں پر جھولا جھلاتے ہوئے اس کے مستقبل کے خواب کا تعین کچھ یوں کرتی تھیں کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر کوتوال بنے گا۔ یہ شخص جس کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی۔ جس کے پاس عزت' شہرت' دولت' نیک نامی' اعلیٰ نسب اور اعلیٰ تعلیم تھی۔ اب زمانے کی گرد میں دب کر گمنام ہو چکا تھا۔ اتنا بے نام کہ اس کے بعد کے آنے والے اس کے ہی شجرہ نسب سے جڑے ہوئے لوگ اسے جانتے ہی نہیں تھے۔ اب اس کا دیوان الماری کی دیگر ان کتابوں کے درمیان دب چکا تھا جسے اب کبھی کوئی پڑھنے والا پڑھتا بھی نہیں۔ کوئی لائبریرین طلب کرنے پر دیتا بھی نہیں۔ مگر میرا اس کتاب سے یا صاحب کتاب سے کیا رشتہ تھا۔؟ شاید مشفق خواجہ یہ جاننے کی کوشش میں تھے۔ لیکن وہ میری ہیجانی کیفیت کے سبب خاموش تھے بھئی رو چکیں تو اب کچھ بات کریں۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد انہوں نے پہل کی میں نے جلدی جلدی پلو سے آنکھیں خشک کیں۔ جو خشک ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں۔

حافظ قاری محمد علی۔ یہ کون ہیں۔ انہوں نے اس دیوان کے خالق کا نام لیکر پوچھا۔

میرے پر دادا میری آواز بھرائی ہوئی تھی

تم نے انہیں دیکھا ہے؟ انہوں نے پوچھا۔

نہیں۔ میں نے تو اپنے والد کو بھی نہیں دیکھا۔ درمیان کی کڑی اپنے دادا کو دیکھا ہے۔ اب کے میں اور بھی اہتمام سے رو پڑی۔

ہمارے ان کے درمیان پھر خاصی دیر کی خاموشی چھائی رہی۔ میرے آنسو چھما چھم برس رہے تھے۔ شاید وہ اس کشمکش میں رہے ہوں کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔ جو ہر ہر بات پر روتی ہے۔

کچھ دیر بعد بولے

''اب ہم کچھ باتیں کرلیں۔''

جی جی ہاں میں نے بہت صلح سے کہا۔

پہلے ٹھیک سے آنسو پونچھو۔ اب کے میں نے پرس سے دھلا دھلایا استری کیا ہوا رومال نکالا اور سچ مچ آنکھوں کو رگڑ رگڑ کر خشک کیا۔

Good Girl وہ خوش ہوئے۔

تمہارے ابا۔ دادا۔ پردادا کہاں کے رہنے والے تھے؟

پردادا بنارس کے پاس ایک شہر غازی پور ہے جہاں بکسر کی لڑائی لڑی گئی اور جہاں لارڈ کارنوالیس مارا گیا اور وہیں دفن ہوا۔ اور جس شہر میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد بنی۔ میرے والد اور دادا اسی یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ تنخواہ نہیں لیتے تھے خدمت کرتے تھے کہ انہیں پیسہ نہیں چاہیے تھا اور یونیورسٹی خدمت کی طلبگار تھی اور ابھی صلاحیت کے مطابق تنخواہ دینے سے قاصر تھی۔

والد کا نام انہوں نے زور دے کر پوچھا۔

حسن عبداللہ۔ نام لیتے ہی میرے آنکھوں میں پھر آنسوامنڈ آئے بھئی لڑکی۔ اب کے وہ جھنجلائے۔ ایک تو تم روتی بہت ہو۔

میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن میں ان سے عشق کرتی ہوں۔ میں وہ جذبہ محسوس کرنا چاہتی ہوں جو ایک باپ بیٹی کے درمیان ہوسکتا ہے۔ میں بدستور روئے جارہی تھی۔ کیا میں کبھی یہ جذبہ محسوس کر پاؤں گی؟ کیا کبھی یہ معجزہ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ دیر کیلئے زندہ ہو جائیں میں بیٹی بن جاؤں وہ ابا بن جائیں میں ان کے بازوؤں کے حصار میں آجاؤں۔ اپنے اوپر کسی چھت کا احساس کر پاؤں...... پتہ نہیں یہ میرا ان سے سوال تھا یا بس میری خود کلامی تھی شاید ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ہوں میں نے ان کی طرف دیکھا ہی نہیں لیکن ان کے لہجے میں کسی باپ جیسا ہی پیار تھا۔ وہ نرمی سے بولے اپنے آنسو پونچھ لو اور گھر جاؤ۔ کل پھر آنا۔

میں ان دنوں ہی نہیں آج بھی بہت روتی ہوں۔ کسی دکھ اور رنج کے موقع پر ہی نہیں۔خوشی کے موقع پر بھی میری آنکھیں جل تھل ہو جاتی ہیں۔بعض اوقات مجھے اپنی اس حرکت پر بہت شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی اس عادت پر قابو پانے کی کوشش بھی کی ہے۔لیکن نا کام ہی رہی اور ان دنوں تو میں رونا اپنا حق ہی سمجھتی تھی۔ دنیا نے مجھے ہنسنے کیلئے دیا بھی کیا تھا۔صرف ایک خوبصورت پریوں کی داستان والا ماضی ہی تو تھا میرے پاس۔لیکن جن دنوں میں زندہ تھی وہاں جی لینا بہت کمال کی بات تھی۔ مستقبل کا کیا پتہ۔ کسے پتہ ہوتا ہے۔تب کیا وہ آنکھیں جوصرف میری آنکھیں تھیں وہ بھی ساتھ نہ دیتیں۔

بھئی اگر تم روتی ہوئی میرے کمرے سے نکلیں تو باہر بیٹھے ہوئے لوگ کیا سوچیں گے۔یہی نا کہ میں نے تمہیں مارا ہے۔

کیا میں نے تمہیں مارا ہے؟ انہوں نے شرارت سے پوچھا یا مجھے ہنسانا چاہا جی نہیں۔ میں نے ہنسنے اور رونے کی درمیانی کیفیت میں جواب دیا۔ اور کمرے سے نکل آئی ان کا جملہ پھر سنائی دیا۔ ''کل آنا''

میں کل پھر کیوں آؤں؟ میں کل پھر کیوں جاؤں؟ یہ سوال کئی بار میں نے وہاں سے آتے ہوئے اور واپس آ کر لیٹتے بیٹھتے اپنے آپ سے کیا۔ انہوں نے مجھے پھر کیوں بلایا ہے۔ اگر انہیں میری مطلوبہ کتابیں دینی تھیں وہ تو آج بھی دے سکتے تھے۔ انور شعور کی گارنٹی موجود تھی۔

مگر میں نے سوال کا جواب نہ پا کر بھی کل جانے پر اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔لڑکی تم آ گئیں۔ انہوں نے ڈھیر ساری کتابوں کے درمیان سے اپنا چہرہ اوپر کیا۔ آج رونے دھونے کا تو پروگرام نہیں ہے نا۔ وہ ہنس رہے تھے اور میں شرمندہ تھی۔

کیا آپ پروگرام بنا کر روتے ہیں۔ میں نے کھڑے کھڑے ہی سوال کر دیا۔ کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ بھئی تم تو پروفیسر ہو۔ میں پھر کرسی پر ٹک گئی۔ سنو! میں روتا ہی نہیں۔ کم از کم دوسروں کے سامنے تو نہیں روتا۔ آپ بہت بہادر ہیں۔ اور میں بہت

کمزور۔ آپ مجھے کل اچھے لگے تھے جبکہ مجھے بہادر لوگ اچھے نہیں لگتے۔

وہ دلچسپی سے سن رہے تھے۔ کیوں۔ کیوں نہیں اچھے لگتے۔ اس لئے کہ وہ دوسروں کو دکھ دیتے ہیں۔ اپنی طاقت کا انہیں نشہ جو ہوتا ہے میں ایسا ہی سمجھتی تھی۔

تم ایسا سوچ سکتی ہو۔ شاید تمہارا تجربہ ایسا ہو۔ مگر ابھی تمہاری عمر کم ہے۔ تجربے کیلئے عمر پڑی ہے۔ فیصلہ ابھی نہ کر ڈالو۔ عمر گزارو۔ ہمت سے، بہادری سے ہار جاؤ غم نہیں مگر مقابلے سے دستبردار کبھی نہ ہونا۔

تمہیں میری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔

مجھے اچھی لگ رہی ہیں آپ کی باتیں۔ مجھے بڑے لوگوں کی باتیں ہمیشہ اچھی لگتی ہیں میں نے اپنے استادوں سے ہی کچھ سیکھا ہے۔ اگر کچھ سیکھ پائی ہوں۔ بس وہی تو میرے بڑے ہیں۔ آپ بھی بس ویسے ہی ہیں۔

شکریہ تم نے مجھے اپنے بڑوں میں شامل کر لیا۔ آج تم نے مجھ سے کچھ باتیں کی ہیں مجھے مزا آیا۔ مگر مجھے ایک ڈر اب بھی ہے تم سے۔

وہ کیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

آج تو نہیں رونے بیٹھ جاؤ گی؟ اچھا یہ بتاؤ دن بھر میں کتنے دوپٹے بدل لیتی ہو۔؟

کیوں؟ سوال کرتے ہی مجھے ان کی بات سمجھ میں آ گئی۔

اب میں اتنا بھی نہیں روتی کہ آنچل کم پڑ جائیں۔ میں اب برابر انہیں جواب دینے لگی تھی۔

آپ نے آج مجھے پھر کیوں بلایا ہے۔؟ یہ سوال اب بھی میرے ذہن میں تھا لیکن اسے میں الفاظ کا جامہ نہیں پہنا پا رہی تھی۔

تم پوچھو گی نہیں کہ میں نے آج پھر تمہیں کیوں بلایا ہے؟ انہوں نے جیسے میری ذہنی کشمکش جان لی۔

''یہ دیکھنے کیلئے کہ میں آج کتنا روتی ہوں۔'' ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے اور

خوب ہنسے۔ مجھے اپنی بے تکلفی پر خود ہی حیرت ہوئی۔

وہ قدرے جھکے اور اپنی دائیں جانب رکھی سائیڈ ٹیبل کی نچلی دراز سے ایک پیکٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا جو دھاگے سے بندھا ہوا تھا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے الفاظ میں پوچھنے کے بجائے نظروں نظروں میں سوال کیا" کھولو تو" ان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"عجیب پر اسرار آدمی ہیں بولتے کم ہیں مگر ماحول کو عجیب بنا دیتے ہیں۔ میں نے آہستگی سے دھاگے کی گرہ کھولی۔ بنڈل جھٹ سے کھل کر بکھر گیا۔ تحریر پر نظر کیا پڑی کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ اور پھر میں کل کے خاموش آنسوؤں کے بجائے ہچکیوں بھری آواز کے ساتھ رو پڑی۔

یہ کیا ہے۔ یہ کیا ہے؟ میرے لب ہل رہے تھے مگر شاید یہ جملے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ میری انگلیاں ان صفحات پر گردش کر رہی تھیں۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، سوداؔ، فانیؔ، حالیؔ، مصحفیؔ، انیسؔ، دبیرؔ ہر ایک پر جدا جدا کئی صفحات پر بنے ہوئے مکمل نوٹس تھے۔ اور ہر آخری صفحے پر حسن عبداللہ اور اس وقت کی تاریخ بلکہ مقام بھی درج تھا۔ اپنے نام کے ساتھ وقت اور مقام لکھنا میرے ابا کی عادت تھی۔

میں انہیں اور وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ ہم دیر تک بغیر کچھ بولے ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہے۔

پھر سکوت ٹوٹا۔

میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ یہ کاغذات کسی نے مجھے دیئے۔ برسوں پہلے۔ شاید تقسیم کے فوراً بعد۔ یہ تمہارے والد کی امانت تھی میرے پاس۔ یہ کاغذات میرے پاس کیوں آئے مجھے نہیں معلوم۔ سالوں سے یہ میرے پاس ہیں۔ ہر بار میں اپنی لائبریری صاف کرتا ہوں۔ غیر ضروری کاغذات پھینکتا ہوں۔ اسے بھی بارہا کنارے ڈال دیا۔ اور پھر اٹھا کر رکھ لیتا ہوں۔ برسوں سے یہ عمل جاری ہے۔ شاید اسے میں نے تمہارے لئے ہی رکھا ہوا تھا۔ چلو اچھا ہوا تم آ گئیں۔ تم سے تعارف ہوا تو مجھے یہ کاغذات یاد آ گئے۔ دل نے

کہا شاید تمہارے ہی والد کے ہوں۔ اسی لئے تمہیں آج دوبارہ بلایا تھا۔

میں نے ان کاغذات کو سمیٹا اور سینے سے لگالیا۔ ان کاغذات پر میرے والد کی انگلیوں کے ان دیکھے نشانات تھے۔ اس میں ان کی آنکھیں سمائی ہوئی تھی۔ شاید ان صفحات میں ان کی خوشبو بھی بسی ہوئی تھی کہ میرے سینے سے لگ کر وہ صفحات مجھے اپنے ابا کی بانہیں لگیں جو مجھے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں۔ میں دیر تک ان کے حصار میں رہنا چاہتی تھی کہ یہ ایک جذبہ محسوس کرنے کیلئے میں صدیوں سے زندہ تھی۔ یا مردہ تھی اور زندہ ہونا چاہتی تھی۔

وہ میرا دیوانہ پن دیکھ رہے تھے اور آج ان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی دیر تک یہ لمحے ہمیں جکڑے رہے۔ باپ بیٹی کا یہ انوکھا ملاپ تھا۔

پھر انہوں نے ہی پہل کی۔

تم بہت جذباتی لڑکی ہو۔ اپنے والد سے عشق کرتی ہو۔ جن کو تم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ دیکھو وہ بھی تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ تم ایم اے کر رہی ہو اور انہوں نے تمہارے لئے بنے بنائے نوٹس تم تک پہنچا دیئے۔ شاید یہ انہوں نے اپنے لئے نہیں تمہارے لئے ہی بنائے ہوں۔ جو تم تک آج 30 سال بعد پہنچ رہے ہیں۔ تم معجزے پر یقین رکھتی ہو۔ انہوں نے پوچھا۔

آج یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے میرا جواب تھا۔

آپ مجھ سے پہلے کیوں نہ ملے؟

یہ شکر کرو کہ ان کاغذات کو تلف کرنے کے بعد میں تم سے نہیں ملا۔

میں تمہارا مجرم بن جاتا مثبت سوچ کیا اچھی نہیں ہوتی۔؟

ہوتی ہے۔ میں نے اعتماد سے کہا۔ مثبت سوچ رکھنی چاہیے۔ Good تم تو اچھی لڑکی ہو۔ وہ مسکرائے۔ مگر روتی بہت ہو۔ چلو پھر سے آنسو پونچھو۔ باہر لوگ بیٹھے ہیں۔ اور میں نے تمہیں مارا بھی نہیں ہے نہیں نا۔

جی نہیں آپ نے تو مجھے زندہ کیا ہے۔ مجھے میرے ابا کی تحریریں دی ہیں۔ وہ تمام دن رات وہ تاریخیں وہ مقامات اوران کا احساس دیا ہے۔ اس وقت کا احساس دیا ہے جو انہیں تحریر کرتے ان پر گزرے ہیں۔ آپ نے اپنے گھر میں برسوں ان کاغذات کو رہنے کی جگہ دی۔ میرے لئے آپ نے انہیں محفوظ رکھا۔ زمانے کے سردوگرم سے بچائے رکھا انہیں کتابوں کے درمیان رکھا۔ انہیں بک شیلف میں جگہ دی۔ انہیں اچھا ماحول فراہم کیا شکریہ آپ کا میرے جملے ٹوٹے پھوٹے تھے ادائیگی کٹی پھٹی تھی۔ آواز میں ارتعاش تھا اور آنکھوں میں حسب عادت آنسوؤں کا سمندر۔

بڑوں کا شکریہ ادانہیں کرتے۔ انہیں سلام کرتے ہیں۔

''میں انہیں لے لوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کی۔

انہوں نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ہاں لے جاؤ۔ امتحان تک اپنے پاس رکھو۔ پڑھو۔ اس کے بعد مجھے واپس کر دینا۔ اسی دھاگے میں لپیٹ دینا انہوں نے دھاگا اٹھا کر میرے سامنے لہرایا۔ آخری الفاظ دھیرے دھیرے اور ٹھہر ٹھہر کر ادا کئے۔

''اس کے بعد مجھے واپس کر دینا۔'' یہ الفاظ میرا جی ہلا گئے۔ تو یہ میری ملکیت نہیں بن سکتے۔ میں نے دُکھ سے سوچا۔ میرے والد ہی جب میرے نہ تھے۔ ان کی اور بھی کوئی چیز میری نہ تھی تو یہ چند اوراق بھی میرے نہ ہوئے تو کیا مضایقہ۔ میں نے ان کاغذات کا ویسا ہی بنڈل بنایا ہاتھوں میں تھاما اور بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آئی۔

امتحان انہیں پڑھ کر کیا دیتی۔ صفحات سامنے آتے تو آنسوؤں کی چادر بھی تو سامنے تن جاتی۔

امتحان ختم ہونے کے بعد میں نے ایک ہفتے کی اور بددیانتی کی۔ ان دنوں فوٹو اسٹیٹ کی بھی سہولت نہ تھی۔ اماں اور سب خاندان والوں کو اس کی زیارت کرائی۔ ہر کوئی حیران تھا۔ چیزیں رہ جاتی ہیں۔ انسان چلا جاتا ہے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ سب کچھ بکھر گیا۔ چیزیں لٹ گئیں۔ کچھ بٹ گئیں یتیم بچوں کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ مگر یہ چند صفحات جانے

کہاں کہاں سفر کرتے ہوئے عین اس وقت بیٹی کی جھولی میں آ گرے جب وہ ان کاغذات کی طلب گار تھی۔ معجزوں پر یقین کیسے نہ کیا جائے۔

وعدہ بہر حال وعدہ تھا۔ مجھے واپس کرنا تھا اور وہ دن بہت کڑا دن تھا میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اب کے براؤن پیپر کے لفافے میں ان کاغذات کو رکھ کر میں نے لفافے پر سلام کے بعد شکریہ لکھا۔ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب پھر میری آنکھیں جل تھل تھیں اور حسبِ عادت میں انہیں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر جانتی تھی کہ نکلے ہوئے آنسوؤں کو دوبارہ آنکھوں میں واپس لے جانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ کہ عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔

بیٹھ جاؤ۔ اب کے وہ بہت سنجیدہ تھے۔ میں پچھلے تمام دنوں سے تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ ان کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھیں۔ ''نوشابہ تم بہت اچھی ہو۔ بہت جذباتی ہو۔ بہت روتی ہو۔ اور محبت کے معاملے میں بہت گہری ہو۔ اپنے اندر اعتدال پیدا کرو۔ جو ہوگیا سو ہوگیا کہ تمہارے ساتھ بس یہی کچھ ہونا تھا۔ اب جو کچھ ہونا ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ ماضی پر بس نہیں ہوتا مگر مستقبل کے گھروندے ہم خود بناتے ہیں۔ چاہو تو بنالو۔ چاہو تو بگاڑلو۔

میں چپ تھی۔ ساکت تھی۔ میری نظریں اس لفافے پر تھیں۔ جن میں میرے ابا کے ہاتھ کی تحریریں تھیں جو انہوں نے اپنے ایم اے کیلئے میری پیدائش سے قبل تحریر کی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ اسکے کچھ ہی عرصے بعد وہ مر جائیں گے۔ ان کی ہر چیز اِدھر اُدھر ہو جائے گی۔ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ اور ان کے بچے ایک دوسرے ملک میں صرف اپنی ولدیت لیکر چلے جائیں گے۔ اپنی نئی پہچان بنانے کیلئے لیکن اس نئے ملک میں خاندان کے ذریعے بچوں کی کوئی پہچان نہیں ہوگی۔ اس ملک میں پیسہ خاندان کی پہچان بنے گا۔ زمانے نے یہ کروٹ ہمارے عہد میں بدلی ہے۔ ہماری نسل اور بعد کی ساری نسلیں اس کی زد میں آگئیں کہ یہ بھی ہماری تقدیر ہی ہے۔ جسے ہم نے نہیں وقت نے تحریر کیا ہے۔

''سنولڑکی'' شاید اب ہماری ملاقات نہ ہو۔ کم کم ہو۔ یا ہوتی رہے ایک وعدہ کرو۔ کروگی؟ انہوں نے سوال کیا۔

اب اتنا رونا نہیں۔ وعدہ کرتی ہو۔

جی اب میں آپ کے پاس جب بھی آؤں گی نہیں روؤں گی۔

وہ بھی ہنسے میں بھی ہنسی لیکن ہماری ہنسی میں ہنسی کے علاوہ کچھ اور ہی تھا۔ اور اٹھتے ہوئے ایک بار پھر میں نے اس لفافے کی طرف دیکھا جسے آج میں واپس کرنے آئی تھی۔

''سنو'' ان کی آواز آئی۔تم نے خیانت کی ہے۔

میں چکرا گئی۔ اس میں تمام صفحات موجود ہیں۔ میں نے اس میں سب رکھے ہیں میں یقین دلانے کے لہجے میں بول رہی تھی۔

اور وہ دھاگا۔ وہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ بولے۔

میں نے لفافے میں سے دھاگا نکال کر ان کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ مجھے کچھ دُکھ سا ہوا تھا۔

انہوں نے مجھے جن نظروں سے دیکھا اسے میں کئی صدی تک بھی نہیں بھول سکتی۔

دھاگے کو لفافے میں ڈالو اور اسے اٹھالو۔ یہ تمہارا ہے۔ یہ تمہاری امانت تھی میں تو صرف امانت دار تھا۔ اس کا محافظ تھا۔ آج میں نے تمہیں ملنے کیلئے بلایا تھا۔ اور یہ بھی دیکھنے کیلئے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرتی ہو یا نہیں تمہارے لئے یہ امتحان پاس کرنا یقینا مشکل رہا ہوگا۔ ہاں تم اس میں بھرپور طریقے سے کامیاب ہو۔ اب ایم اے بھی پاس کرلوگی۔لو میں نے تو تمہارے نتیجے کا بھی اعلان کردیا۔

میری خوشی قابلِ دید تھی۔ اور حسبِ عادت اس خوشی پر ڈھیر سارے آنسو میری آنکھوں سے ایک دم چھلک پڑے۔

میں لفافہ لئے گھر آ گئی۔ راستے بھر لگا کہ دنیا کی دولت سمیٹے جا رہی ہوں۔ وہ کاغذات اب مشفق خواجہ صاحب کی امانت ہیں۔ اور جب بھی میں انہیں کھولتی ہوں۔

چُھوتی ہوں اور پڑھتی ہوں۔ مجھے اپنے ابا کے ساتھ ساتھ وہ بھی یاد آ جاتے ہیں۔

لیکن آج جب وہ لفافہ تو میری الماری میں بند ہے۔ مشفق خواجہ دنیا کی قید سے آزاد ہو کر ہم سب سے دُور جا چکے ہیں۔ وہاں جہاں برسوں پہلے میرے ابا جا چکے ہیں۔ اور مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ وہاں چلے جانے والے لوٹ کر کہاں آتے ہیں اور جا کر کتنا رُلاتے ہیں۔

خواجہ صاحب آج رومال کی جگہ ٹشو پیپر نے لے لی ہے۔ میرے سامنے اخبار بھی پڑا ہے اور ٹشو پیپر کا بھرا ہوا ڈبہ بھی۔ آپ کی نصیحت بھی آپ سے کیا ہوا وعدہ بھی۔ مگر آج مجھے آپ کی کوئی بات نہیں ماننی میں روؤں گی خوب روؤں گی۔ مجھے معلوم ہے آج آپ مجھے چُپ بھی نہیں کرائیں گے کہ آج آپ سے دُور چلے جانے کا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ آج میں اعلان کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے مارا ہے۔ سچ مچ مارا ہے اور چوٹ لگنے پر کون ہنستا ہے۔؟

(شام 24 فروری 2005ء آرٹس کونسل کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

پُھول ابّا — علاّمہ شبّیر احمد عثمانی

پُھول ابا کا انتقال 13 دسمبر کو ہوا تھا آج 19 برس ہوگئے ہیں۔ باتوں باتوں میں پھول امّاں نے مجھے بتایا۔ اچھا کہہ کر میں اخبار پڑھنے لگی۔ مگر پھر فوراً ہی خیال آیا۔ پھول ابّا کی برسی ہے وہی پھول ابّا جو علامہ شبّیر احمد عثمانی کے نام سے دنیائے اسلام میں مشہور ہیں۔ ہم نئے نئے ان کے پڑوس میں آئے تھے اور پھول اماں سے میری دوستی پکّی ہوچکی تھی۔

بیٹی لوگوں نے تو مولانا کو بھلا ہی دیا۔ پچھلے سال برسی یونہی گزر گئی اور ان پر کسی نے کچھ نہ لکھا۔ وہ پاکستان کے بڑے حامی تھے میں تمہیں کیا بتاؤں انہوں نے پاکستان کی کتنی خدمت کی ہے۔ مگر کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ پھول امّاں آبدیدہ ہوگئیں۔

''بیٹی تم ہی ان پر ایک مضمون لکھ دو۔'' پھول امّاں نے اس تڑپ کے ساتھ فرمائش کی کہ میں ٹال نہ سکی لیکن اپنی کم علمی نے مجھے پریشان بھی کیا۔ میں بھلا مولانا پر کیا لکھ سکتی ہوں۔ ابھی ابھی پھول امّاں نے کتنے ہی نام گنوائے تھے جو پاکستان میں موجود ہیں۔ جنہوں نے مولانا کے ساتھ عمر بسر کی وہ لوگ آخر خاموش کیوں ہوگئے ہیں۔ میں نے تو بس انہیں کتابوں میں پڑھا ہے۔ وہ مفسّر، محدّث، فقیہہ اور خوش گو خطیب تھے۔ مگر ان پر قلم اٹھانا کس قدر دشوار ہے۔

پیاز کاٹتے ہوئے پھول امّاں نے اپنی منہ بولی بیٹی کو آواز دی اور دوسرے ہی لمحے تجلّیات عثمانی میرے ہاتھوں میں تھی۔

بیٹی اس میں سے کوئی موضوع چن کر تم ان پر کچھ لکھ دو۔

میں کتاب گھر لے آئی۔ ہر موضوع پڑھا وہ دنیائے اسلام کے بلند مرتبت فرزند تھے۔ وہ ادیب بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اردو فارسی اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ مجھے ان کی بے شمار تصانیف کے نام یاد آ گئے۔ تفسیر عثمانی تو میرے ذہن میں رچی بسی ہی تھی جسے ان کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ ان کی تمام تصانیف ایسی ہیں جن سے مذہب اسلام کے نظریات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مولانا کی نثر نگاری اور انشا پردازی مذہبی حقائق کو فلسفہ اور حکمت کے رنگ میں ادیبانہ انداز کے ذریعہ پیش کرتی ہے۔ ان کی تحریریں دلوں کو اپیل کرتی ہیں۔ قلب پر چھا جاتی ہیں۔ ذہنوں کو مسخر کر لیتی ہیں۔ رسالہ القاسم کا اجراء 1911ء میں دیو بند سے حضرت شیخ الہند اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیر سرپرستی ہوا۔ یہ ایک ماہنامہ تھا جس میں مولانا کے بے شمار مضامین شائع ہوئے ایک مضمون جسے علاّمہ نے دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث کی تعمیر کے سلسلے میں مسلمانانِ ہند کو متوجہ کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس کی تمہید ملاحظہ ہو۔

> ''عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں خدا کی قدرت دیکھ کہ ایک غنچہ میں چٹک ہوئی اور ایک ایسا پھول کھلا جس کی مست کر دینے والی مہک کے سامنے مُشک و گلاب کی بھی حقیقت نہ رہ گئی اور جب بلبلوں کے دماغوں میں اس کی مدہوش کر دینے والی خوشبو پہنچی تو انہوں نے جمع ہو کر خوب شور مچانا شروع کیا۔ اس پر چمنستان نبوّت کا وہ گلِ سرسبد گویا ہوا اور اپنے نغمۂ طرب افزا سے سب کی زبانیں خاموش کر دیں پھر کیا تھا بلبلیں اس کا لحنِ داؤدی سننے کیلئے گردنیں جھکا جھکا کر اور پر سمیٹ سمیٹ کر بیٹھ گئیں۔ اور جو لفظ بھی اس کی زبان سے نکلا اس کو اٹھالیا اور جو کلمہ بھی سنا اس کو فوراً دل کی تختی پر لکھ لیا۔''

مولانا کی تصانیف میں جو مقام ان کی تفسیرِ عثمانی کو حاصل ہے وہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔ تفسیرِ عثمانی ان کا شاہکار ہے۔ تفسیر کے مشکل میدان کو علاّمہ نے کس خوبصورتی کے

ساتھ پار کیا ہے اس کا اندازہ تو علاّمہ کی تفسیر پڑھ کر ہی ہوسکتا ہے جو مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے کہا ہے کہ ''تفسیرِ عثمانی میں جابجا ادبیّت کا رنگ جھلکتا ہے''۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بوقتِ وفات اپنا ذاتی کتب خانہ جو انہیں بے حد عزیز تھا وقف کر دیا لیکن اس موقع پر بھی دو کتابیں انہوں نے اپنے پاس رکھ لیں۔ ایک ''تفسیرِ عثمانی'' اور دوسری ''جمع الفوائد'' اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ علاّمہ کی تفسیر کا کیا مقام ہے۔

تفسیرِ عثمانی میں سلاست، روانی، سادگی اور جوش و فصاحت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

''اس دنیا کی مکدّر زندگی کو شبِ تاریک کے مشابہ سمجھو جس کے اندھیرے میں آدمی کو خیر و شر کے نتائج بالکل صاف دکھائی نہیں دیتے۔ بے شک حق تعالیٰ نے انبیاءؑ مرسلین کو بھیجا کہ رات کے اندھیرے میں مخلوق کو صحیح راستہ دکھائیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے اپنے درجے کے موافق اجالا کر دیں جس سے لوگوں کو خیر و شر کی حقیقت اور اس کے نتائج کا انکشاف ہو جائے۔''

بعض آیات میں علامہ نے ایک جملہ میں ایک طویل مضمون کو ادا کیا ہے اور کسی حقیقت کی طرف واضح اشارہ کر جاتے ہیں۔ اور جہاں کہیں خاص الفاظ اپنے معانی کے تعیّن میں اختلاف کا باعث بن کر قابلِ تحقیق ہو گئے ہیں وہاں علاّمہ نے اپنی لغت دانی اور تحقیقی قوت کا بے پناہ مظاہرہ کیا ہے۔

تفسیر ایک ثقہ اور متین مضمون ہے جس میں شعر و شاعری کا دخل کم ہے لیکن علاّمہ کے شاعرانہ مزاج نے اس کا بہترین استعمال کیا ہے انہوں نے اپنی تفسیر میں جہاں شگفتہ اور شستہ زبان پیش کی ہے وہاں اشعار بھی استعمال کئے ہیں نہ صرف اردو زبان کے بلکہ عربی اور فارسی کے بھی جو اُن کے ذوقِ شعری پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ فارسی، عربی اور اردو زبان میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ کو ان تینوں زبانوں کے ادب سے کتنا فیض حاصل تھا۔

علاّمہ کی تحریر میں ادبیت کا رنگ جابجا جھلکتا ہے خواہ وہ قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہوں

یا سیاسی مکاتیب' سیاسی خطبات و بیانات یا خالص تبلیغی ہدایات۔

علاّمہ کی تحریروں میں محاوروں اور روزمرّہ کا استعمال جابجا ملتا ہے حتّیٰ کہ قرآن کریم کی تفسیر میں بھی جہاں اس کے استعمال میں اگر ذرا بھی چُوک ہو جائے تو اس کی نقاہت و متانت میں رخنہ پڑنے کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ محاوروں کا استعمال ملاحظہ ہو۔

1- یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر سنگریزوں سے ''فوجوں کے منہ پھیر دیے۔''

2- چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

3- یہ کفار ڈینگیں مارتے ہیں مگر وہ وقت قابلِ دید ہوگا جب یہ لوگ محشر کا ہولناک منظر دیکھ کر گھبرائیں گے۔

4- آپ ان مشرکین کے جھنجٹ میں نہ پڑیئے۔

فصیح و بلیغ جملے اور شہرت یافتہ اقوال علاّمہ کی تحریروں میں جابجا ملتے ہیں۔ اور جن سے ان کی تحریروں میں رچاؤ، حسن اور نکھار پیدا ہو جاتا ہے مولانا کا خطابیہ انداز اپنے اندر ادب کے بے شمار محاسن چھپائے ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

''یاد رکھئے دنیا اپنے خود ساختہ اصولوں کے جس جال میں پھنس چکی ہے۔ اس سے نکلنے کیلئے جس قدر پھڑ پھڑائیگی اسی قدر جال کے حلقوں کی گرفت اور سخت ہوتی جائے گی۔''

استعارانہ انداز میں پوری عبارت اس قدر جاندار ہے اور استعارے کے باعث اس میں جو حُسن ہے وہ اہلِ ادب کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

محاکات کے سلسلے میں علاّمہ یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ محاکات اسے کہتے ہیں کہ کسی کے حالات کا اس طرح ذکر نا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ علاّمہ اس میں پورا کمال رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں وہ رنگ بھر دیتے ہیں کہ اس کی کیفیت قاری کے ذہنی اور بصری پردوں پر منقّش ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعثت سے پہلے اور بعثت کے وقت عرب کی

حالت یوں بیان کی۔

''دیکھئے دنیا کس قدر بھیانک اور تاریک نظر آ رہی ہے۔ شیطانی طاقتوں نے کس قدر پرے جما رکھے ہیں۔ امن واطمینان کی ایک کرن بھی کسی طرف نظر نہیں آتی۔ تیرہ تاریک گھٹاؤں نے دن کو رات بنا دیا ہے۔ ان ہی خوفناک اندھیروں میں دفعتاً مکّہ کی پہاڑیوں پر ایک چمک دکھائی دی۔ رحمت کا بادل زور سے گرجا اور کڑکا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جبل النور کی چوٹی سے دنیا کا ہادی اور شہنشاہ اللہ کا پیغمبرِ اعظم چمکتا ہوا اور گرجتا ہوا بارانِ رحمت کو ساتھ لئے نزولِ اجلال فرما رہا ہے۔''

الفاظ میں کس قدر شوکت۔ دبدبہ روانی اور تسلسل موجود ہے کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔

علاّمہ کی دینی تصانیف کے علاوہ ان کے وہ خطبات بھی ادبی رنگ لیے ہوئے ہیں جو سیاسی نوعیت کے ہیں۔ پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں جب قائدِ ملت لیاقت علی خان نے قرار داد مقاصد ایوان کے سامنے پیش کی تو اس موقع پر علاّمہ نے اس قرار داد کی حمایت کرتے ہوئے پہلے لیاقت علی کو ایسی قرار داد پیش کرنے پر مبارکباد دی۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اگر غور کیا جائے تو یہ مبارک باد میری ذات کی طرف سے نہیں بلکہ اس پسی ہوئی اور کچلی ہوئی روحِ انسانیت کی جانب سے جو خالص مادّہ پرست طاقتوں کی حریفانہ حرص و آز اور رقیبانہ ہوس ناکیوں کے میدانِ کارزار میں مدّتوں سے پڑی کراہ رہی ہے اس کے کراہنے کی آوازیں اس قدر درد انگیز ہیں کہ بعض اوقات اس کے سنگدل قاتل بھی گھبرا اٹھتے ہیں اور اپنی جارحانہ حرکات پر نادم ہو کر تھوڑی دیر کیلئے مداوا تلاش کرنے لگتے ہیں مگر پھر بھی علاج و دوا کی جستجو میں وہ اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ جو مرض کا اصل سبب ہے اسی کو

دوا اور اکسیر سے سوا سمجھ لیا جاتا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"اگر ہماری اسی نئی اور بے چین دنیا کو اپنے تباہ کن مصائب سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہے تو اسے حالات کا بالکل جڑ بنیاد سے از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ کسی درخت کی شاخوں اور پتوں پر پانی چھڑکتے رہنا بیکار ہے۔ اگر اس کی جڑ جو سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبی ہوتی ہے مضبوط نہ ہو۔ آج کے دن بہت سے بکھرے ہوئے مسائل خواہ ان سے آپ کو کتنی ہی دلچسپی اور شغف کیوں نہ ہو کبھی ٹھیک طور پر سنور اور سلجھ نہیں سکتے۔ جب تک ان کے اصول بلکہ اصل الاصول درست نہ ہو جائیں۔"

علامہ کے خطوط بھی ادبیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ "انوارِ عثمانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ ان کے خطوط کی زبان نہایت شیریں، صاف، مربوط اور دلنشین ہے۔ پڑھتے جایئے اور لطف لیتے جایئے۔

مختصر یہ کہ علامہ کی ذات میں نہ صرف ایک خوش گو اور خوش بیاں انسان چھپا ہوا ہے بلکہ ایک بہترین ادیب بھی ان کی شخصیت سے جھلکتا نظر آتا ہے۔

(16 دسمبر 1968 کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور اسی روز ان کی برسی پر پھول اماں کے سامنے پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

م سے منظر چچا

کیلنڈر کے صفحات کس تیزی سے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتا ہے دن ہفتے بن جاتے ہیں۔ ہفتے مہینوں میں ڈھل جاتے ہیں اور مہینے سالوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ دن رات کا یہ نہ رُکنے والا چکرّ چلتا ہی رہتا ہے۔ وقت پر کسی کا قابو نہیں۔ یہ تو ایک سیلِ بیکراں کے مانند ہے۔ موجیں اٹھتی ہیں ابھرتی ہیں اور پھر ڈوب جاتی ہیں۔ سال بھر کا عرصہ یونہی بیت گیا اور آج منظر چچا کی برسی کا دن ہے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہم منظر چچا کا سوئم، چہلم اور برسی کا دن منائیں گے۔ یہ ایمان رکھتے ہوئے بھی کہ اس دنیا میں ہر شے کو فنا ہے ہر چیز کو مٹ جانا ہے۔ آگے پیچھے ہم سب کو اٹھ جانا ہے۔ مگر بعض شخصیتیں ہمارے درمیان ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ یوں ہم سے ایک دم جدا ہو جائیں گی۔ ایسی ہی شخصیتوں میں سے ایک منظر چچا بھی تھے۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے گھر میں منظر چچا کا اتنا ہی عمل دخل پایا جتنا کسی گھر میں اس مرد کا ہوتا ہے جو افراد خانہ میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ منظر چچا ہمارے اپنے گھر کے فرد نہ تھے وہ تو بس ہمارے ابا کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ کبھی کسی وقت ابّا نے منظر چچا کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا تھا کہ اسے وہ زندگی بھر نہ بھول پائے وہ تو ایک لمحاتی مدد کر کے دنیا سے جلد ہی چلے گئے لیکن ان کے جانے کے بعد منظر چچا ہمارے گھر کے فرد بن گئے اور قرضہ چکانے میں لگ گئے۔ انہیں ہمارے لمحے لمحے کا علم ہوتا وہ ہماری

خوشیوں اور غموں میں سب سے پہلے شریک ہوتے۔ خوشی پر اتنا خوش ہوتے کہ جیسے یہ ان کی ہی خوشی ہو۔ اور غم پر اتنا کڑھتے جیسے یہ غم صرف ان کا اپنا غم ہو۔ ایسی ہستی جب ہم سے یکا یک اور اچانک چھن گئی تب ہم سب کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہواؤں میں جھول کر رہ گئے۔

آج پورا ایک سال بھی گزر گیا لیکن اب بھی یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ آجائیں گے کہیں گے'' کیچڑ والی لڑکی ذرا پانی تو پلاؤ۔''

اور جب میں پانی لیکر آؤں گی تو وہ کہیں گے...... ''دیکھ تیرے ہاتھ کتنے گندے ہیں کیچڑ والی لڑکی ہے نا میں نہیں پیتا پانی'' اور میں بچوں کی طرح مچل جاؤں گی منظر چچا اب میں اتنی بڑی ہوگئی ہوں۔ آپ ابھی تک مجھے کیچڑ والی لڑکی کہتے ہیں۔'' تب وہ اماں سے مخاطب ہو جائیں گے۔'' بھابھی یہ وہی لڑکی ہے نا جسے ہم کیچڑ سے نکال کر لائے تھے۔ اور جس کے منہ میں کان میں ناک میں اور آنکھوں میں اندر تک کیچڑ بھرا تھا۔ اور جسے ہم نے کئی ہزار مشکوں کے پانی سے کئی سال تک دھویا تھا۔ مگر ابھی تک یہ صاف نہیں ہوئی ہے۔ اور اماں ان کی باتوں پر مسکراتی رہیں گی۔ وہ کہیں گے۔ ''بھئی ہمیں سڑک پر پڑی دیکھ کر ترس آ گیا تھا تو پال لیا۔ مگر یہ تو ہماری بیٹی ہی بن بیٹھی۔ چل اپنا نام سنا''۔ اور میں ہار کر ان کا یاد کرایا نام سنانے لگتی۔ مٹی + دھول + کیچڑ = منی عرف کیچڑ والی۔ میرا نام مساوات کی صورت میں ان ہی کا یاد کرایا ہوا تھا۔ ادر جب تک میں اسے یوں ہی نہ دہراتی وہ مجھے تنگ کرتے رہتے۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے تو اب بھی یک بارگی خیال آ جاتا ہے کہ منظر چچا کا فون ہوگا۔ اور ان سے فون پر کی ہوئی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔

''م'' سے منی بول رہی ہے۔ ادھر سے میں کہتی اور آپ ''م'' سے منظر چچا ہیں اور پھر میں پوچھتی ''م'' سے مسلم لیگ کیسی ہے۔ اور مسلم لیگ کے ذکر پر وہ جوش میں آ جاتے۔ کہتے دیکھو۔ ''م'' سے میرا نام ''م'' سے ہی مسلم لیگ' میں چھیڑتی اور ''پ'' سے

پاکستان یہ تو آپ کا نہیں ہوا۔؟

وہ بھڑک اٹھتے ہیں ''م'' سے میرا پاکستان۔ اور ''ق'' سے قائداعظم میں پھر چھیڑتی۔ کہتے نہیں ''م'' سے محمد علی جناح اور یوں ''م'' سے طویل فہرست بنتی رہتی۔ آدھا آدھا گھنٹہ مجھ سے فون پر باتیں کرتے۔

انہیں بچوں سے بہت پیار تھا۔ ہنستے کھیلتے بچوں کو منٹوں میں رلا دیتے اور روتے ہوئے بچوں کو ہنسا دینا انہیں خوب آتا تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے ایسے مزے مزے کی باتیں کرتے کہ ہنستے ہنستے ہم سب کا منہ دکھنے لگتا۔ آخرکار ہم لوگ کہہ ہی اٹھتے۔ بس منظر چچا اب تو ہنسا بھی نہیں جاتا۔ کہتے چلو اب رونے کی باری ہے۔ اور آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں تو لگتا ہے کہ وہ کہیں گے چلو اب رونے کی باری ہے۔ یہ باری بہت لمبی ہوگئی ہے منظر چچا بس اب تو ہمیں ہنسا ہی دیجیے۔

وہ جس قدر ہنس مکھ تھے اسی قدر سنجیدہ بھی۔ خاص طور پر جب مسلم لیگ کا ذکر آجائے۔ پاکستان موضوع بنے یا قائداعظم کی گفتگو ہو۔ یہ تین ان کی کمزوریاں تھیں۔ ان کے بارے میں وہ کوئی مذاق برداشت نہیں کرتے۔

ان کی ذاتی زندگی کچھ بھی نہیں تھی۔ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی ہم اکثر کہتے منظر چچا ہم چچی کسے کہیں؟ وہ مخصوص انداز میں مسکراتے اور کہتے ''میں نے شادی کرلی ہے۔'' اور پھر انکشاف کرتے مسلم لیگ سے۔ ساری عمر مسلم لیگی رہے۔ طالبعلمی کے زمانے سے آخری دن تک۔ انہوں نے مسلم لیگ میں اعزازی طور پر کام کیا اور کبھی ایک پائی بھی وصول نہیں کی۔

ہم اکثر کہتے آپ کو مسلم لیگ کیا دیتی ہے۔ آپ کا وقت تک لے لیتی ہے۔ آپ وکالت کیوں نہیں کرتے؟ وہ ہمیں چپ کرا دیتے جیسے ہم کفر بک رہے ہوں۔ ایسا نہ کہو۔ مسلم لیگ سے میں کچھ نہیں لے سکتا۔ میں اس کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ اپنی محنت۔ شفقت توجہ وقت اپنا خلوص۔ اپنی آمدنی اور اپنی جان اور واقعی وہ زندگی بھر مسلم لیگ پر یہی کچھ

نچھاور کرتے رہے۔

پاکستان سے انہیں جو محبت تھی کیا کسی کو اپنے باپ سے ہو گی۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ پاکستان ہم نے بنایا ہے۔ ہماری مسلم لیگ نے اور اس کے بعد وہ ساری تاریخ دہرا کر رکھ دیتے۔ ہم نے بارہا ان کے منہ سے 1947 سے پہلے کے واقعات سنے ہیں جن میں وہ قائداعظم اور دوسرے رہنماؤں کا تذکرہ کرتے اور بتاتے کہ 46-1945ء میں جب پاکستان کے نام پر ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات لڑے گئے تب انہوں نے اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر کی حیثیت سے کس طرح حصہ لیا۔ انہوں نے کوئی چھ ہزار کے قریب طالبعلموں کو اس مقصد کیلئے تیار کیا ان کی تربیت کی جنہوں نے اس ریفرنڈم کو کامیاب بنایا جو فرنٹیئر اور سلہٹ میں ہوا۔ صوبائی اور مرکزی انتخابات، پنجاب، سندھ، یو پی، سی پی، بہار، اڑیسہ، اجمیر اور بمبئی میں ہوئے۔ یہ تمام انتخابات ان کی نگرانی اور قائداعظم کی براہ راست سرپرستی میں ہوئے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے کہ آج وہ جس ملک کے شہری ہیں اسے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنے قائد کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا ہے۔ انہوں نے ملک کے لیے جتنے بھی کام کئے مسلم لیگی کی حیثیت سے کئے۔ وہ جس طرح شروع سے لیکر آخیر تک۔ اپنے نظریئے پر قائم رہے۔ وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بڑی واضح اور درخشاں مثال ہے۔ وہ آخر تک بے غرض کارکن کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی اعزاز یا عہدے کی تمنا نہیں کی اور اپنے آپ کو ہمیشہ اس ملک اور مسلم لیگ کا خادم کہتے رہے۔

مسلم لیگ سے وہ 1938 میں وابستہ ہوئے اور سب سے پہلے گوالیار اسٹیٹ مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے 1939ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی 1944ء تک لگاتار ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ 1945ء سے 1947ء تک علی گڑھ مسلم لیگ کے صدر رہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد 1948ء سے 1950ء تک آل پاکستان اسٹیٹس مسلم لیگ کے صدر اور 1950ء میں کراچی صوبائی مسلم لیگ کے جنرل

سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد سے پاکستان مسلم لیگ کے اعزازی جوائنٹ سیکریٹری رہے۔ اور انتقال تک اپنے آپ کو مسلم لیگی کہتے رہے۔ وہ کہتے جس طرح مجھے اپنا مذہب عزیز ہے۔ اور میں اسے نہیں بدل سکتا اسی طرح مجھے اپنا سیاسی نظریہ عزیز ہے۔ اور میں اسے بھی نہیں تبدیل کر سکتا۔

وہ اردو زبان کے شیدائیوں میں سے تھے۔ جب وہ علیگڑھ یونیورسٹی یونین کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے تو اس زمانے تک یونین کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ یونین کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے یونین کی زبان تبدیل کر دی اور ان کے زمانے میں پہلی بار تمام کارروائی اردو زبان میں ہوئی اور 1936ء سے لیکر آج تک وہاں کی زبان اردو ہی ہے۔ یقیناً یہ ان کا تاریخی کارنامہ تھا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے اردو کی خدمت جاری رکھی 59-55ء تک متواتر چار سال انجمن ترقیٔ اردو کراچی کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ 57-56 میں کُل پاکستان انجمن ترقیٔ اردو کے جوائنٹ سیکریٹری بھی رہے۔

انہیں تعلیمی مشاغل اور تعلیمی اداروں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ نہ جانے کتنی ہی تعلیمی مذہبی، ثقافتی اور سماجی اداروں کی سرپرستی کرتے رہے۔ اگر 1938 سے آخری ایام تک ان اداروں کی تعداد معلوم کی جائے تو یقیناً وہ ہزاروں سے تجاوز کر جائے کتنے ہی اداروں کو خود انہوں نے قائم کیا۔ نہ جانے کتنی ہی لائبریریاں، تعلیم بالغان کے سینٹر اور سماجی بھلائی کے ادارے قائم کئے اور کبھی ان سے ذاتی فائدے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ وہ بلند پایہ وکیل بھی تھے۔ ایم اے کے ساتھ وکالت کا امتحان بھی علی گڑھ سے ہی پاس کیا۔ پاکستان آنے کے بعد 52-51ء میں وہ کراچی بار ایسوسی ایشن کے سیکریٹری ہوگئے۔ ان دنوں وکیلوں کی یہ واحد انجمن تھی۔ انہوں نے بین الاقوامی قانون کانفرنس میں بارہا پاکستان کی نمائندگی کی 1954ء میں مولوی تمیز الدین خان کا مشہور مقدمہ بھی ان کی قابلیت کی دلیل تھا۔ اس مقدمہ میں انہوں نے قانون کے

ساتھ ساتھ جمہوریت کی بحالی کیلئے جو کچھ کیا وہ ایک شاندار مثال ہے۔ اس وقت کے وزیراعظم نے اپنے تمام تر اختیارات استعمال کئے کہ وہ اس مقدمے کو واپس لے لیں لیکن وہ تمام دھمکیوں اور لالچ سے بے پروا ہو کر برابر اسی بات پر ڈٹے رہے کہ مقدمہ واپس نہیں لیا جائے گا اور آخر کار اس مقدمے میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ اگر وہ صرف وکالت کی طرف توجہ دیتے تو بلند پایہ وکیل کی حیثیت سے نام پیدا کرتے۔ لیکن مسلم لیگ کی وابستگی نے انہیں کسی اور طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیا۔ انکی ضروریات زندگی بے حد محدود تھیں۔ انہوں نے کبھی جائیداد بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کسی عہدے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد سے آخری ایام تک انہیں جانے کتنی وزارتیں پیش کی گئیں۔ کچھ اس لئے کہ ان کے خلوص پر کسی کو شک نہ تھا۔ کچھ ان کی قابلیت سے بھی لوگ مرعوب تھے اور بلاشبہ کچھ عہدے اس لئے بھی پیش کئے گئے کہ وہ بلا کے سچے انسان تھے اور برائی کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص اپنی بات کا دھنی ہے اور اسی لئے لوگ ان کی زبان بند کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً کرسی کا لالچ دیتے رہتے مگر وہ ہمیشہ اسے ہیچ جان کر ٹھکراتے رہتے۔

سابقہ حکومت میں یہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جو ذاتی منفعت سے بالاتر رہتے ہیں انہوں نے اپنے نام کوئی لائسنس جاری نہیں کرایا۔ کوئی الاٹمنٹ حاصل نہ کیا۔ کوئی عہدہ نہیں لیا۔ نہ اپنے خاندان کے افراد کیلئے اس کی سفارش کی۔ وہ ٹین کی چھت کے مکان میں جانے کتنی سردیاں اور گرمیاں گزارتے رہے اور مقدمہ لڑ لڑ کر ضروریات زندگی پوری کرتے رہے۔

وہ کٹر مولوی اور دل و جان سے مسلم لیگی تھے۔ اور ان دونوں چیزوں سے سمجھوتہ کرکے وہ جیتے رہے مگر زندگی کے آخری ایام ان پر بھاری تھے۔ غلط قیادت سے دل برداشتہ تھے اور ان کے چہرے پر پہلے والی وہ شگفتگی اور اعتماد نہ تھا۔ وہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم لوگ انہیں اکثر چھیڑتے۔ منظر چچا آپ کی مسلم لیگ کیا ہوئی۔؟ تب وہ

بڑے کرب سے کہتے۔ ''ہر چیز کو فنا ہے۔ میری مسلم لیگ۔ قائد کی مسلم لیگ بھی ختم ہو گئی۔ اور اب میرا دنیا میں رہنا بھی مشکل ہے۔ ان کی مایوسی کی باتیں سن کر ہم لوگ پریشان ہو جاتے۔ وہ ہماری پریشانی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خوش کرنے کو کہتے۔ اب میں اپنی مسلم لیگ کی تاریخ لکھوں گا۔ یہ کام وہ شروع بھی کر چکے تھے۔ مگر اچانک اوپر سے بلاوا آیا اور وہ اس دنیا کو چھوڑ کر اچانک چلے گئے۔ بھلا مسلم لیگ کی سسکتی ہوئی لاش کو وہ کیسے کاندھا دیتے جسے وہ زندگی بھر عزیز سمجھتے چلے آئے تھے۔

مجھے ان کی زندگی کے آخری ایّام بڑی شدّت سے یاد آ رہے ہیں۔ وہ عجیب اداس دن تھے۔ ہمیشہ مسکرانے والے منظر چچا بڑی حد تک مایوسی کی باتیں کرنے لگے تھے اور جیسے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ اس دنیا سے بہت جلد جانے والے ہیں۔

ایک بار جب وہ آئے تو ہم سب بہن بھائی ان کے پیچھے پڑ گئے یہ آپ علی گڑھ کٹ پائجامے کے بجائے شلوار کیوں پہننے لگے۔ کہنے لگے بھئی جیسا دیس ویسا بھیس۔ پھر انہوں نے بتایا کہ پورا تھان لیکر انہوں نے ڈھیر ساری شلواریں سلوا لی ہیں۔ اب یہ زندگی بھر کیلئے کافی ہیں۔ اور وہ واقعی اس کے بعد زیادہ جی نہیں سکے۔

آخری بار وہ ہمارے گھر خاصے وقفے کے بعد آئے تو اماں نے شکوہ کیا۔ ''اتنے دن کہاں رہ گئے تھے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ بھابھی ذرا آسمان کی طرف نکل گیا تھا۔ یہی کچھ فرشتوں سے باتیں کرنی تھیں۔ انہوں نے روک لیا۔ کافی عرصے ان کا مہمان رہا۔ دنیا میں واپس آیا تو سیدھا آپ کے پاس پہنچ گیا۔''

آنکھوں کے آپریشن کی بات ہوئی تو کہنے لگے اسپتال میں جگہ ہی نہیں مل رہی ہے۔ کچھ جگہ دل والوں نے لے لی ہے کچھ جیب والوں نے۔ میرے پاس نہ آنکھ ہے نہ دل نہ ہی جیب۔ وہ رنجیدہ ہو کر بھی سنجیدہ بات کرنے کے عادی نہ تھے۔

بہر حال انہیں چند روز بعد اسپتال میں ان تینوں چیزوں کی غیر موجودگی کے باوجود

جگہ مل گئی۔ شاید اس لئے کہ انہیں اب اس دنیا میں زیادہ رہنا ہی نہ تھا۔ آپریشن کے دوران ہی وہ پھر آسمان کی طرف نکل گئے۔ یونہی کچھ فرشتوں سے گفتگو کرنے۔ مگر اب کی بار منظر چچا کو لوٹ آنے میں بہت دیر ہوگئی ہے۔ شاید فرشتوں نے انہیں مستقل مہمان بنا رکھا ہے۔ مگر ہم صدا لگاتے رہتے ہیں منظر چچا بہت دن ہوگئے اب تو لوٹ آیئے۔ فرشتوں سے مذاکرات طویل تر ہوتے جا رہے ہیں ان کی واپسی کی آس بھی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ شاید اب ہمیں ہی جنّت کی طرف رخ کرنا ہوگا۔ کون جانے منظر چچا وہاں ہمارے منتظر ہوں۔

(10 اپریل 1971 کو ان کی برسی پر لکھا گیا یہ مضمون روزنامہ جنگ کراچی میں چھپا۔)

☆☆☆☆

آواز کے جادوگر — زیڈ اے بخاری

میں نہ شاعر نہ ادیب نہ آواز کی دنیا سے قریب۔ پھر بھلا بخاری صاحب سے میری قربت ہوتی تو کیونکر۔ بس میں تو انہیں اسی قدر جانتی تھی کہ جہاں کہیں مشاعرہ میں انہوں نے شرکت کی میں انہیں سننے پہنچ گئی۔ انہوں نے جو کچھ لکھا گھر بیٹھے پڑھ لیا۔ ریڈیو ٹی وی پران کی آواز سن لی۔ اور اسی طرح میں ان سے متعارف بھی تھی اور متاثر بھی۔ لیکن ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ ہونے کے ناطے میری ملاقاتیں اکثر بڑی شخصیتوں سے کچھ اس طرح ہوا کرتیں کہ میں اپنے کالج میں منعقد ہونے والی تقاریب میں انہیں مدعو کرتی اور چونکہ تقریب کی نگراں میں ہوتی لہٰذا ان شخصیتوں کی صحبت میں کچھ دیر گزار لینے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔

بخاری صاحب کو بھی میں نے پہلی بار پروگرام'' ایک واقعہ ایک تاثر'' کے عنوان سے ہونے والے مستقل پروگرام میں مدعو کیا تھا۔ اس پروگرام کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ تاریخی شخصیتوں کو ہم مدعو کرتے اور ان کی زندگی کا کوئی ایک اہم واقعہ ان کی زبانی سنتے۔ اس سلسلے میں ابتک ہم نے ابن انشاء، جمیل الدین عالی، ابراہیم جلیس، ضیاء جالندھری، فیض احمد فیض، نظیر صدیقی، بیگم حبیب ابراہیم رحمت اللہ، بیگم تزئین فریدی، بیگم براس، حسین امام اور دیگر اکابرین کو مدعو کر چکے تھے اُن دنوں کے بخاری صاحب اِن دنوں کے بخاری صاحب سے بہت مختلف تھے میں نے دبے لہجے میں ان سے شرکت کی درخواست کی جس کا فوری جواب مجھے یہ ملا۔ ''نہیں آتے''

میں حیران و پریشان ان کی جانب دیکھتی رہی۔ اور پھر بغیر کچھ کہے مایوس افسردہ اور شرمندہ لوٹ جانے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلام کر کے چند ہی قدم اپنی جگہ سے ہلی تھی کہ انہوں نے آواز دیکر بلالیا۔

''بلانا چاہتی بھی ہو کیا؟''

''جی'' میں حیران سی تھی۔

بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے رعب دار آواز میں کہا۔ اور سہمی ہوئی بیٹھ گئی۔ میں اس کا اقرار کرتی ہوں کہ میری یہ پہلی براہ راست ملاقات ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑ رہی تھی۔

''کب ہے؟ کس وقت ہے تمہاری تقریب؟ ان کی آواز میں اب خاصی مفاہمت تھی۔

میں نے انہیں بددلی سے وقت اور تاریخ سے مطلع کیا۔

''آ جاؤں گا''

''جی میں ان کے اقرار پر حیران تھی۔

''آ جاؤں گا'' انہوں نے دوبارہ کہا اس بار مفاہمت کے ساتھ محبت بھی تھی مجھے حوصلہ ہوا۔ ''ہمارے یہاں سے کوئی آپ کو لینے آ جائے۔''

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ پھر کڑک کر بولے۔

''کیا میں نے راستہ نہیں دیکھا ہے۔ میں کوئی بچہ ہوں؟'' مجھے پھر ڈر لگا اس بار لہجہ پھر مختلف تھا۔

میں اب بھی سہمی ہوئی تھی اور مجھے ان کے وہ ڈرامے بھی یاد آ رہے تھے کہ ایک ہی کیریکٹر کو انہوں نے اپنے آواز کے زیر و بم سے کئی کئی بنا دیا تھا۔

''ڈرامہ اُن کی زندگی ہے۔ نہیں، لہجے کا اُتار چڑھاؤ ان کی زندگی ہے۔ نہیں، ریڈیو پر آواز آزمانا ان کا فن ہے۔ میں ایک ہی سوچ میں بار بار گڑ بڑا رہی تھی۔ مگر لوٹتے وقت میں بہت خوش تھی۔

تقریب ان ہی کی صدارت میں تھی۔ اپنی زندگی کا کونسا ورق انہوں نے پلٹا مجھے یاد نہیں۔ دراصل پروگرام کی منتظم ہونے کی وجہ سے میرے ذمّے اتنے کام ہوتے ہیں کہ اسٹیج پروگرام کے شرکاء کے حوالے کر کے میں دوسرے دن کی تقریب کے تانے بانے بُننے لگتی ہوں۔ بہر حال وہ تقریب بخیر وخوبی ختم ہوئی اور اس کا اتنا خوشگوار اثر میرے ذہن پر باقی ہے کہ بخاری صاحب کی شخصیت کا وہ پہلو جو ان سے پہلی بار ہمکلام ہو کر مایوس ہو جانے کا تھا ختم ہو چکا ہے۔

دوسری بار جب صحافت میں ایم اے کرنے کے بعد میں نے ٹی وی اسٹیشن کا رخ کیا تو تب پھر بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی۔

''تو تم نے جرنلزم میں ایم اے کرلیا ہے۔'' انہوں نے ''جرنلزم'' پر زور دیا۔

''جی صحافت میں'' میں نے فوراً ہی اپنی غلطی بھانپ لی۔ وہ خوش ہوئے تم کام کر لوگی۔ اور پھر انہوں نے مجھ سے کچھ ذاتی سوال کئے۔

''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''وہ میری پیدائش کا انتظار ختم ہونے کے بعد فوراً ہی دنیا سے چلے گئے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے اور میں ان کی انتہائی موٹی موٹی بھنوؤں کو دیکھتی رہی جو اوپر نیچے ہل رہی تھیں۔

''تمہارے والد کہاں کے تھے؟'' میرا جواب سن کر انہوں نے مختار صدیقی کو بلایا جو اُن دنوں کراچی ٹی وی سے وابستہ تھے۔

یہ علی گڑھ کی ہیں۔ ان کے والد حسن عبداللہ تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں کنٹرولر۔ جانتے ہونا۔

اور پھر انہوں نے مجھے مختار صدیقی کے حوالے کر دیا۔

مختار صدیقی نے اپنے دوست کی بیٹی کو اپنے ساتھ آنے کو کہا جب میں جانے لگی تو بخاری صاحب کی آواز آئی۔

''تمہارا تقرّر ہو چکا ہے۔ کام تمہیں مختار صدیقی سمجھائیں گے۔''

مختار صاحب کی شفقت مجھے اب تک یاد ہے۔ انہوں نے مجھ سے جلدی جلدی ڈھیر ساری باتیں کیں۔ کام بھی سمجھاتے رہے اور مجھے آئندہ کی کسی تاریخ کو پھر بلایا۔

بہر حال یہ ملاقات بخاری صاحب سے میری دوسری چھوٹی سی ملاقات تھی۔ جب میں اپنی ملازمت کی تاریخ پر وہاں پہنچی تو نہ بخاری صاحب موجود تھے نہ مختار صدیقی۔ لہٰذا میں نے کسی اور سے ملنے کی کوشش ہی نہ کی اور واپس لوٹ آئی۔

تیسری اور بھرپور ملاقات 19 اور 20 جون 1975 کو بخاری صاحب سے پھر ہوئی۔ انجمنِ اتحادِ طالبات کی نگراں ہونے کی حیثیت سے میں نے کالج میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا۔ میرے دل میں بخاری صاحب کو اپنے کالج میں بلانے کی خواہش موجود تھی اور اس بار نا مساعد حالات ہونے کے باوجود میں نے مشاعرہ اپنی ضد اور زبردستی سے منعقد کرایا۔ نہ جانے اس میں کون سی طاقت کام کر رہی تھی کہ بے پناہ مخالفتوں کے باوجود مشاعرہ ہماری سات عدد تقاریب کی فہرست میں جگہ پا گیا اور پھر ہم نے سحر انصاری صاحب کی معرفت بخاری صاحب سے صدارت کی درخواست کی۔ ازراہ کرم انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دراصل انہیں کالج کی وہ پہلی تقریب بھی یاد تھی اور اس کی یادان کیلئے کچھ بُری بھی نہیں تھی۔ مجھے مشاعرے کے سلسلے میں کئی چیلنج کا سامنا تھا جن میں ایک یہ بھی شامل ہو گیا کہ بخاری صاحب کو اس عمر میں بلانا آسان کام نہیں۔ وہ سخت بیمار تھے۔ لیکن میں نے تو ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ 19 جون کو ضیاء محی الدین کے ساتھ ایک پروگرام تھا۔ دو بجے دن ہماری یہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ میں اسٹیج پر تھی۔ طالبات کو ہدایات دے رہی تھی۔ تقریب میں نظم وضبط میری ہمیشہ سے کمزوری رہی ہے۔ انتظامات کے ساتھ ساتھ مجھے مہمان کا انتظار بھی تھا کہ ایک گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور معمول کے مطابق لمحے بھر میں مجھے مطلع کر دیا گیا کہ مہمان آ گئے ہیں۔ لیکن جب میں نے اسٹیج پر کھڑے کھڑے دُور گاڑی میں سے نکلتے ہوئے ایک سفید سر کو دیکھا تو سوچنے لگی "کیا ضیاء محی الدین رُوپ دھار کر آئے ہیں" میں مسکرا پڑی۔ لیکن پھر لوگوں کا

لپک کر کسی کو تھامنا اور سہارا دے کر آفس کی جانب لے جانا۔ یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین ہی نکل گئی۔ ''یہ تو سو فیصد بخاری صاحب ہیں۔''

پھر تقریباً دوڑتی ہوئی آفس تک پہنچی۔

وہ بخاری صاحب ہی تھے۔ انہیں آفس میں بٹھایا جا چکا تھا پرنسپل صاحب نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

''کیا آج بھی بخاری صاحب کے ساتھ کوئی پروگرام ہے۔؟''

مگر میں کیا جواب دیتی۔ حواس باختہ تھی۔ گردن نفی میں ہلائی اور ان کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔

''میں صرف دس منٹ لیٹ ہوں۔'' انہوں نے گھڑی دیکھ کر مجھے مخاطب کیا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا ''بخاری صاحب آپ 24 گھنٹے جلدی آ گئے ہیں۔''

ہوا کچھ یوں تھا کہ مشاعرہ 20 جون جمعہ کے دن تھا اور وہ 19 جون جمعرات کے ہی دن آ گئے تھے۔

اصل میں مجھے صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہوئی ہے۔ اور پانچ منٹ مجھے گاڑی سے آفس تک آنے میں لگے ہیں۔ اور اس احساس کے ساتھ کہ اب وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتے۔ آبدیدہ ہو گئے میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان سے کیا کہوں۔؟

گھبراہٹ میں تمام اساتذہ کا ان سے تعارف کرانے لگ گئی جو ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے ان کے چاروں جانب کھڑے تھے۔

بخاری صاحب خود بھی سب سے کھڑے ہو کر ملنا چاہتے تھے کہ ہم سب نے انہیں اس سے باز رکھا۔

''بھئی وہ لوگ نہیں آئے ابتک۔؟'' ان کا اشارہ شاعروں کی جانب تھا۔''

اور پھر مجھے رکتے اور اٹکتے ہوئے یہ بتانا پڑا کہ مشاعرہ تو کل یعنی جمعہ کو ہے۔

پھر یہ جمعرات کا ذکر کیوں آیا تھا؟ انہوں نے پوچھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ میں نے

سحر انصاری صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ بدھ کے روز بخاری صاحب کو فون کر کے پھر مطمئن ہو جائیں کہ وہ جمعہ کو ضرور آ رہے ہیں۔ سحر صاحب نے بخاری صاحب کو فون کیا۔ وہ بدھ کا دن تھا اور شام کے سات بج رہے تھے۔ پتہ یہ چلا کہ بخاری صاحب کوئٹہ سے آئے ہیں اور بیمار ہیں۔ جسم پر پیسے برابر سرخ سرخ نشانات سے پڑگئے ہیں۔ جس میں تکلیف بھی ہے۔ اور اس وقت وہ اس پر دوائیں لگائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مشاعرے کا سن کر کہا کہ جمعرات کو فون کر کے میری خیریت پھر سے معلوم کر لینا۔ طے پایا کہ سحر صاحب جمعرات کو پھر فون کریں گے۔ لیکن فون کرنے سے پہلے وہ جمعرات کے دن کالج میں موجود تھے۔ میں نے سحر صاحب اور ان کی گفتگو کا حوالہ دیا۔ پھر انہیں غلط فہمی کا احساس ہوا۔

سب اپنی جگہ پریشان بھی تھے اور پشیمان بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ضعیفی اور کمزوری میں ان پر اپنی اس شدید خواہش کا اظہار کیونکر کروں کہ وہ کل پھر آئیں۔ اور ضرور آئیں۔ مجھ میں یہ تاب یہ مجال یہ ہمت ہرگز نہ تھی۔ بہت کچھ سوچ کر میں صرف اس قدر کہہ سکی کہ آپ آج کی ہماری تقریب میں شرکت کریں۔ میرا مقصد یہ بھی تھا کہ طالبات انہیں دیکھ لیں گی جو بڑی مشتاق بھی تھیں انہیں دیکھنے کی۔

''آج کیا ہے؟'' انہوں نے سوال کیا میں نے پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ سنتے ہی کہنے لگے۔

''بھئی مجھے فوراً ہی یہاں سے چلنا چاہیے۔ میں گھبرا گئی وہ اس اثناء میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ضیاء محی الدین کا میں مقروض ہوں۔ اس کے ایک خط کا جواب مجھ پر واجب ہے۔ اور اس لئے مجھے اس کے آنے سے پہلے چلے جانا چاہیے اُس سے بھی کہہ دینا۔

اور جب وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلنے لگے تو سب نے بڑھ کر سہارا دیا۔ گاڑی میں بیٹھے تب میں نے ساری ہمّت جمع کر کے کہا۔

''بخاری صاحب میں مروّتاً بھی یہ نہیں کہہ پارہی ہوں کہ کل آپ زحمت نہ کریں۔
وہ مسکرائے۔ ''کل میں ضرور آؤں گا۔ بشرطیکہ زندہ رہا۔ جانتا ہوں کہ منتظم کی کیا حالت ہوتی ہے، جب مہمان تقریب میں نہیں پہنچتا۔ میں بخاری صاحب کی بے حد ممنون ہوئی کہ اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتی۔ جمعرات 19 جون کو 30 منٹ کی یہ نشست اب ہم سب کو حددرجہ غنیمت لگ رہی تھی جو ایک غلط فہمی کے باعث ہمیں میسّر آ گئی تھی۔

دوسرے دن وہ ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ لیکن جب تک وہ پہنچے نہیں تھے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑی بے ترتیب سی تھیں۔

دوسرے تمام شعراء بعد میں آئے آنیوالوں میں وہ پہلے تھے۔

میرے تشکّر کا یہ عالم تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کن الفاظ میں اس کا اظہار کروں۔ انہوں نے میری قلبی کیفیت بھانپ لی۔ اپنے پاس بٹھایا۔ اور باتیں کرتے رہے۔ دوسرے شعراء بھی آ گئے۔ مشاعرے سے قبل حسب روایت دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ بخاری صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''دو بج چکے ہیں مشاعرہ کب شروع ہوگا۔''

''میں نے بتایا کھانے سے فارغ ہوکر'' پوچھنے لگے ''کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

میں نے کہا ''کھانا لگ چکا ہے'' ہنسے اور میرا جملہ درست کیا۔

''کھانا چُنا جاچکا ہے۔ کیوں بھئی یہ درست نہیں؟ انہوں نے دوسرے شعراء کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

میں شرمندہ تھی۔ جی درست تو یہی ہے مگر روز مرّہ...... ہاں بھئی ٹھیک ہے۔ روز مرّہ نے بڑی غلطیاں معاف کی ہوئی ہیں۔ وہ مسکراتے بھی رہے۔

سب شعراء کھانے کیلئے چلے گئے تو ہم لوگوں نے ان کیلئے آفس میں ہی کھانے کا انتظام کرنا چاہا تو بولے۔ ''میں کھانا نہیں کھاؤں گا کیونکہ میں گوشت سے پرہیز کرتا ہوں اور دعوتوں میں اسکے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔؟''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''آپ اور میں ایک ساتھ کھالیں گے۔ میں بھی گوشت نہیں کھاتی۔''

''پھر میں تمہارا کھانا کھالوں۔؟ تم بھوکی رہ جاؤ گی۔''

''جی وہ ضرورت سے زیادہ ہے اور آج تو اس میں ویسے بھی برکت پیدا ہو جائے گی۔'' اس وقت بھی یہ سعادت حاصل ہونے پر میں خوش تھی اور اب تو ان لمحوں کی قدر و قیمت کوئی مجھ سے پوچھے۔ اور پھر جب وہ پنڈال میں پہنچے تو طالبات نے ان کا اور دوسرے شعراء کا تالیوں سے استقبال کیا۔

بخاری صاحب یہ کہہ کر راستہ طے کر رہے تھے۔

''ہاں بھئی۔کل بھی آیا تھا آج بھی آیا ہوں۔''

شعراء کی تعداد توقع سے کچھ کم تھی اور اس بار میری مشکلات تقریباً ہر تقریب میں یہی تھیں کہ جس کسی کو مدعو کرنا چاہتی پتہ چلتا کہ وہ پنڈی میں ہے یا لاہور میں ہے۔ جو لوگ کراچی میں موجود تھے۔ وہ بجٹ میں مصروف تھے۔

میں نے مشاعرے سے قبل بھری دوپہر میں مشاعرہ منعقد کرانے کی وجہ بتا کر پہلے ان سے معذرت کی۔ پھر کہا کہ اس سال ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ اب ہم جون کے مہینے میں کوئی تقریب منعقد نہیں کیا کریں گے۔ کیونکہ سرکاری افسران بجٹ میں مبتلا ہوتے ہیں اور شعراء لاہور پنڈی اور اسلام آباد کا رخ کرتے ہیں۔لہٰذا آئندہ مشاعرہ جون میں نہیں ہوگا۔

جس پر بخاری صاحب نے آبدیدہ ہوکر کہا۔تم کہتی ہو کہ اب مشاعرہ جون میں نہ ہوگا۔لیکن مجھے کیا۔ میں آئندہ جون میں نہ کراچی میں ہوں گا نہ پنڈی' لاہور یا اسلام آباد میں۔ میں تو ہوں گا ہی نہیں۔''

ان کے اس جملے سے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔ طالبات ایک دم سے خاموش ہوگئیں۔ شعراء نے سر جھکا لیا۔لگتا تھا سینکڑوں کے مجمع میں سانس لینے والا کوئی موجود نہیں۔

میں اپنے جملے پر آپ شرمندہ تھی...... اور وہ اپنی باری آنے پر گلوگیر آواز میں شعر پڑھ رہے تھے۔

اب تو اس شہر میں ایسا ہے کہ دم گھٹتا ہے
کب بہار آئے گی کب چاک گریباں ہوں گے

مشاعرہ اسی سوگوار فضا میں ختم ہوگیا۔ باوجود بخاری صاحب کی بے پناہ بیماری کے یہ ذہن میں خیال نہیں آیا تھا کہ یہ مشاعرہ بخاری صاحب کی زندگی کا آخری مشاعرہ ہوگا۔ یا یہ کہ آج کا مشاعرہ اس قدر تاریخی نوعیت اختیار کرلے گا۔ یا یہ کہ بخاری صاحب کا یہ جملہ آسمان کے فرشتے بھی سن لیں گے۔ اور اجل صرف 22 دن کی مہلت دیکر انہیں ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا کردے گی۔

(روزنامہ جنگ 21 جولائی 1975 کی اشاعت میں شریک ہوا اور
جسے بخاری صاحب کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

یادیں ہی یادیں — سیّد محمد جعفری

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی موجودگی سے بوجھل ماحول میں بھی شگفتگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اداس ویران اور سپاٹ چہروں پر مسکراہٹ کی لکیریں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ جن کے وجود سے دوسروں کی شخصیت میں اعتماد اور روح میں تازگی سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ اپنے اپنے دکھوں' مسائل اور فکروں سے چپ چاپ اپنا دامن بچا کر' چھڑا کر مسکرانے لگ جاتے ہیں جعفری صاحب ایسی ہی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ وہ رنگارنگ طبعیت کے انسان تھے۔ اور اپنے وجود سے ماحول کو مہکایا کرتے۔

ایک بے نام سی اداسی۔ مسائل کا انبار۔ فکروں کا گھیراؤ جو اس دور کے ہر فرد کی زندگی کا لازم ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اپنا عمل دخل رکھتا تھا۔ ان کے ہونٹ بھی کبھی سکڑ جاتے ہوں گے۔ ان کی پیشانی پر بھی کبھی سوچ کی لکیریں پڑ جاتی ہوں گی۔ وہ بھی گردن جھکا کر کبھی سپر ڈال دیتے ہوں گے۔ لیکن محفلوں میں آ کر وہ اداس چہروں اور بے چین ذہنوں کو تھوڑی دیر کیلئے اپنی شگفتہ باتوں کے حصار میں قید کر لیتے تھے۔ کون جانے وہ ان انبار سے خود کتنے گرانبار ہو جاتے ہوں لیکن دوسرے بےفکری سے مسکرانے لگتے۔ اور وہ اعتماد جو وہ کھوئے بیٹھے تھے صرف ان کی موجودگی سے اس کا کوئی سرا ان کے ہاتھوں میں آ جاتا۔ اس دور میں جبکہ ہر فرد دوسرے کیلئے الجھن کا سبب ہے۔ وجہء پریشانی ہے۔ ایسی شخصیتیں جو کچھ مسکراہٹیں بخش سکیں بڑی قیمتی اور بڑی نایاب ہوتی ہیں۔

لیکن کسی چیز کے نایاب اور قیمتی ہونے کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہم سے

چھن جاتی ہے۔ بچھڑ جاتی ہے جب وہ ہمارے پاس نہیں رہتی ہے آج جعفری صاحب ہم سے چھن چکے ہیں بچھڑ چکے ہیں۔ وہ ہمارے پاس نہیں ہیں ہم سے دُور ہیں تب ان کی عنائیتیں، ان کی شفقتیں، ان کی محبّتیں، ان کی شخصیت کا رچاؤ، دھیما پن اور ان کی باتوں کی پھلجھڑیاں ہمیں بے اختیار یاد آ رہی ہیں۔

میری جعفری صاحب سے اتنی قربت تو نہیں رہی کہ میں ان کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں پر روشنی ڈال سکوں۔ حالاتِ زندگی بیان کر سکوں میری قربت اور میرا رشتہ تو ان سے بس صرف اتنا سا تھا کہ میں ایک کالج میں لکچرار تھی اور وہاں منعقد ہونے والے ہر پروگرام کی نگراں۔ انہیں ہر سال کسی نہ کسی حیثیت سے بلاتی ضرور تھی۔ اور دوسرا رشتہ کچھ یوں کہ میری ایک عزیز شاگرد کے وہ خالو تھے اور بعد میں ان کے ہی بیٹے سے اس کی شادی ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے ایسا لگا کہ وہ میرے اور قریب ہوگئے۔ اسی لئے جب میں نے کالج میں کوئی بھی مشاعرہ کرایا۔ یا کوئی بھی تقریب ترتیب دی تو جعفری صاحب کو اس میں ضرور مدعو کیا۔

ایک دور دراز علاقے کے کالج میں ہونے کی وجہ سے لوگوں کو مدعو کرنا میرے لیے انتہائی مشکل ہوا کرتا۔ کچھ وسائل کی تنگی اور کچھ لوگوں کی مدد حاصل نہ ہونے کے سبب اس ضمن میں مجھے جو پاپڑ بیلنے پڑتے مجھے ہی اس کا اندازہ ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند لوگوں نے میری ہمیشہ مدد کی جن میں جعفری صاحب کی مشفق شخصیت پیش پیش رہتی۔ میں ان کا نام سرفہرست لکھتی اور اطلاع دینے میں سب سے آخر میں ان کی باری آتی۔ صرف ایک فون کرتی اور وہ جس خلوص سے محبّت سے گفتگو کرتے۔ ہر تقریب میں میرا حوصلہ بڑھاتے۔ وہ مجھ میں نئی جوت جگا جاتا۔ گفتگو کچھ یوں ہوتی۔

''زحمت دینی ہے جعفری صاحب آپ کو''

''زحمت گوارا'' بولو کب آؤں۔'' میں دن تاریخ موقع بتاتی۔ کہتی کارڈ پہنچا دوں گی۔ فوراً ہی کہتے۔ مجھے کارڈ کی ضرورت نہیں۔ ایک تو یہ کہ تم میری بیٹی ہو۔ دوسرے یہ کہ میری

بیٹی کی استاد ہو۔ تیسرے یہ کہ تم نے مجھے یاد کیا۔ اب بھلا انکار کی گنجائش ہی کہاں۔؟

وہ وقتِ مقرّرہ پر خود ہی پہنچ جاتے۔ ایسا اکثر ہوتا کہ دوسرے لوگ غائب ہوتے۔ اور جعفری صاحب سب سے پہلے آ جاتے۔ اس طرح ان کی قربت میں کچھ لمحے میسر آ جاتے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک تقریب میں انہوں نے ہمارے یہاں شرکت کی تب طالبات کا ایک ہجوم تھا جو ان کے آٹوگراف لینے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اور میرے سخت پہرے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ میں نے طالبات کو ڈانٹ کر کہا۔

''جعفری صاحب کو اتنا پریشان نہ کرو کہ آئندہ آئیں ہی نہیں۔''

وہ اس دروازے تک خود آئے جسے بند کئے میں نے طالبات سے جعفری صاحب کو بچائے رکھا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ ''بچیو اندر آ جاؤ۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''میں بچوں سے کبھی نہیں گھبراتا۔''

لڑکیاں تھیں کہ ٹوٹی پڑ رہی تھیں اور جعفری صاحب مسکرا مسکرا کر بھری گرمی میں سب کو آٹوگراف دے رہے تھے۔

تقریب کچھ یوں تھی کہ چند مشہور اور بڑی ہستیاں جمع تھیں۔ جنہیں ''ایک واقعہ ایک تاثّر'' کے عنوان سے اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنانا تھا۔ جب جعفری صاحب کی باری آئی تو ان کا واقعہ بس یہ تھا۔ 'میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ سب سے دلچسپ واقعہ جس کا نشہ مجھ پر ہمیشہ طاری رہا بس یہ ہے کہ میرے اللہ نے میرے گھر میں ایک بیٹی پیدا کی۔ لوگوں کے طویل قصوں کے برعکس جعفری صاحب کی اتنی مختصر، جامع اور حسین تقریر نے سب کو بے حد متاثر کیا اور طالبات نے ٹوٹ کر تالیاں بجائیں۔

بعد میں جعفری صاحب سے میری بات ہوئی انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے گفتگو کی۔ یہ سچ ہے بیٹی کا باپ بننے میں جو مزا آیا پانچ بیٹوں کے باپ میں بھی نہ آ سکا۔ کاش مجھے خدا دو چار بیٹیاں اور دیتا۔

کالج کی مختلف تقاریب میں جعفری صاحب برابر کالج آیا کرتے اور چونکہ وہ ہمیشہ وقتِ مقرّرہ پر آ جاتے اور تقریب کے بعد بھی ٹھہرے رہتے میں جعفری صاحب کی قربت کا لطف اٹھانے ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ دن وہ لمحے بڑے قیمتی لگتے۔ میں اکثر ناز کرتی کہ کالج کی لکچراری نے مجھے بڑے سنہرے لوگوں سے قریب کر دیا۔ ورنہ میری حیثیت ہی کیا تھی۔

ایک ایسا ہی دن تھا میں نے ان سے فرمائش کی۔ جعفری صاحب آپ کی موجودگی اہم بات تو ہے ہی لیکن ہم آپ کے بارے میں بہت کچھ جاننا بھی چاہتے ہیں۔

جعفری صاحب مسکرائے۔ بڑی شفقت سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ کچھ یوں گویا ہوئے میں ریاست بھرت پور کی ایک بستی پہر سہر میں 27 دسمبر 1907ء میں پیدا ہوا۔ پہر سہر کو سیّدوں کے ایک رسالے نے محمود غزنوی کی ایماء پر ایک پہر میں فتح کیا تھا یہاں ہی میرے مورثِ اعلیٰ سیّد جلال الدّین کی قبر ہے۔

والد صاحب کا نام سیّد محمد علی جعفری تھا۔ وہ سو برس کے ہو چکے ہیں اور حیات ہیں۔ یہاں میں بتاتی چلوں کہ یہ گفتگو میری 1973 سے پہلے کی ہے اور 1973 میں ان کے والد نے 107 سال کی عمر میں وفات پائی۔

جعفری صاحب نے بتایا۔ ان کے والد اسلامیہ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل تھے۔ اور انہیں شعر و شاعری سے اس درجے دلچسپی تھی کہ غالبؔ، فانیؔ، نظیریؔ اور حافظؔ کے بے شمار اشعار انہیں ازبر تھے۔ لیکن وہ خود شعر نہیں کہتے۔

البتہ ان کے دادا فارسی کے شاعر تھے اور بیدادؔ تخلّص کرتے تھے۔ پر دادا بھی شاعر تھے اور ہوشیارؔ تخلّص کرتے تھے۔ دراصل پر دادا ہی سے مزاحیہ شاعری جعفری صاحب نے ورثے میں پائی۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے شعر کہنا کس عمر سے شروع کیا؟ جس پر انہوں نے بتایا کہ ظریفؔ لکھنوی سے ایک بار ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ بیٹے آپ

شعر کہتے ہیں۔ اس وقت جعفری صاحب کی عمر صرف 9 برس کی تھی۔ جعفری صاحب نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں کہہ سکتا ہوں'' جس پر ظریفؔ لکھنوی نے انہیں ایک مصرعہ دیا۔

مصرعہ تھا: گرمی ہے اب تلک مرے خاکِ مزار میں

جعفری صاحب نے اس پر مصرعہ لگایا۔

اس سنگ دل نے پھونک دیا اک شرار میں
گرمی ہے اب تلک مرے خاکِ مزار میں

جس پر صفیؔ لکھنوی اور ظریفؔ لکھنوی نے داد دی اور کہا ہاں تم شعر کہہ سکتے ہو۔ اور یوں شعر گوئی کی ابتداء ہوگئی۔

شاید بہت کم لوگوں کو معلوم کہ جعفری صاحب نے کیمسٹری میں آنرز کیا۔ وہ فارسیؔ تاریخ اور انگریزی کے ایم اے تھے۔ ان کا خط انتہائی خوبصورت تھا۔ اس لئے ان کے والد نے انہیں میو اسکول آف آرٹس لاہور میں داخل کر دیا جہاں عبدالرحمٰن چغتائی آپ کے استاد تھے۔ جعفری صاحب کا رجحان مجسمہ سازی کی طرف ہونے لگا تو ان کے والد نے انہیں اس سے باز رکھنے کیلئے اسکول سے اٹھالیا۔ جس کے بعد وہ پینٹنگ کی جانب مائل ہوگئے۔ اور بڑی خوبصورت تصویریں بناتے۔

وہ صرف مزاحیہ شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں کارٹون بنانے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ اس قدر مختلف صفات رکھنے کے باوجود جعفری صاحب کی طبعیت میں انتہائی سادگی اور منکسر مزاجی تھی۔ وہ گھریلو زندگی میں انتہائی مشفق باپ اور محبت کرنے والے شوہر تھے۔ صرف ایک بیٹی تھی جسے وہ اپنے پانچوں بیٹوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ اور ہمیشہ دہرایا کرتے۔ بیٹی کا باپ بننے میں جو مزا ہے وہ بیٹے کے باپ بننے میں نہیں۔

بچوں سے محبّت اور شفقت میں انہوں نے کبھی اپنے اور غیر کا فرق نہیں رکھا۔ خاندان بھر کے بچے ان کے اردگرد رہتے اور جعفری صاحب سے بہت کچھ سیکھتے۔ جو بچے پڑھنے

سے جی چراتے وہ خاص طور پر جعفری صاحب کے گھر بھیج دیئے جاتے وہاں وہ تربیت بھی پاتے اور پڑھنے بھی لگتے جعفری صاحب کو درس و تدریس کی صفت ورثہ میں اپنے والد سے ملی تھی۔ مشکل سے مشکل نکات کو وہ انتہائی شگفتہ اور سیدھے سادے انداز میں سمجھا دیتے وہ بات میں مزاح پیدا کئے بغیر بات ہی نہ کرتے۔

ایک بار ان کی سالی کی طبیعت خراب ہوئی۔ کسی حکیم سے ان کا علاج ہوا دوا نے فائدہ نہ کیا۔ جب دوسری خوراک لینے وہ ان ہی حکیم کے پاس پہنچے تو کہا حکیم صاحب میری سالی خودکشی کرنا چاہتی ہیں لہٰذا آپ سے دوا لینے آیا ہوں۔

طبیعت میں مزاح کے ساتھ ساتھ بے انتہا نرمی اور خوفِ خدا تھا گھر کے ملازم کی طبیعت خراب ہو جانے پر خود خبر گیری کرتے۔ آخر عمر میں حج کرنا چاہتے تھے لیکن خرابیٔ صحت کی بنیاد پر نہ کر سکے۔

مجھے جعفری صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو اور کئی اور واقعات یاد آ رہے ہیں۔

میں نے اپنے کالج کے مشاعرے میں انہیں بلایا۔ مشاعرے کا بڑا اہتمام تھا۔ شہر کے تقریباً سب ہی بڑے اور نامی گرامی شعرا جمع تھے۔ مشاعرے سے قبل اور کھانے کے دوران جعفری صاحب اپنی پلیٹ لئے ایک شاعر کی طرف آ نکلے۔ اور پوچھنے لگے۔ ''بھئی تُو آج کیا پڑھے گا؟''

شاعر موصوف عمر میں جعفری صاحب سے چھوٹے تھے۔ لیکن نہ جانے اس جملے میں ایسی کون سی بات تھی اور مجھے حیرت ہے پڑھے لکھے اور اچھے خاصے ذوق کے مالک وہ شاعر صاحب جعفری صاحب کے لہجے کی شیرینی اور اپنائیت کو کیوں نہ محسوس کر سکے اور بپھر گئے۔

مجھے ''تُو'' کیوں کہا؟ آپ مجھ سے جلتے ہیں۔ ان حضرت کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ جعفری صاحب اسی قدر سہمے جا رہے تھے۔ میں قریب ہی تھی اور اپنے دو مہمانوں کو آپس میں الجھتے دیکھ کر ڈر گئی۔ ماحول میں بدمزگی پھیلتی جا رہی تھی۔ جعفری صاحب تو خاموش ہی

رہے جیسے کہ ایک جملہ ہی ادا کر کے بھر پائے مگر وہ صاحب برابر بولے جا رہے تھے۔ دوسرے شعراء نے انہیں ایک طرف لے جا کر سمجھایا۔ جعفری صاحب نہ آپ سے جلتے ہیں نہ انہوں نے یہ سوال بُری نیّت سے کیا تھا۔ وہ بزرگ ہیں اور آپ کو انہیں ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ لیکن وہ صاحب خطائے بزرگاں مسلسل دوسروں کو دکھانے پر بضد تھے۔

چند لمحے پیشتر جس فضا میں شگفتگی تھی وہ بدمزہ ہو چکی تھی۔ اور ظاہر ہے اس کا اثر مجھ پر کچھ زیادہ ہی تھا۔ جب تمام لوگ مشاعرے کیلئے اسٹیج کی طرف جانے لگے تو میں جعفری صاحب کے پاس چلی آئی۔

میں نے ان سے اس تلخ واقعے کی معافی چاہی وہ ایک دم بشّاش ہو گئے۔ بیٹی بھلا اس میں تیرا کیا قصور؟

اس ''تیرا'' سننے میں جو مزا مجھے آیا وہ میں نہیں بھول سکتی۔ اپنائیت اور خلوص کا یہ لفظ تو میرے لئے سرمایۂ حیات بن گیا۔

زندگی میں بزرگوں کی موجودگی زندگی کا مزا دوبالا کر دیتی ہے۔ یہ لوگ جب چلے جاتے ہیں تب زندگی کے سنسان اور ویران ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مگر میں حیرت زدہ تھی کہ زندگی کا یہ حُسن انہیں کیوں نہیں مرغوب تھا۔ بہر حال میں بار بار معذرت کرتی رہی اور وہ محبت بھرے الفاظ میں میری تسلی کرتے رہے۔ لیکن اس واقعے نے مجھے اتنا بوکھلا دیا تھا کہ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض میں نے اس قدر بددلی سے انجام دیئے کہ لوگ حیران تھے کہ مشاعرہ حسبِ روایت بے حد کامیاب ہے مگر میں اسقدر وحشت زدہ کیوں ہوں؟ نتیجہ یہ کہ صدر مشاعرہ رئیس امروہوی کی جگہ میں نے سیّد محمد جعفری کو صدر مشاعرہ کہہ کر پکار لیا۔ ایک شاعر نے اسی وقت جملہ کسا۔ نوشابہ کے اعلان پر اب ان دونوں شاعروں کے درمیان ''بیت بازی'' ہو گی۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ ماحول کی کدورت مجھ پر بہر حال طاری تھی۔ میں جعفری صاحب کو رخصت کرنے کالج گیٹ سے باہر تک گئی اور پھر معذرت کی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ جعفری

صاحب کے ذہن میں اب بھی اس ''بیت بازی'' کی تلخ یاد موجود ہوگی لیکن ان کی بڑائی۔ انہوں نے مجھے کامیاب مشاعرے کی مبارکباد دی اور میرا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ آج بھی اپنی شخصیت میں پیدا ہونے والا وہ اعتماد مجھے تازہ دم کر دیتا ہے۔

علاّمہ اقبال گرلز کالج میں مشاعرے تو پھر بھی ہوتے رہیں گے کہ مشاعرے کی روایت اس کالج کو بہت آگے تک لے گئی ہے لیکن میری فہرست میں جعفری صاحب کا نام نہ ہوگا۔ اور مجھے ایسا لگتا ہے۔ کہ ہر اس موقعہ پر ان کی شخصیت چپکے چپکے کہے گی۔ ''دیکھو ہم نہ ہوں گے تو رنگِ محفل پھیکا پڑ جائے گا۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمارے فسانے ہوں گے۔ ہم جو مسکراہٹیں بانٹتے پھرتے تھے ہمارے نہ ہونے سے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔ لو کر لو ہماری قدر ہاں آج ہماری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے۔ اب کون ہے جو کہے گا ''تُو کیوں روتی ہے''؟ یہ ''تُو'' تو مجھے زندگی بھر محبّتوں کا استعارہ بن کر رلاتا رہے گا۔ کسے نہیں قدر ہوگی بھلا سیّد محمد جعفری کی۔

(11 جنوری 1977ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور کالج کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

وقت کا دل ـــــ مولوی ابوالحسن

گرومندر کی ڈسپنسری پر نظر پڑتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج بھی سڑک کی جانب کھلنے والے کمرے کے اس ہلتے پردے کے پیچھے ایک بوڑھا جسم پورے عہد کو اپنی ذات میں سمیٹے خالقِ حقیقی سے لو لگائے لیٹا ہے آہستہ آہستہ سانس لے رہا ہے۔ اس کے گرد چند افراد ہیں خاموش اداس۔ میں کبھی اس ڈسپنسری کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکی۔ ایک لمحے کیلئے بھی یہاں ٹھہر نہیں سکی۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے جو میری زندگی کا بڑا سانحہ ہے۔ مجھے میرے دادا میاں یاد آ جاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی آخری سانسیں یہیں پر لیں۔

میرے دادا میاں اپنے عہد کے بڑے با اثر شخص تھے۔ ہندوستان میں انسپکٹر آف اسکول اور کالجز تھے۔ کشمیر اسٹیٹ کے وزیر تعلیم تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں پہلے ریاضی اور سائنس کے پروفیسر تھے۔ نواب محسن الملک کے معتمد تھے۔ جن کے ساتھیوں میں نواب مزمل اللہ، نواب اسحٰق خان، نواب وقار الملک، سید سلیمان اشرف جیسے لوگوں کا نام آتا ہے۔ جو ڈاکٹر ضیاء الدین کے دوست تھے۔ جس نے ٹی ماریسن، مولوی سمیع اللہ، مولوی مشتاق حسین پر اپنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔ جن کی زندگی بے شمار واقعات کا محور رہی تھی۔ جو انگریزوں کے دور میں گنتی کے ان مسلمانوں میں تھے جن کی دھاک ہر انگریز افسر کے دل پر جمی ہوئی تھی۔ وہی شخص اپنے عہد کے تمام انسانوں سے بچھڑ کر اس ڈسپنسری میں اپنے خاندان کے تمام افراد کے درمیان بے حس و حرکت پڑا تھا۔ زندگی کی تمام عظمتیں اس کے قدموں تلے

تھیں اور وہ آسمان پر اپنی نئی دنیا کے خاکے بنا رہا تھا۔

تاریخ میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بڑا بنایا جاتا ہے اور بلا شُبہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی کوششوں سے اپنا نام پیدا کرتی ہیں جبکہ قدرت بعض شخصیتوں کو خود بنا سنوار کر دنیا میں بھیجتی ہے۔

مولوی ابوالحسن کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان ہی حالات سے دو چار ہوئے وہ ایک بڑی شخصیت بنا کر اس دنیا میں بھیجے گئے اور اس کے بعد انہوں نے بھی اپنے وجود سے غفلت نہیں برتی بلکہ اپنی زندگی کو برابر سنوارتے رہے۔نکھارتے رہے۔ اور اپنی زندگی کے درمیانی دور میں ان کا وجود ہر طرح مہک رہا تھا۔ وہ ایک ایسے چھتنار درخت بن گئے تھے جس کا سایہ بڑا گہرا اور بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جو سرِ راہ جھومتا ہے اور ہر مسافر اس کی گھنی چھاؤں تلے سانس لیتا ہے۔ ان کے سانس کی ٹھنڈک اور پُر سکون چھاؤں سے پوری فضا مہک رہی تھی۔ وہ اپنی قوتوں سے ہر ایک میں توانائی بھر دینا چاہتے تھے۔ وہ اس ایمان کے ساتھ جیے کہ علم و اخلاق کی دولت لٹانے سے اور بڑھتی ہے۔ اخلاق و مروّت کی تکرار سے شخصیت کا رنگ و روپ اور نکھرتا ہے۔ وہ ساری زندگی علم و اخلاق کے خزانے لٹاتے رہے اور ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ان کی شخصیت میں نکھار آتا رہا۔ ان کی زندگی کے اصول زندگی کے آخری لمحات میں بھی نہ بدل سکے۔ وہی سکون وہی اطمینان ان کے چہرے پر موت سے چند لمحے پہلے تک برستا رہا وہ خدا سے براہِ راست لو لگائے بیٹھے تھے۔ موت کا خوف ان کے چہرے پر دور دور تک نہ تھا۔ اپنی ضعیفی، اپنی بیماری اور اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ان کی باتوں میں وہی چاشنی تھی ان کی آواز میں وہی رعب تھا۔ ان کے قوتِ حافظہ کا وہی عالم تھا۔ اپنی علمیت کا وہی پرتو تھا اور اپنی دینداری کی وہی دُھن تھی جس پر وہ ساری زندگی کار بند رہے۔ باتوں میں مٹھاس اور دل آویز مسکراہٹ سے ہر ایک کا استقبال کیا۔ اپنی تکلیفوں کا جواں مردی سے مقابلہ کیا۔ اور حال پوچھنے والوں سے یہی کہتے رہے "اچھا ہوں"

حافظے سے اپنی زندگی کے اہم واقعات نہ بھلا سکے۔ اپنے دوستوں کو بسترِ مرگ پر بھی یاد کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی تدفین کے واقعے کو دہراتے رہے۔ اپنے تمام دوستوں کے نام لیے۔ گویا دوستی کی عظمت اور روایت انہوں نے آخری دم تک روا رکھی۔ رشتہ داروں کے ہجوم آتے رہے ہر ایک سے یوں مخاطب ہوتے جیسے اس وقت اسی کا انہیں انتظار تھا۔ دعائیں اور نیک تمنائیں بے دریغ لٹاتے رہے۔ امتحان کا زمانہ تھا خاندان کے ہر طالبعلم نے ان سے اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں لیں اور سب کامیاب ہو گئے۔

نوّے سال کے بوڑھے شخص نے ہر عمر کے انسانوں سے ویسا ہی رشتہ استوار کیا تھا جو دو ہم عمروں کا ہوسکتا ہے۔ بچّے انہیں اپنا عزیز ترین دوست جانتے اور ان کے اردگرد یوں بکھر جاتے جیسے کہ وہ کوئی مٹھائی کا ڈبہ ہوں۔

نوجوان ان کے ساتھ مل کر ہنسی مذاق اور زندگی سے لطف اندوز ہوتے۔ زندگی کے قرینے اور ادب آداب سیکھتے۔ ادھیڑ دنیا سے ہٹ کر ان مسائل پر گفتگو کرتے جوان کی عمر کا تقاضا بن چکے ہوتے۔ اور بوڑھے تو ان کے ساتھی ہوتے ہی' طالبعلم ان سے بہت کچھ سیکھ جاتے اور اَن پڑھ بہت کچھ سیکھنے کا شوق لیکر جدا ہوتے۔ اور جب ان کی عمر کا وہ ساتھی ان کے قریب ہوتا جوان کا دوست ہوتا تب تو ان کے چہرے کی دمک دیکھنے سے تعلق رکھتی بابائے اردو سے وہ جی بھر کے باتیں کرتے۔ ورلڈ بینک کے شعیب صاحب جو بعد میں پاکستان کے وزیرِ خزانہ ہوئے ان سے مل کر وہ اپنی استادی کے زمانے کو یاد کرتے۔ کشمیر روڈ پر عادل ہاؤس جا کر وہ اختر عادل سے یوں بغلگیر ہوتے کہ انہیں اپنی جوانی یاد آجاتی منظر عالم جنہیں ہم چچا کہتے ملکر بہت خوش ہوتے اور پاکستان کی سیاست پر گفتگو کرتے جوان کا شعبہ بھی نہیں تھا۔ امّاں اور ہماری تینوں پھوپھیوں کے درمیان تو وہ سب کے ابا بن کر نہال ہو جاتے۔ پوتے' پوتیاں اورنواسے نواسیاں ان کی جان تھے۔

ان کی زندگی میں کتنی ہمہ گیریت تھی۔ ان کی ذات کس قدر جامع تھی۔ خوش قسمتی ان کا مقدر تھی۔ کامیابیوں اور کامرانیوں نے ان کے قدم چومے تھے انہوں نے اپنی زندگی

کی تمام مہم کو بخوبی سر کرلیا تھا۔ وہ سارے خاندان کا محور تھے سب ان کے گرد گھومتے رہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنایا بلکہ نہ جانے کتنے بے سہارا لوگوں کو جینے کا قرینہ سکھایا۔ انہیں پڑھایا لکھایا اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ زندگی گزارنے کے لیے کسی اصول کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ساری زندگی اپنے اصول نبھاتے رہے۔ وفاداری' سچائی اور ذہانت ان کی کامیاب زندگی کے تین ستون تھے عمر کے اس دور میں آ کر قصے کہانیاں سنانا ہی ان کا مشغلہ' ضعیفی اور پھر بینائی کی کمزوری انہیں کوئی عملی کام نہ کرنے پر مجبور کر چکے تھے۔ مگر اس دور میں بھی انہوں نے کسی سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ خود ہی اٹھ کر لے لیتے۔ وضو کیلئے بھی پانی خود حاصل کرتے روزہ نماز بھی اسی باقاعدگی سے جاری تھا۔ چلتے میں کبھی لڑکھڑا جائیں اور کوئی انہیں سہارا دیدے یہ کبھی نہیں ہوسکتا تھا۔ آخری عمر تک جمعے کی نماز کیلئے مسجد جانے پر اصرار کرتے۔ کوئی بچہّ ان کی رہبری کرتا راستہ اس قدر پہچان گئے تھے کہ اگر کوئی کسی دوسرے راستے سے لے جاتا تو جان لیتے کہ یہ راستہ دوسرا ہے اور جھنجھلا جاتے۔ تم لوگ راستہ کیوں بدلتے ہو؟'' پہلے بتاؤ اُس راستے میں کیا خرابی ہے۔ یوں چپکے چپکے مستقل مزاجی کی تربیت دیا کرتے۔ اپنے کمرے میں مخصوص کرسی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے۔ کوئی آہستہ سے بھی کمرے میں داخل ہوتو جان لیتے۔ اسے اپنے پاس بٹھا لیتے اخبار سنتے یا خود کوئی قصہ چھیڑ دیتے۔ قصہ بھی کون سا اپنی زندگی کا۔ مجھے ان کی زندگی کے کئی قصوں نے بہت متاثر کیا۔ قصہ سے متعلق افراد کے نام تو بھول گئی لیکن خاکہ اب بھی موجود ہے۔ ایک بار انہوں نے بتایا۔ ہندوستان میں پہلی بار پنکھا آیا۔ ٹیبل فین جو بیٹری سے چلتا تھا۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی سے متعلق کوئی ذمہ دار انگریز افسر تھے انہوں ہی نے منگایا تھا۔ پنکھا چلانے کی ترکیب ساتھ نہ تھی۔ انہوں نے ہر طرح کوشش کرلی کہ چل جائے۔ لیکن نہ چلا۔ طے یہ پایا کہ یونیورسٹی کے سائنس پروفیسر کو بلایا جائے۔ لہٰذا وہ طلب کئے گئے اب وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے۔ ''بھلا کاہے کو اس سائنس پروفیسر نے پنکھا دیکھا ہو۔'' اس زمانے میں سائنس' مقناطیس' بجلی اور اسی قسم

کے دو چار عنوانات کے تحت پڑھائی جاتی تھی۔ جس کی پتلی پتلی کتابیں انگلستان سے چھپ کر آتی تھیں جسے صبح وہ خود گھر پر مطالعہ کرتے اور پھر کلاس میں لڑکوں کو پڑھایا کرتے۔ یہ وقت ان پر ایسا آپڑا تھا کہ عزّت بحال کرنی مشکل تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں سائنس پروفیسر کی اہمیّت کا کچھ پوچھنا نہ تھا۔ مختصر یہ کہ انہوں نے ڈھائی گھنٹے کی الٹ پھیر کے بعد جب ہرے اور لال رنگ کے تاروں کی اصلیّت جان لی تو مثبت منفی تار جوڑنے سے پنکھا چل پڑا۔ اور پھر جو ان کی تعریف ہوئی وہ کم نہ تھی۔ یہ واقعہ آج کے لحاظ سے بچوں کا کھیل ہے اور کوئی اہمیّت نہیں رکھتا کیونکہ اب تو چھٹی جماعت کا طالبعلم بھی یہ اصول جانتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب اکثر نے بجلی سے چلنے والی کوئی چیز دیکھی ہی نہیں تھی۔ اور پڑھانے والے نے بھی خود کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ اس طرح کے کئی واقعات ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران انگریز کا یہ سوال کہ ''مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کا اثر مسلم یونیورسٹی پر کس قدر ہے؟

جواب اگر اثبات میں دیتے ہیں کہ اثر نہیں ہے تو غلط ہے۔ جسے وہ انگریز خود بھی جانتا ہے۔ پانچ منٹ کا وقت ہے اور اس میں انہیں جواب دینا ہے۔ انہوں نے انگریز افسر سے کہا جناب سوال آپ کا چھوٹا ہے لیکن جواب کیلئے پورا دن چاہیے اور آپ کے دفتر کی ہدایت ہے کہ آپ کے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ انگریز ان کی جرأت سے متاثر ہوا اور کہا اپنا وقت لو اور مجھے پورا جواب دو۔ انہوں نے اس موقع پر دو گھنٹے تک گفتگو کی اور جب اٹھے تو وہ انگریز افسر انہیں خود دروازے تک چھوڑنے آیا اور مسلم یونیورسٹی کی ملازمت کی نوید سنا دی۔

مولانا سلیمان اشرف کو ان کی مرضی کے خلاف میلاد شریف پڑھنے کیلئے تیار کرنا ان ہی کا کام تھا۔ یہ سب ان کی شخصیت کا سحر تھا۔ وہ خود کہتے نیک نامی' بڑائی اور اثر پیدا کرنے کے لیے دیانت اور سچائی کو اپنانا ضروری ہے۔ اسی اصول کو اپنا کر انہوں نے اپنی شخصیت میں وہ رچاؤ پیدا کرلیا تھا کہ جس سے ہر فرد مرعوب ہو جاتا۔ ان کی شخصیت تو بے

شمار واقعات کا مرکّب ہے۔ اور ان واقعات سے اس دور کی سیاسی، انفرادی، سماجی اور معاشی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔

پرنسپل میور، الہ آباد کالج ان کی انگریزی اور ریاضی کی قابلیتوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ابوالحسن محنتی اور شریف نوجوان ہیں۔ انہیں ان کی انتھک محنت اور قابلیت پر گورنمنٹ سے وظیفہ ملا ہے اور ریاضی میں ساری یونیورسٹی میں اوّل آنے پر انہیں اقبال گولڈ میڈل دیا گیا ہے۔''

زمانہ طالبعلمی کے بعد وہ علیگڑھ کالج سے منسلک ہوگئے۔ جب ڈاکٹر ضیاء الدین لندن گئے تو ان کی جگہ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے انچارج مقرر ہوئے۔ ماریسن نے کالج کی سالانہ رپورٹ میں ان کی خوش اسلوبی سے متاثر ہو کر کہا۔

''میں اس موقع پر ابوالحسن صاحب کی خدمات کا عوامی طور پر اعتراف کرتا ہوں۔''

ماریسن جو کسی کی تعریف کرنے میں بڑا سخت تھا۔ اس نے ان کے متعلق کہا۔

''اگر ہمارے (ایم اے او کالج) کے پاس اتنا سرمایہ ہوتا تو ہم انہیں کیمبرج ولایت پڑھنے کیلئے بھیجتے۔''

اس نے ان کی کھیلوں کی صلاحیّت پر بھی لکھا ہے۔

''ابوالحسن گھوڑے کی سواری ماہرانہ اور شاندار انداز پر کرتے ہیں وہ ٹینس اور کرکٹ کے بہترین کھلاڑی ہیں۔''

ماریسن نے انہیں رنگون کالج میں تقرّری کیلئے اس خط کے ساتھ بھیجا۔

''ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ ہم ان کو ان کی قابلیّت کے لحاظ سے تنخواہ دے سکیں۔ میں انہیں قلق کے ساتھ چھوڑونگا لیکن انہیں اتنی کم تنخواہ پر رکھنا ناانصافی ہے۔''

نواب اسحٰق خان آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج کے ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کو آپ نے یہ تجویز بھیجی۔

''میں ابوالحسن صاحب کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میرے دل میں ان کی بڑی عزّت ہے۔ یہ چاق و چوبند دفتری کاموں میں طاق ہیں۔ تعلیمی قابلیت اور انتظامی صلاحیت معیاری ہے۔''

نواب مزمل اللہ نے لکھا:

''ابوالحسن صاحب کا تقرر اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدے پر یکم جون 1904ء سے ہوا ہے۔ اس وقت سے جس خوبی' خوش اسلوبی' محنت' شرافت' دیانت' امانت' اطاعت' عزّت اور قومی محبّت کے ساتھ انہوں نے یہ کام انجام دیا ہے اس کا حال ٹرسٹی صاحبان اور خود نواب محسن الملک کو بھی رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اس عہدے کے واسطے ہر حالت کے اعتبار سے ان سے زیادہ موزوں شخص میری رائے میں تو ملنا اگر محال نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ گویا خداوند تعالیٰ نے انہیں اسی خاص کام کے واسطے پیدا کیا ہے۔''

نواب وقار الملک نے بھی ان کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

''میں نے مولوی ابوالحسن کو بلحاظ ان کی بہت سی اعلیٰ قابلیتوں کے اور بلحاظ ان کے اعلیٰ اخلاق اور دینداری کے کالج کے کاموں کے علاوہ اور دوسری بہت سی مختلف الاقسام خدمات کے واسطے (جن میں مجھ کو ان سے بہت مدد ملی) ہر طرح موزوں پایا۔ میری رائے مولوی صاحب کی نسبت بہت عمدہ قائم ہوگئی ہے۔''

مولوی مزمل اللہ نے لکھا:

''جو پوزیشن کالج میں بہ لحاظ اہمیت اس عہدے کے اور بہ لحاظ ان کے ذاتی شریفانہ برتاؤ اور انہاک کا قومی محبّت کے ہے اس کا قائم رکھنا اسکو بڑھانا ہمارا فرض ہے۔''

اور اس عہدے کا نہایت کارآمد ہونا اور سخت ضروری ہونا واقعہ نفس الامری ہے جس کو اس خاص شخص کے تقرر نے اور بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

خان بہادر نواب مزمل اللہ آنریری سیکریٹری ایم اے او کالج نے کہا۔

''دشوار گزار امر ہونے کے باوجود مولوی ابوالحسن نے یکساں اعتماد و اعتراف نواب

محسن الملک اور نواب وقار الملک بہادر اور اس خاکسار نیز موجودہ آنریری سیکریٹری بہادر کا حاصل کیا ہے۔ ان کا تعلق کالج سے ایک ملازم اور اہلکار کا سا ہرگز نہیں بلکہ وہ اس کام کو ذاتی کام اور قومی کام کی طرح پورے شغف، محنت اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ان کی لیاقت، تجربہ اور طریقہ انجامِ خدمت ہر ایک تعریف سے بالاتر ہے۔ ان کا درجہ قوم میں اہم ہے۔''

وہ زندگی بھر ڈاکٹر ضیاء الدین کے دوست رہے۔ اکثر انہیں یاد کرتے۔ تنہائی میں بیٹھے ان سے باتیں کرتے اور ہم بچوں کو بٹھا کر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطے میں دفن کرانے کیلئے بڑی محنت کی اور تمام تر مخالفتوں کا خوش اسلوبی سے مقابلہ کیا۔

مرنے سے قبل وہ اپنی تمام اہم دستاویزات جو بچا کر وہ ہندوستان سے لا سکے تھے مجھے سونپ دی۔ میرے لئے یہ بڑے فخر اور اعزاز کی بات تھی کہ بڑے بڑوں کی موجودگی میں انہوں نے مجھے اس لائق سمجھا۔ میں جو ابھی صرف طالبعلم تھی۔

یہ کاغذات میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ صفحات زمانے کی گردش سے پیلے پڑ رہے ہیں۔ ان پر صدی گزر چکی ہے۔ دوسری صدی شروع ہوئے بھی دوسرا عشرہ چل رہا ہے۔ میں انہیں اپنی زندگی تک تو سنبھال کر رکھ پاؤں گی جن کے کونے بھی جھڑ رہے ہیں اور جن کی سیاہی بھی پھیکی پڑ رہی ہے۔ مگر حروف اب بھی چمک رہے ہیں اور اس کی چمک اور روشنی سے ہم اپنی بقیہ زندگی کو اجالا بخشنے کی سعی کرتے رہیں گے۔

(24 جون 1968 روزنامہ جنگ کراچی میں شائع ہوا۔ اور برسی پر پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

بڑے باپ کے بڑے بیٹے —— ڈاکٹر احسان رشید

رشید احمد صدیقی نے گنج ہائے گرانمایہ میں میرے والد پر مضمون لکھتے ہوئے پہلا جملہ یوں لکھا ہے۔ ''بھونپو بے وقت بجا دل دھک سے ہوگیا حسن عبداللہ رحلت کر گئے۔''

علی گڑھ یونیورسٹی کی روایت کے مطابق یونیورسٹی سے متعلق شخصیت کا جب انتقال ہوتا تو اس کے اعلان کا ذریعہ سائرن ہوتا۔ مقامی زبان میں بھونپو کہلاتا یوں تمام متعلقہ لوگ چوکنا ہو جاتے کہ کسی کا انتقال ہوا ہے؟

ہمارے یہاں ایسی کوئی روایت نہیں۔ ہمارے پاس تو اطلاع کے دو ذریعے ہیں ایک ٹیلیفون اور دوسرا اخبار یا ٹی وی۔ ڈاکٹر احسان رشید کے انتقال کی خبر مجھے فون اور اخبار دونوں سے ملی میرا دل دھک سے ہوگیا۔

رشید احمد صدیقی میرے والد کے استاد تھے۔ اور احسان رشید میرے استاد تھے۔ یوں یہ رشتہ تاریخ کے انوکھے دھارے پر استوار ہوا تھا۔

میں شعبۂ معاشیات جامعہ کراچی میں پڑھتی تھی کہ ایک دن مجھے ان کی آمد کی اطلاع ملی۔ رشید احمد صدیقی سے اپنی خاندانی وابستگی اور والد پر لکھے گئے مضمون کے باعث وہ ہمیں بڑے عزیز تھے۔ ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مسلم تھی۔

پہلے دن جب وہ میرے سامنے کھڑے تھے میں ان کے سحر میں گم ہوگئی خوبصورت شخصیت، خوش لباس، دھیما لہجہ، سوچتی آنکھیں، بولتے ہونٹ اور باوقار چال خاندانی پس منظر کی چلتی پھرتی تصویر وہ اپنے خاندان کے طور طریقوں کے باعث ایک کھلا اشتہار

تھے۔ شخصیت بولتی کہ وہ کس کے بیٹے ہیں۔ ادب واحترام تو شاگرد اپنے استاد کا کرتے ہی ہیں مگر ڈاکٹر احسان رشید سے میری عقیدت عروج پر پہنچ گئی۔

ان کے مضمون پر میں خصوصی محنت کرتی۔ ٹیوٹوریئل گروپ میں ان سے قریب ہو کر میں یوں محسوس کرتی کہ جیسے رشید صاحب کے سامنے میرے والد بیٹھے ہوں۔ مگر تعارف ابتک نہ ہوا تھا۔ میں انہیں جانتی تھی اور وہ میری ولدیت سے ناواقف تھے۔ دن گزر گئے اور ہم نے ایم اے کا امتحان بھی دیدیا۔ اسٹاف روم میں وہی پرانی روایت لئے پہنچے۔ میرے ہاتھ میں آٹوگراف بک تھی۔

انہوں نے لکھا۔ اپنی جنّت خود بنایئے۔ دوسروں کی بنائی ہوئی جنّت خود ان کے لیے چھوڑ دیجیے۔

آٹوگراف لینے کے بعد بھی میں ان کے سامنے کھڑی رہی۔ آج میں اپنا تعارف ضرور کراؤنگی۔ میرا دل مچل گیا۔ پہلے تو ان پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی چہرے کی سنجیدگی میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں عقیدت سے تحلیل ہو جاؤں گی۔

انہوں نے محبت سے کہا۔ تم نے آج تک یہ کیوں نہ بتایا؟ تمہیں معلوم نہیں ہمارے تمہارے والد کے درمیان محبت کا کتنا گہرا رشتہ تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد پر میرے والد نے جو مضمون لکھا ہے وہ دل سے لکھا ہے۔ بہت محبت سے لکھا ہے۔ اور انہوں نے عمر بھر ان کی جدائی کی اذیت برداشت کی ہے۔

وہ بول رہے تھے میں سن رہی تھی کہ جب بھی کوئی میرے والد کے حوالے سے بات کرتا ہے تو میں خاموش صرف سنتی ہوں کہ مجھے وہ لمحہ بہت اچھا لگتا ہے۔ جب وہ خاموش ہوئے تب میں نے اپنی تمام تر ہمّت جمع کی۔

''یہ سب بات مجھے معلوم ہے۔ لیکن آپ میرے استاد تھے۔ اور سال بھر کے تمام ٹیسٹ اور ٹیوٹوریئل کے نمبر میں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر لینا چاہتی تھی اور کبھی ذرا بھی یہ

احساس پیدا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ کہیں بھی کبھی بھی اس میں آپ کی محبت اور ہمدردی کا عنصر بھی داخل ہوگیا ہے۔"

میری اس چھوٹی سی تقریر میں خاصا جوش اور جذباتیت تھی۔ میں طالبعلمانہ بہادری بھی دکھانا چاہتی تھی۔ اور اس میں سو فیصد حقیقت بھی تھی ڈاکٹر صاحب کے چہرے کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ خوش ہوئے اور بھرپور مسرّت بھرے لہجے میں بولے۔ "آج تم نے ثابت کر دیا کہ صرف تمہارے باپ ہی بڑے انسان نہیں تھے بلکہ تم بھی ایک بڑے باپ کی بڑی بیٹی ہو۔"

مجھے ان کا ادا کیا ہوا یہ جملہ ساری زندگی اپنے آپ میں بولتا رہا۔ پھر میں نے کوشش کی کہ کبھی کوئی چھوٹی بات نہ کروں۔ کہ میری کسی حرکت سے میرے باپ پر کوئی حرف آئے۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر احسان رشید یوں سمجھا گئے ان ہی کے جملے اور آٹوگراف کی تحریر کے بین السطور میں نے زندگی کی بہت ساری راہیں بنائیں۔

یونیورسٹی سے ایک دن ہر طالبعلم کو چلے جانا ہوتا ہے۔ اور میں بھی رخصت ہوئی۔ اس مادرِ علمی کا قرض زندگی کی آخری سانسوں تک ہر طالبعلم کے حصے میں موجود رہتا ہے۔ میں بھی مقروض ہوں۔ لیکن اپنے اساتذہ کے احسان تلے دب کر زندگی گزارنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں جن بچوں کو درسگاہیں نہیں ملیں وہ زندگی کے کتنے بڑے حُسن سے محروم ہیں۔

ڈاکٹر احسان رشید سے پھر میری قربت ان کی زندگی کے آخری دنوں تک رہی۔ میں انہیں اپنی یاد میں ہمیشہ تازہ پاتی ہوں اور برسوں پرانے ان سے اپنے تعلقات یاد کر کے سکون محسوس کرتی ہوں۔

ڈاکٹر احسان رشید یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔ میں جامعہ کسی کام سے گئی تھی واپسی پر پوائنٹ کے انتظار میں کھڑی تھی۔ ان کی گاڑی سامنے سے گزری۔ پھر دیکھا وہ

واپس آئی۔ میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں آگے بڑھی ڈاکٹر صاحب نے کہا ''بیٹھ جاؤ'' میں عجب شش و پنج میں تھی سارے طالبعلم دیکھ رہے تھے۔ ''سر آپ کا گھر اور میرا گھر دو مختلف سمتوں میں ہے۔'''' بیٹھ جاؤ'' وہ اپنے گھر اتر گئے۔ ڈرائیور سے کہا بی بی کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ راستے بھر وہ یہ باور کراتے رہے کہ والدین کی دوستی کو اولاد اگر نہیں نبھائے تو اچھا نہیں کرتی۔

میں نے ایم اے کے بعد معاشیات پر کتاب لکھی اور ایک کالج میں یہ مضمون پڑھانے بھی لگی۔ ہماری اساتذہ کی تنظیم PCTA نے فیصلہ کیا کہ جن اساتذہ نے کتابیں لکھی ہیں انہیں میڈل دیا جائے گا۔ اس تقریب کی صدارت احسان رشید صاحب کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس سلام کرنے اور مبارکباد لینے پہنچ گئی ساتھ ہی ان سے یہ درخواست کی کہ تقریب کے اختتام پر وہ میری امّی سے بھی مل لیں۔ جو یہاں موجود ہیں اور پچھلی صف میں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تقریباً خفا ہو کر بولے۔ یہ تم نے کیا کہا۔ تقریب کے بعد اور یہ کہ وہ خود میرے پاس آئیں گی۔ میں چھوٹا ہوں خود ان کے پاس جاؤں گا۔ میں ہچکچائی۔ لیکن وہ بہت آخر میں ہیں۔ مگر وہ اٹھ کھڑے ہوئے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جلسہ گاہ کی تقریباً آخری صف تک پہنچ گئے۔ میں نے تعارف کرایا۔ وہ جُھکے۔ میرے سر پر ہاتھ رکھے۔ میری اماں نے انہیں وائس چانسلر بننے کی مبارکباد دی۔ تب وہ بولے۔ یہ آپ بزرگوں کی دعاؤں کے سبب ہے میں تو آپ کے آنگن میں کھیلا ہوں۔ تقریب کے شرکاء حیران تھے کہ صدرِ محفل جلسہ گاہ کی آخری صف میں ایک بوڑھی برقعہ پوش خاتون کے آگے سر جھکائے کھڑے ہیں اور میں اس باوقار خاندان کے بڑے فرد کے لائق بیٹے کی عظمت کو سلام کر رہی تھی کہ بس ایسے لوگوں کو استاد کا منصب سنبھالنا چاہئے۔ وہ لمحہ اور ان کے جملے میرے دل و دماغ میں بس کر رہ گئے ہیں اور ایک ضرب المثل جو بچپن سے پڑھتی آئی تھی کہ پھل دار درخت ہمیشہ جھک جاتا ہے۔ سمجھ میں آ گئی۔

ایک بار کالج میں کوئی تقریب تھی۔ صاحب صدر پر مجھے اختلاف تھا میں ہمیشہ ہی اس بات کی مخالف رہی کہ درس گاہوں میں وزیر سفیر نہ آئیں کہ کرسی سے اتر کر ان کی حیثیت ہی کیا ہوگی؟ مجھ سے کہا گیا وقت کم ہے اب کل آنے کیلئے کس سے کہا جائے؟ میں سیدھی ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچی ڈاکٹر صاحب کی ''کل'' خالی نہیں تھی۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کر کسی سے دیر تک فون پر بات کی۔ پھر میرے پاس آئے۔ ''تم مجھ پر حق رکھتی ہو'' اور انہوں نے آنے کی حامی بھر لی۔ آج سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے لوگ پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے۔''

پھر وہ میرے کالج بار بار آئے اور ہر بار مجھ میں کام کرنے کا حوصلہ بیدار کرتے رہے۔ آخری بار کالج آئے تب وزیٹر بک پر اپنی یہ تحریر چھوڑ گئے۔

''وہ کام جو کرنے کا ہے۔ کیا جائے۔ اور سلیقے سے نہ کر سکے تو بہتر ہے نہ کیا جائے۔ آپ کا کام مثالی ہے کہ آپ کو کام کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔''

ان کا یہ جملہ آج بھی میرا رہبر ہے۔

اس دن میں نے ان سے بہت سی باتیں کیں۔ میں نے بڑے فخر سے کہا استادی آپ کے خاندان میں رہی اور شاگردی میرے خاندان میں۔ اب میں استاد ہوگئی ہوں۔ آئندہ استادی میرے خاندان میں آجائے گی۔''

وہ مسکرائے اپنی عادت سے زیادہ مسکرائے۔

میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے والد نے میرے والد کو شعبے سے نکلتے ہوئے ایک کیریکٹر سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ اور جب میں شعبے سے نکلی تب آپ نے مجھے بھی دیا۔ میں نے ان دونوں قیمتی کاغذات کو ایک ساتھ رکھ دیا ہے۔ جب تک ان دونوں کاغذوں کی روشنائی دھندلا نہیں جائے گی استادی اور شاگردی کی یہ تاریخ یکجا رہے گی اور ہمیں ہمارے تعلق کی یاد دلاتی رہے گی۔

اور ہمیں یقین ہے کہ نہ صرف ہماری زندگیوں میں بلکہ ہماری اولادوں کی زندگیوں

تک بھی یہ روشنائی ہرگز نہیں دھندلائیگی کہ تاریخ تو اپنی مہر ثبت کر چکی ہے۔
شہر کی ہر تقریب جس میں وہ ہوتے ملاقات ہوتی۔ میں لپک کر ان کے پاس جاتی اور وہ کوشش کرتے کہ مجھ سے پہلے میرے پاس پہنچ جائیں۔ یہ محبت اور زندگی کا شائستہ دھیما انداز مجھے انہیں ہر ایک سے الگ اور ممتاز رکھنے پر اکساتا ہے۔
وہ اب کسی تقریب میں نہیں ملتے کہ میں نے ان کے انتقال پر ان کا آخری دیدار کرتے ہوئے زیرلب یہ دہرایا تھا۔
''اپنی بنائی ہوئی جنت میں جاتے ہوئے میرا آخری سلام ساتھ لیتے جائیے اللہ آپ کا نگہبان ہو۔''
ان کے مرنے کے بعد پہلی تعزیتی تقریب میں میرے پاس کہنے کو بس یہی کچھ ہے۔
(شعبہ معاشیات جامعہ کراچی کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

جن کے مرنے سے مرگئی دِلیؔ — حکیم اجمل خان

ہندوستان کے مسلم مشاہیر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور یقیناً آنیوالی نسلوں پر ان کا بڑا احسان ہے ورنہ اتنے باکمال لوگوں کے گزر جانے کے بعد ان کے ناموں سے کوئی بھی واقف نہ ہوتا۔ لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج کی نسلوں کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور اپنے ماضی کے ان درخشندہ ستاروں کے بارے میں کچھ جانیں۔ انہیں معلوم ہو کہ پچھلی صدیوں میں غیر منقسم ہندوستان میں ایسی ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے اپنے مخصوص طرزِ زندگی اور اپنی دلچسپیوں سے متعلق وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آئندہ آنیوالی کئی صدیاں بھی ان پر ناز کریں گی اور چاہیں گی کہ ان کے اپنے حصے میں بھی ایسے ایسے ہی بطلِ جلیل آئیں۔ یوں تو مایوسی اور ناامیدی گناہ ہے لیکن پھر بھی یہ مسلّم حقیقت ہے کہ آنیوالی صدیوں میں شاید سائنسی میدان میں تو بڑے معرکے مارے جائیں ایسی ایسی ایجادات آئیں کہ عقل حیران رہ جائے لیکن یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؔ، حسرتؔ موہانی، سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خان، شبیر احمد عثمانی، نواب بہادر یار جنگ یا حکیم اجمل خاں جیسی شخصیات پھر سے جنم لے سکیں۔ جو نہ صرف اپنے اپنے شعبوں کا آفتاب و ماہتاب تھیں بلکہ اپنی شخصیت، مزاج اور رواداری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔

حکیم اجمل خان بھی غیر منقسم ہندوستان کی ایک ایسی ہی شخصیت تھے جن کی زندگی کا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے۔ وہ اتنی ہمہ گیر شخصیت کے

مالک تھے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک انسان میں اتنی ساری خصوصیات بیک وقت کیونکر جمع ہوسکتی ہیں وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ پھر بھی غریبوں کی ہمدردی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کڑاکے کی سردی میں چپ چاپ بگھی میں سوار ہو جاتے اور سڑک پر سکڑے سکڑائے پڑے ہوئے لوگوں پر لحاف ڈالتے جاتے اور چپ چاپ رات کی تاریکی میں بغیر اپنا نام پتہ بتائے گھر لوٹ جاتے۔

وہ دِلیؔ تہذیب کی آخری بڑی نشانی تھے کہ جن کے مرنے سے دِلیؔ کا حُسن ماند پڑ گیا۔ متوسط قدوقامت، کشادہ پیشانی، گندمی رنگ، سیاہ داڑھی، لباس کبھی انگھرکھا کبھی کرتا۔ ترکی یا دو پلی ٹوپی۔ کبھی شیروانی چست پاجامہ، کامدار جوتی، شخصیت بنی بنائی دِلیؔ کی تہذیب کا مظہر جی چاہتا ہے کہ کاش ہم ان کے عہد میں پیدا ہوتے یا ایسے لوگ عمرِ جاودانی لیکر آتے اور ہر دور میں اپنی جھلک دکھاتے۔

تکلّف اور تصنّع سے مبّرا، کم سخن، مگر جب بولنے پر آجائیں تو وہ بولتے جائیں اور دوسرا سنتے سنتے نہ گھبرائے، مزاج دھیما، مگر بلا کے خوددار، بے انتہا صلح جُو، انتہائی خوش اخلاق، ظرافت کے بادشاہ کہ ان کی صحبت جسے مل جائے مدّتوں اس سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ دوسروں کو بے اختیار کھلکھلانے پر مجبور کر دیتے اور خود صرف ہلکے سے تبسّم پر اکتفا کر جاتے ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملنا۔ اپنوں سے بھی غیروں سے بھی۔ ہم خیال سے بھی مخالف سے بھی۔ دوست سے بھی دشمن سے بھی۔ سیاسی اختلاف رکھنے والوں سے بھی اتّفاق رکھنے والوں سے بھی ان کے یہاں دورویوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ گفتگو میں علم اور محبت کی آمیزش مخاطب کو مزا دے جاتی۔

انتہائی خوش گو شاعر، شیدؔا تخلص تھا۔ ان کا مجموعہ کلام جرمنی سے شائع ہوا۔ فارسی اور اُردو پر عبور۔ انگریزی کسی قدر سمجھ اور بول لیتے تھے۔ عربی زبان سے بھی کافی حد تک آشنا تھے۔

جن لوگوں میں کوئی ایک بھی وصف ہوتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کیلئے

محفل سجاتا ہے اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کیلئے "میں" کی گردان کئے جاتا ہے۔ مگر حکیم اجمل خان گوناگوں خصوصیات کے حامل ہوتے ہوئے بھی کم سخن اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے مرض سے کوسوں دُور تھے۔

سیاست میں انہوں نے وقت کی ضرورت کے تحت دلچسپی دکھائی لیکن بہت ساری دیگر علمی اور طبی مصروفیت کے باعث کھل کر جم کر سیاست نہ کر سکے لیکن آخر آخر میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی سیاست میں آنا ضروری ہے تب انہوں نے اپنا بہت سا وقت سیاست کو بھی دیا۔ بڑے نازک اور تاریخی موقعوں پر ان کی موجودگی اور ان کے نظریات سے مسلمانوں کی سیاست نے ان کی ذات سے فائدہ اٹھایا۔ 1906 میں جب نواب سلیم اللہ نے ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد پیش کی تو یہ حکیم اجمل خان ہی تھے جنہوں نے اس کی تائید کی۔ اور تاریخ میں نام پا گئے۔ جب دِلّی کو ہندوستان کا صدر مقام بنایا گیا تب حکیم صاحب نے آگے بڑھ کر اپنی خوشی کا برملا اعلان کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ان کی خدمات پر حکومت کی طرف سے انہیں تمغہ "قیصرِ ہند" ملا لیکن جب خلافت تحریک میں یہ طے ہوا کہ تمغے اور سرکاری خطابات سرکار کو واپس کر دیئے جائیں تب انہوں نے انگریز حکومت کو اپنا تمغہ اور خطاب واپس کر دیا۔

حکیم اجمل خان خاندان شریفی کی اہم شخصیت کے طور پر گیارہ فروری 1868 دِلّی میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی اور روایتی تعلیم اپنے والد اور بڑے بھائی سے حاصل کی۔ پندرہ برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور 18 برس کی عمر میں طبّ کے ساتھ تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ اور ادب میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ انگریزی بعد میں اپنے شوق سے کسی قدر سیکھی۔

حکیم صاحب نے زندگی کے کئی شعبوں میں کمال حاصل کیا اچھے انسان، اچھے شاعر، اچھے سیاست دان، لیکن ان کی وجہ شہرت ان کے آبائی پیشے سے منسلک رہی۔ وہ ایک نامور طبیب کے طور پر تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ایک کھلے دل اور روشن دماغ

شخص تھے اور سمجھتے تھے کہ طبِ یونانی کی ترقی کیلئے تحقیق اور ریسرچ بہت ضروری ہے انہیں اس بات پر بہت دکھ ہوتا کہ بعض طبیب اپنے آبائی نسخے کو ساری زندگی سینے سے لگا کر بالآخر قبر تک پہنچا دیتے ہیں اور کسی کو بھی ہوا نہیں لگنے دیتے اس طرح اس سے دوسرا کوئی مستفید نہیں ہو پاتا۔

یوں طبّ کے بہترین علاج کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے عملی طور پر ''حاذق'' نامی ایک کتاب لکھی جس میں اپنے خاندان کے تمام خاص خاص نسخے چھاپ دیئے کہ اس سے طب کی تاریخ آگے بڑھے گی۔ نہ صرف برصغیر بلکہ انہوں نے یورپ جا کر بھی طبِ یونانی کی ترقی اور ترویج میں حصہ لیا اور ڈاکٹروں تک کو چیلنج کیا کہ جہاں ان کی حد ختم ہو جاتی ہے وہاں طبِّ یونانی سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ایسے بے شمار موقع آئے جب انہوں نے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو اپنے کمال اور علم سے لاجواب اور حیران کر دیا۔ چاہیے یہ کہ ان واقعات کو عام کیا جائے تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں برصغیر کے ان علوم کی بڑائی اور ان باکمال لوگوں کے فن کی عظمت سے آشنا ہوسکیں طب کو انہوں نے چھوٹے چھوٹے مطب سے نکال کر بڑے اداروں کی داغ بیل ڈالی۔ 1916 میں یونانی طبیّہ کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جہاں بعد میں طبّ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ اس کا نصاب بنا کر ریسرچ کے مواقع فراہم کئے، لائبریری بنائی اور نادر کتابوں سے انہیں آراستہ کیا۔

ہندوستان میں طبِّ یونانی کے خلاف ایکٹ بنانے کیلئے حکومت نے مسوّدہ تیار کیا۔ لیکن حکیم صاحب نے اس کے خلاف مسلسل جدوجہد کی اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ یہ ایکٹ واپس لے اور ہُوا بھی یونہی 1911 میں اس ایکٹ کو منسوخ کرنا پڑا۔

انہوں نے مختلف ماہرین کو یکجا کرنے کیلئے 1919 میں ایک طبّی کانفرنس کا اجلاس کراچی میں طلب کیا جس میں حکیم صاحب نے سائنسی خطوط پر اس علم کی ترویج پر زور دیا۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ جب سرسیّد کی تحریک تعلیمِ نسواں کی باتیں ہو رہی تھیں حکیم صاحب مدرسہ طبیّہ میں زنانہ شعبہ قائم بھی کر چکے تھے اور انہوں نے واضح طور پر کہا کہ کوئی

تعلیمی کام کامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ سوسائٹی کی نصف آبادی کے ساتھ سچی ہمدردی کا عنصر اس میں شامل نہ ہو۔ یوں انہوں نے طبِّ یونانی کو سائنٹفک تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں مردوں میں یکساں طور پر عام کیا۔

انگریزوں کا زمانہ تھا لوگ ان کے سحر میں گرفتار تھے حکیموں سے دور ہوتے جا رہے تھے مگر حکیم اجمل نے اپنے علم اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہ باور کرایا کہ طبِّ یونانی کوئی معمولی طریقۂ علاج نہیں ہے۔

ایک بڑا مشہور واقعہ کتابوں میں درج ہے کہ ایک شخص پرانے دمے کا شکار تھا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا اور رو رو کر کہنے لگا حکیم صاحب میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ اب تکلیف سہی نہیں جاتی حکیم صاحب بذلہ سنج تو تھے ہی ہنس کر بولے۔ ''بھلے آدمی مرنا ہی ہے تو دوا کھا کر مر زہر سے کیوں مرتا ہے۔'' انہوں نے اسے ایک پڑیا کھلائی وہ خوب خوب لوٹا۔ تکلیف سے بے حال ہوا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اسے آرام آ گیا۔ ہنستا کھیلتا گھر لوٹ گیا۔ پرانا دمہ غائب تھا۔

دوسرا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک مریض آیا اشرفی نذر کی اور کہا بتائیے میرا مرض کیا ہے؟ حکیم صاحب نے اس کی اشرفی اسے واپس کی اور کہا میں مطب میں فیس نہیں لیتا۔ مریض نے کہا مفت علاج کون کرتا ہے۔؟ حکیم صاحب نے کہا میں کرتا ہوں مجھے آزمائیے۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے احوال پوچھا۔ مریض کہنے لگا سب کچھ میں نے ہی بتا دیا تو پھر نبض دیکھنے کا فائدہ؟ حکیم صاحب نے نبض پکڑے پکڑے اگلا پچھلا سارا احوال اسے سنا ڈالا۔ مریض حیران تھا۔ قائل ہوگیا دوا مانگی۔ حکیم صاحب نے کہا میں آپ کو دوا نہیں دوں گا آپ علاج کرانے نہیں مجھے آزمانے آئے تھے۔ علاج کسی اور سے کرائیے۔

ایک دفعہ حکومتِ وقت سے ٹکرا گئے۔ دِلّی میں طاعون پھیلا حکومت نے کہا طاعون زدگان کو شہر سے باہر کسی کیمپ میں منتقل کر دیا جائے۔ حکیم صاحب ڈٹ گئے۔ میں ان

مریضوں کا علاج کروں گا اور انہوں نے اس مرض پر قابو پا کر دکھا دیا۔

ایک نادار مریض اس حال میں آیا کہ خون کا پیشاب آ رہا تھا جو کسی صورت رُکتا نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے اس سے کہا ایک تولہ ملتانی مٹی کو گھول کر روزانہ کھالو۔ چار دن میں مریض شفایاب ہوگیا۔

ایک صاحب آئے انہیں بدخوابی اور بے خوابی کی شکایت تھی۔ حکیم صاحب نے ان سے کھانے کے اوقات پوچھے۔ اس نے بتا دیا۔ حکیم صاحب نے کہا اوقات غلط ہیں اسے یوں کرلو۔ مریض نے دوا مانگی انہوں نے کہا بس یہی تمہاری دوا ہے۔ دو چار دن میں مریض ٹھیک ہوگیا۔

رامپور میں ایک عطّار تھے ان کے حالات خراب تھے اور بیٹی کی شادی کرنی تھی۔ حکیم صاحب کے پاس آئے اپنی مشکل دہرائی۔ انہوں نے کہا تم نے بارش کا پانی تو جمع کر رکھا ہوگا؟ عطار نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے اچھا اب میں اپنے ہر نسخے کے ساتھ ''آبِ الٰہی'' لکھا کروں گا۔ یوں ان کا لکھا نسخہ عطار کے پاس پہنچنا شروع ہوگیا۔ وہ پانی کے پیسے وصول کرتا اور اس کی اپنی آمدنی سے بیٹی کا جہیز تیار ہوگیا۔

یہ اور اسی قسم کے واقعات دراصل حکیم صاحب کے مزاج، شخصیّت، ان کی حکمت اور ان کی قابلیت ظاہر کرتے ہیں۔ یقیناً یہ عام واقعات نہیں ان سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی شخص تھے۔ اپنی صدی کے اہم آدمی اور آنیوالے زمانے کیلئے مثالی انسان۔

شخصیّت میں اسقدر تنوّع تھا کہ کسی ایک شخصیت میں ممکن نہیں ہوتا۔ قومی سطح کے سیاسی رہنما تھے۔ طبّ کی دنیا کے بادشاہ تھے۔ دِلّی کی تہذیب کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ غریبوں کے بے انتہا ہمدرد تھے۔ تعلیمی میدان میں ان کے کار ہائے نمایاں کا کوئی بدل نہ تھا۔ تکلّف و تصنّع سے مُبرّا شخصیت۔ کم سخن اور بولیں تو لوگ سنتے ہی جائیں اور پھر سب سے بڑی بات کہ حافظِ قرآن ایسا شخص اپنی تمام تر گوناگوں مصروفیات کے باوجود جب تنہا ہوتا ہے تو اس پر شعر بھی وارد ہوتا ہے۔ گویا وہ نہ صرف انسانی نبض کو جانتے پہچانتے تھے

بلکہ شاعری کے مزاج اور اس کے نبض شناس تھے۔

گم کردہ راہ آتے ہیں وہ آج میرے گھر
ہائے یہ میری نیم شبی تُو نے کیا کیا
وہ خوابِ ناز میں تھے مرا دیدۂ نیاز
دیکھا کیا اور ان کی بلائیں لیا کیا

اور آپ یہ شعر دیکھیں۔

ابھی سے تقاضا کہ گھر جائیں گے
تم آئے کہ گویا سحر ہوگئی

ان اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صرف شاعری کو اپنا لیتے تو آج حکیم اجمل شیدا اُردو فارسی زبان کے اعلیٰ پائے کے شاعر ہوتے قدرت بعض شخصیّت کو اپنی پوری فرصت اور توجّہ کے ساتھ بناتی ہے اس میں ایک حکیم اجمل خان بھی تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے کیا خوب کہا۔''دلی کی سیر کو آنے والے جب قطب مینار اور لال قلعہ دیکھ چکیں تو پھر بلیماراں جا کر حکیم اجمل خان کو بھی دیکھیں وہ بھی دِلّی تہذیب کا چلتا پھرتا روپ ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے یہاں بھی ایسی ہی نمایاں جگہ دے جیسی کہ انہوں نے اپنے لیے اس دنیا میں بنائی تھی ممتاز ونمایاں۔

(اپنے جدِامجد کیلئے رومانہ اور معید بھائی نے فرمائش پر لکھوایا، 27 دسمبر 2006ء)

☆☆☆☆

ہمارے فرید صاحب

وقت چُپکے چُپکے سرکتا ہے دن رات ہفتے مہینے اور سال یوں گزر جاتے ہیں کہ احساس ہی نہیں ہوتا لیکن جب ہم انہیں شمار کرنے بیٹھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اپنوں سے کتنا دور لے گیا ہے۔ وہ موسم' وہ دن' وہ ماہ وسال وہ ساتھی وہ دوست احباب اور سارا ماحول کتنا بدل چکا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنوں میں سے کسی ایک کی۔ دو کی یا بہتوں کی کمی بے حساب ستاتی ہے اور ہم ماضی کے ان دنوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم نے کچھ دن کچھ سال ان کے ساتھ بتائے ہوتے ہیں۔ مجھے بھی وہ سال' وہ دن یاد ہے جب میں نے یونیورسٹی میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ شعبہ معاشیات میں داخلے کی غرض سے فارم بھرا۔ اپنا نام کامیاب امیدواروں کے ساتھ نوٹس بورڈ پر پڑھا اور پھر وہ پہلا دن جس دن ہمیں ہمارے سینئرز نے خوش آمدید کہنے کیلئے محفل سجائی۔ اس دن ہم نے اپنے صدرِ شعبہ کو تقریر کرتے سنا اور دیکھا۔ انہوں نے انتہائی محبّت سے ہمیں اپنے شعبے میں آنے پر مبارکباد دی۔ شعبے کی روایات کی پاسداری کی ہدایت کی۔ معاشیات کی اہمیت بتائی۔ اور ہمیں جامعہ کے سب سے بڑے شعبے کے طالبعلم ہونے کا احساس دلایا۔ مجھے خاص طور سے معاشیات میں اول آنے پر مبارکباد دی اور شعبے کے انتخاب پر خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اس دن سوچا کہ معاشیات کا مضمون میرا انتخاب ہے اور شاید بہترین انتخاب کہ مجھے قاضی محمد فرید جیسے استاد سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا ہاں شعبے میں گزارے ہوئے چار سال میری تعلیمی زندگی کے اہم سال ہیں جہاں ہم نے علم کی نعمت اپنی جھولی میں سمیٹی۔ بہت اچھے اور قابلِ

قدر اساتذہ کی محبت سے مستفید ہوئے۔ زندگی کے بڑے اچھے دوست بنائے۔ انتخابات اور ہم نصاب سرگرمیوں میں حصہ لیکر اپنی زندگی کو بہت سے ہنر دیئے۔ تحریر' تقریر' ڈرامہ' مشاعرہ' سیمینار اور ڈھیروں تقریبات منعقد کر کے انتظامی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا مطلوب صاحب ہوں یا خورشید صاحب۔ جعفر صاحب ہوں یا سرور صاحب فخر الدین صاحب ہوں یا قمر الدین صدیقی۔ ہیرائی صاحب ہوں یا ڈاکٹر احسان رشید اساتذہ کے روپ میں یہ بہترین رہنما ثابت ہوئے۔

ساتھی طالبعلموں کی تو ایک لمبی قطار ہے۔ ایک ایک چہرہ آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ وہ سب ماضی کا حصہ ضرور بن گئے ہیں لیکن انہوں نے ہمارے حال کو ترو تازہ رکھا ہوا ہے۔ ملک صاحب ہوں یا نیاز چپراسی۔ جمیل صاحب ہوں یا ظفیر چپراسی زندگی میں ان کی اہمیت کسی بڑے سے بڑے کے مقابلے میں بھی کم نہیں۔ لیکن قاضی فرید کے دنیا سے کوچ کر جانے پر زندگی کی یادگار متاع کی تھیلی سے جیسے سب سے قیمتی چیز چوری ہوگئی ہو اور ہم اس سے محروم ہو جانے پر مرجھا سے گئے ہوں۔

قاضی فرید کے طالبعلم مُلک اور بیرون مُلک بکھرے ہوئے ہیں۔ پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے دیے ہوئے درس کے باعث کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور ہر ایک کے ذہن میں ان کی شرافت' ملنساری' صاف گوئی' سادگی اور احباب نوازی اور بے نفسی کا واضح خاکہ موجود ہے جو آج بھی ان کا نام لیتے ہوئے ان کی خوش اخلاقی' نیک نامی' فرض شناسی اور جانفشانی کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔

ان کے ساتھی اور دوست احباب آج بھی کہتے ہیں کہ وہ اخلاقی' ذہنی' تہذیبی اور انتظامی اعتبار سے عالی مرتبت انسان تھے۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی آج بھی بہتوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ عزم کا بے مثال اور عظیم پہاڑ تھے ان سے جو بھی ناحق ٹکرایا ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ٹکرانے والا خواہ ان سے بڑے عہدے پر کیوں نہ فائز رہا ہو خواہ ان سے زیادہ با اثر کیوں نہ رہا ہو۔ سچ بولنے والا یہ شخص ہمیشہ جیتا اور کبھی ہار نہ مانی۔

فرید صاحب مرحوم بلاشبہ ایک عام سے آدمی تھے دو ہاتھ۔ دو آنکھیں ایک دل اور ایک دماغ رکھنے والے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے دو ہاتھوں میں بے اندازہ قوت تھی۔ ان کی دو آنکھوں میں ہزاروں کی صاحب نظری موجود تھی۔ ان کے دل میں ہزار رہا جسموں کے درد سمٹ آئے تھے۔ اپنے لوگوں کے غیروں کے اور اسی طرح ایک دماغ میں دنیا جہاں کی تنظیمی قابلیتیں موجود تھیں۔ دنیا جہاں کا علمی خزانہ دفن تھا۔ ذرا سوچیئے تو سہی بیک وقت وہ بیس عدد انجمنوں کے سربراہ تھے۔ جامعہ میں وہ صدر شعبہ معاشیات کے فرائض انجام دینے کے علاوہ مشاغلِ طلبا' انجمنِ اتحادِ طلبا کے بھی انچارج تھے' بیرونی طلبا کے مشیر تھے' انجمنِ طلبا کے خزانچی' غیر تدریسی عملے کے سرپرست' اکیڈمک کونسل کے ممبر ٹیچرز سوسائٹی کے مستقل تین سال سے صدر۔ سینڈیکٹ اور سینٹ کے ممبر چیف الیکشن آفیسر 65 کی جنگ کے دوران دفاعی فنڈ کے نگراں۔ اور جانے کیا کیا کچھ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ بزم معاشیات کے نگراں اور جامعہ کی ہر تقریب کے روحِ رواں تھے۔

جامعہ سے باہر آل پاکستان اکنامکس اینڈ بزنس مین ایسوسی ایشن کے صدر' پاکستان تھائی لینڈ کلچرل سوسائٹی' پاک ٹرکش ایسوسی ایشن بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز ان اکنامکس کے روح رواں' نبی باغ' جناح کالج' فیڈرل کالج' ہوم اکنامکس کالج' پاک اکنامک ایسوسی ایشن' کراچی اکنامک اینڈ کامرس ٹیچرز ایسوسی ایشن کے بھی صدر تھے۔ یہ تو وہ ذمہ داریاں ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ اس کے علاوہ اپنے اور دوسروں کے جانے کتنے مشاغل اپنا رکھے تھے۔

عہدے حاصل کرلینا یقیناً کوئی قابلِ بیان بات نہیں لیکن عہدے برقرار رکھنا اور برائے نام عہدیداری نہ کرنا یقیناً بڑی بات ہے۔ وہ ہر جگہ پیش پیش رہتے۔ دامے' درمے سخنے' ذمہ داریاں بڑھاتے جاتے اور کسی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اصل خوبی ان میں یہی تھی۔ دراصل ان کے اپنے دل میں آگ لگی ہوئی تھی جو ان سے کام کراتی جاتی۔ کوئی بیرونی دباؤ یا جذبہ کام نہ کرتا تھا۔

چھوٹے سے قد اور بھاری جسم کے فرید صاحب میں بے حد چستی تھی۔ ان کی زندگی میں بلا کی تب و تاب تھی۔ مصروفیت ان کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔ ان سے جو بھی ملا ہوگا اس نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ اپنے آفس میں کبھی بیکار بیٹھے ہوئے نہیں پائے گئے۔ کاغذات کے ڈھیر میں ان کی نظریں بھٹکی رہتیں۔ وہ فون پر محوِ گفتگو ہوتے۔ کبھی سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ مگر نظریں کاغذات پر ہوتیں۔ بتاتے بھی۔ ہنستے بھی مگر جیسے بہت عجلت میں ہوں۔ جلد ہی کسی دوسرے کام میں لگ جاتے۔ کام کا نہ ختم ہونے والا تسلسل ہوتا۔ کوئی طالبعلم پہنچ جاتا۔ ایک نظر دیکھتے اور لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔ یعنی اب دیکھیں گے نہیں صرف سنیں گے لکھتے جاتے' سنتے جاتے' جواب بھی دیدیتے' طالبعلم چلا بھی جاتا ان کا تسلسل نہ ٹوٹتا۔ کبھی ان کے دفتر پہنچے معلوم ہوتا وہ کسی میٹنگ میں جارہے ہیں۔ جلدی جلدی' بہت جلدی' ایسے میں چلتے چلتے ہدائتیں کرتے جاتے۔ طالبعلموں سے بات کرتے جاتے۔ نوٹس بھی اسٹینو کو بولتے رہتے۔ ہاتھوں میں کاغذات ہوتے ان کی ترتیب بدل لیتے۔ ان پر نظر ڈال لیتے۔ اور یونہی باتیں کرتے کرتے دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیتے خود آگے نکل جاتے۔ ابھی آرٹس بلاک میں ہیں دوسرے لمحے انتظامیہ کی عمارت میں کسی سے بات کرتے پائے جاتے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں سیڑھیاں چڑھ کر شیخ الجامعہ سے محوِ گفتگو ہوتے۔ یہی مصروفیتیں ان کی زندگی بھی تھی ان کی پہچان بھی اور ان کی انفرادیت بھی' جلدی جلدی' نے ان کی زندگی کے کئی پہلوعیاں کر دیئے تھے۔ بیک وقت کئی ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل بنا دیا تھا۔ لکھتے کسی مسئلے پر تھے۔ بولتے دوسرے پر اور سوچ کا تانا بانا کسی تیسرے مسئلے کے گرد گھومتا رہتا۔ مگر اپنی جگہ سب مکمل انہیں اپنی مصروفیتوں سے کبھی شکوہ ہوا نہ ہی انہوں نے اپنے مصروف ہونے کا رونا رویا اور نہ ہی کسی پر اپنی مصروفیت کا رعب جمایا۔ انہیں تو سکون ہی اسی مصروفیت میں ملتا تھا۔ ان کی شخصیت میں کوئی جادو بھرا تھا متاثر ہوئے بغیر کوئی نہ رہتا۔ اپنے مخالف کے سب سے بڑے حریف ہو جاتے اور جب تک اسے شکست نہ دے

لیتے چین سے نہ بیٹھتے۔ جامعہ کراچی کا سب سے پہلا پی ایچ ڈی نارمن ایڈم نامی امریکن طالبعلم ان کے ہی شعبے اور ان کی ہی تربیت کی پیداوار ہے وہ امریکا سے آیا اور امریکا کے قائم کیے ہوئے ادارے انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس کو نظر انداز کر کے جامعہ کراچی میں ان سے فیض یاب ہونے پر آمادہ ہوا۔

فرید صاحب جامعہ کراچی کے اوّلین پراکٹر بھی تھے انہیں اس وقت کے شیخ الجامعہ جناب ہاشمی نے نامزد کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان دونوں کے درمیان کشیدگی اور اختلاف تھا۔ اختلاف یہاں تک کہ عدالت عالیہ تک جا پہنچا تھا۔ مگر فرید صاحب کی انتظامی قابلیت کے وہ بھی دل سے قائل تھے۔

فرید صاحب معاشیات میں 'کفایت' کا نظریہ پیش کرنے والے پہلے شخص ہیں۔ انہوں نے بلاسود بینکاری کی ہمیشہ حمایت کی وہ چاہتے تھے کہ ملک کا معاشی نظام اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ وہ بیرونی امداد کے بھی زبردست مخالف تھے۔ طالبعلمی کے زمانے میں انہوں نے بیک وقت تین گولڈ میڈل حاصل کئے تھے۔ اور اسی لئے انہیں لائق طالبعلموں سے بڑا لگاؤ ہوتا تھا۔ وہ خود سرگرمیوں میں حصہ لیتے اسی لئے انہیں وہ طالبعلم عزیز ہو جاتے جو ہم نصاب سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔

انہیں ہم سے جدا ہوئے تین سال گزر گئے آج ہم جب پرانے ساتھی یکجا ہوتے ہیں تو فرید صاحب کا ذکر چل نکلتا ہے۔

بلقیس کو ان کی پرانی فائل یاد آ جاتی ہے جسے ہم 36ء کی فائل کہتے تھے۔ نجمہ ان کے مشفقانہ انداز کو یاد کرنے لگ جاتی ہے۔ زیبا کو ان کا جلدی جلدی پڑھانا یاد آ تا ہے۔ زینب کو ان کی اصول پرستی' فرحت' عابدہ' روشن' رئیس سب ان کی علمیت اور قابلیت کے ترانے گانے لگتی ہیں۔ پرانے طالبعلم' طارق' آصف' ناصر' اجمل' ولی سب اپنے اپنے زمانے کے قصے دُہرانے لگتے ہیں۔ سعید جو شعبہ کا سب سے شرارتی طالبعلم تھا وہ بھی سنجیدگی سے کہتا ہے فرید صاحب کی موجودگی سے ہم میں قوت تھی چھاپرا کی آنکھوں میں

آنسو آجاتے ہیں۔ ان کا یونیورسٹی آنا۔ چپراسی کا گاؤن لئے کھڑا رہنا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی سب سے پہلے وہ گاؤن پہنتے پھر جامعہ میں داخل ہوتے۔ اسی لئے وہ کسی استاد اور طالبعلم کو بغیر گاؤن دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

میں بھی انہیں یاد کرتی ہوں۔ خصوصاً اس دن کو جب پہلی بار گاؤن متعارف ہوا۔ ہمارے شعبے میں لاکر رکھا گیا اور پہلا گاؤن پہننے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔ یہ اعزاز مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا جب بھی جامعہ کی تاریخ میں گاؤن کی ابتداء کا ذکر ہوگا۔ یہ مجھے فرید صاحب کے باعث نصیب ہوا تھا۔ میں بزمِ معاشیات کی جنرل سیکریٹری تھی اور فرید صاحب کی محبّتوں سے بہت قریب ہوا کرتی تھی شعبے میں گزارے ہوئے چار سال میرے لیے چار ہزار سال سے کم نہیں کہ میں نے ان کی ذات سے بہت کچھ سیکھا۔ ذمہ داری نبھانے کا سلیقہ جو آج بھی میری زندگی میں کام آکر دوسروں سے تھوڑا جدا کرنے میں مدد کرتا ہے۔ فرید صاحب میں آپ کو سلام پیش کرتی ہوں کہ آپ میرے بہت محترم استاد تھے۔ آج شعبہ معاشیات یتیم ہوگیا۔ اللہ آپ کو آپ کی علم پروری کے عوض آخرت میں بلند مقام عطا کرے۔

(29 مارچ 1969ء مرحوم کی تیسری برسی پر بزمِ معاشیات جامعہ کراچی میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

صدی کا آدمی ــــ ایس ایچ ہاشمی

ہر بڑا آدمی ایک سلسلۂ کوہ کی مانند ہوتا ہے اور اس کی ہر چوٹی منظر نامے کی تخلیق میں حصہ لیتی ہے۔ یہ الگ بات کہ ہر چوٹی اپنی ایک الگ خصوصیت رکھتی ہے۔ اس کا اپنا ایک حُسن ہوتا ہے۔ اس کی اپنی کمی اور خامی ہوتی ہے اور مجموعی طور پر وہ ایک الگ احساس رکھتی ہے لیکن شخصیت کا تعین اس کے تمام مناظر کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ میں نے بڑے لوگوں کا یہ خیال کہیں پڑھا تھا۔

میں نے ایسی کئی تقریبات میں بڑے بڑے لوگوں کو کسی شخصیت کی تصویر کشی کرتے سنا ہے اور اکثر سوچا ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے کیا وہ اسی دنیا کا رہنے والا ہے۔ ہمارے ارد گرد بستا ہے۔ تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ ایسے لوگ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اس شخصیت سے برسوں کی قربت رکھتے ہیں۔ لیکن جانے کیوں سامنے بیٹھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ بولنے والا مبالغہ برت رہا ہے۔

آج میں بھی ایسی ایک مشکل سے دو چار ہوں کہ ایک شخصیت پر مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتی کہ اسے میں برسوں سے جانتی ہوں اور انہیں فرشتہ گردانتی ہوں۔ مجھے یہ دعویٰ بھی نہیں کہ میں ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے واقف ہوں۔

میں تو انہیں بس پچھلے دس برس سے جانتی ہوں۔ اس عرصے میں ہاں ان سے بارہا ملی ہوں۔ انہیں کئی بار اپنے کالج میں مدعو بھی کیا ہے۔ اسی باعث ان سے زیادہ متعارف بھی ہوئی اور انہوں نے بھی بارہا مجھ سے اپنے دفتر میں ملاقات کی۔ وہ بڑے شوق سے

ملتے۔ کالج کے معاملات میں بڑی دلچسپی لیتے اپنی جانب سے ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار انہوں نے طالبات کیلئے واٹر کولر لگانے کا بھی اعلان کیا لیکن میں ایک سرکاری ادارے سے وابستہ تھی اور ہمارے پاس فنڈ کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ دیگر سربراہان کے برخلاف مجھے کبھی یہ اچھا نہ لگا کہ کوئی کچھ رقم دے یا کچھ اور عطیہ کرے سوائے کتابوں کے۔ اسی باعث میں نے شکریئے کے ساتھ ان کی پیشکش سے معذرت کرلی۔ بس اس کے بعد ہی وہ مجھ سے قریب ہوگئے۔ اکثر کہا کرتے نوشابہ تم بہت سے لوگوں سے مختلف ہو۔

لوگ قطار لگائے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں اور تم بغیر باری آئے ہی مراعات سے انکار کر دیتی ہو۔ مجھے اچھا لگے گا کہ میں طالبات کیلئے کوئی سہولت فراہم کروں۔ میں کہتی مجھے اچھا لگے گا کہ آپ بار بار طالبات کے پاس آئیں' وہ خوش ہو جاتے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتے۔ اخبارات میں اپنی تصویریں دیکھ کر اور سال بہ سال ایوارڈ ملنے پر۔ وہ کہتے میں نے اس کیلئے اس مقام پر پہنچنے کیلئے بڑی محنت کی ہے۔

یہی شخصیت آج کے مہمان ایس ایچ ہاشمی ہیں۔ جنہیں جب ملینیئم ایوارڈ سے نوازا گیا تو میں ایک دم سے چونک اٹھی۔ اور خود اپنے آپ پر فخر محسوس کرنے لگی کہ میری جیسی ایک عام شخصیت کا تعلق اس اتنی بڑی ہستی سے کیونکر ہے۔ میں کیوں ہر وقت اسے فون کرسکتی ہوں۔ اس کے پاس جاسکتی ہوں۔ اسے اپنے یہاں بلاسکتی ہوں۔ ہر تقریب میں اس کے قریب جاسکتی ہوں۔ تب احساس ہوا کہ اس شخصیت میں کوئی تو خوبی ہوگی کہ ایک اعلیٰ مقام پر بیٹھ کر وہ عام لوگوں سے مراسم رکھتا ہے۔ ورنہ ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھنے والا بھلا بیچ دو پہر میں ایک ایسے کالج میں جائے جہاں اوسط گھرانوں کی طالبات زیر تعلیم ہوں۔

میں نے انہیں جب بھی دیکھا مسکراتے پایا۔ جب بھی گفتگو کی موضوع گھوم پھر کر پاکستان تک آ گیا۔ جب بھی گہرا جذبہ دیکھا تحریک پاکستان کے نامور سپاہیوں کے لیے

دیکھا۔ جن کے آئیڈیل حسرت موہانی، جن کے ہیرو ٹیپو سلطان، جن کی گفتگو کے موضوع اردو اور صرف اردو رہے۔

میں نے ان سے جب بھی ملاقات چاہی انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ جب بھی فون پر بات کرنی چاہی جتنی دیر چاہی کی۔ جب بھی دفتر گئی چائے سے انکار کیا سیون اپ پی کر لوٹی۔ کبھی انہیں اکیلا نہیں پایا۔ میز کے دوسری طرف مختلف الخیال لوگوں کو بیٹھے پایا۔ شہر کی تقریبات کی صدارت کرتے دیکھا۔ آرٹس کونسل کے الیکشن میں ان کا عوامی انداز دیکھا۔ الیکشن مہم میں ان کی فراخدلی بھی دیکھی اور جیتنے کی خوشی میں جشن بپا ہوتے بھی دیکھا۔ اور ہر بار ان کی شخصیت کا حُسن بڑھتے دیکھا۔

وہ ایک نامی گرامی باپ کے بیٹے ہیں۔ اور ابھی جب یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اپنی زندگی کس ڈھب سے گزاریں گے ایک بند ہوتے ہوئے ادارے میں بٹھا دیے گئے۔ مگر وہ ایسے بیٹھے کہ انہیں مزا بھی آنے لگا۔ اور یہیں سے ان کا یہ جذبہ پروان چڑھا کہ اس گرتے ہوئے ادارے کی دیوار میں اونچی کروں گا۔ اسے ڈوبنے سے میں بچاؤں گا۔

دراصل اس میں انہیں شہرت کے ساتھ ساتھ انسانوں سے ملنے اور ملتے رہنے کا امکان نظر آیا۔ یہ جس زمانے کی بات ہے الیکٹرانک میڈیا کا دور نہیں تھا صرف پرنٹ میڈیا تھا اور بہت با اثر تھا۔ بڑے بڑے اداروں کے مالکان خود ان تک چل کر آنے لگے۔ وہ صرف بڑے ادارے کے مالکان ہی نہیں تھے ان کا خاندانی پس منظر بھی تھا۔ ان سے ملنا انہیں اچھا لگتا۔ وہ کہتے وہ سوچتے کچھ سیکھنے کے لی کتاب ہی ضروری نہیں ہوتی۔ شاید وہ کتاب کے کیڑے سے ہراساں تھے کہ وہ اپنی زندگی کتاب کے اوراق میں گزار دیتے ہیں اور زندگی کی روشنی سے محروم رہتے ہیں۔ کچھ سیکھنا ہے تو انسانوں سے ملو کہ روشنی تو انسانوں سے ملتی ہے۔ ملاقات کے یہ سلسلے جیسے جیسے دراز ہوتے گئے ان کی شخصیت میں نکھار آتا چلا گیا۔ وہ دنیا کو دونوں آنکھوں سے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ وہ انسانوں کو برتنے کا سلیقہ سیکھتے گئے۔ انہیں کاروبار کرنا بھی آیا اور روابط کی بنیاد پر اسے بڑھانا بھی

آیا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کسی بھی اونچی چوٹی پر پہنچ جانے کیلئے اپنے ہاتھ پاؤں کا سلامت ہونا۔ اپنے جذبے کا بیدار ہونا۔ اپنی سوچ کو بلند رکھنا اپنی جرأت کو جوان رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہوتا ہے خاندانی پس منظر' آبائی شرافت' والدین کی دعائیں۔ اور اونچا نصب العین اس ایقان کے ساتھ کہ خواہ کچھ بھی بن جائیں گے شرافت کو کبھی داؤ پر نہیں لگائیں گے۔ زندگی کا کوئی شارٹ کٹ راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ اشتہار کے مبالغے اشتہار تک رکھیں گے۔ اور اپنی زندگی کی سچائیوں کو کبھی داغدار نہیں بنائیں گے۔

اپنے شجرۂ نسب کے ساتھ اپنی شہریت سے وفا داری اس راستے پر چلنے اور اونچائی تک پہنچنے کا سب سے اہم سنگِ میل ہوتا ہے انہوں نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے ہر منفی جذبے کا خون کرلیا۔ اور وطن کی محبت' وطن کی راہ میں جان دینے والوں کو ہیرو بنا کر مشعلِ راہ بنالینا۔ اپنی قومی زبان پر ناز کرنا۔ اس کی ترویج وترقی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا یہی ان کا نصب العین بن گیا۔

یوں زندگی بظاہر دو حصوں میں بٹ گئی۔ لیکن یہ دونوں راستے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ایک اچھے انسان کی تمام خوبیاں اور ایک اچھے کاروباری کی تمام تر خصوصیت ان دونوں راستوں کا جہاں ملاپ ہوتا ہے وہاں شخصیت ایک نئی انگڑائی لیکر اٹھتی ہے۔ ایک چمک ایک دمک اس میں وہ حُسن پیدا کردیتی ہے۔ کہ وہ شخص ایک انسان ایک آدمی کا نام پاتا ہے۔ اور زندگی کی تمام تر کامیابیاں اس کے قدموں تلے ہوتی ہیں۔ لوگ اسے اچھے ناموں سے نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ اسے ایک مستقل اونچا مقام دینے کے لیے اسے کسی اعزاز سے نوازتے ہیں۔ اور وہ اعزاز کبھی سالانہ ہوتا ہے اور کبھی سالوں پر محیط ہوتا ہے۔

ہاشمی صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ملکی پذیرائی ملی۔ بین الاقوامی پرواز ملی۔ تابڑ توڑ کامیابیاں ملیں۔ اپنے جیتے وطن کے سرکردہ لوگوں کے ہاتھوں اپنے سر پر تاج پہنا۔ قد بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ نام اونچا ہوتا گیا۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا

میں بول بالا ہوا۔ ملکی حدود سے نکل کر دنیا کی فضاؤں میں اڑے۔ اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ ماہ و سال گزرتے گزرتے کئی کلینڈر بدل گئے اور پھر ہوا یوں کہ ان کی ہی زندگی میں صدی بھی بدل گئی۔

جب ہم سب نے پلٹ کر دیکھا تو سوسالوں کے طویل راستوں پر ایک فرد اپنی تمام تر رعنائیوں، خوبیوں، ہمّتوں، جرأتوں، محبّتوں اور مسکراہٹوں کے ساتھ قدم قدم پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے، ہم نے، آپ نے، سب نے مل کر کہا یہ ہے وہ انسان وہ آدمی، وہ شخص جسے ہم ملینیئم ایوارڈ سے نوازنا چاہتے ہیں یوں سید حسین ہاشمی ملینیئم ایوارڈ یافتہ بن گئے۔ جو اپنے تمام اعزازات، ایوارڈ، تمغے سینے پر سجائے خاموش آواز میں جیسے اپنے عہد کے لوگوں سے مخاطب ہیں آپ کو اور سب کو اپنے یہ ایس ایچ ہاشمی مبارک ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں دوسری صدی بھی لکھ دے۔

(ملینیئم ایوارڈ ملنے پر سرونٹس آف پاکستان کی جانب سے منعقدہ تقریب
بمقام کراچی جم خانہ میں 10 مئی 2001 کو پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

صلیب کے زخم —— اور مجنوں صاحب

یہ 1973ء کی بات ہے۔ میں نے ایک ناول لکھا۔ دل چاہا کہ وہ لاہور سے شائع ہو مجھے کسی ایسے ناشر کے بارے میں معلومات نہیں تھی کہ جسے میں مسودہ بھیجتی میں ایک بک اسٹال پر گئی۔ کئی ایک ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک کتاب اچھی چھپی ہوئی تھی۔ مکتبہ عالیہ ایبک روڈ لاہور۔ میں نے ناشر کا انتخاب کرلیا تھا۔ گھر آئی دو لائن کا ایک خط لکھا۔

''جنابِ والا مجھ سے ایک حماقت ناول کی صورت میں سرزد ہوگئی ہے کیا آپ اسے چھاپ سکیں گے۔''

محترم کلیم نشتر کا جواب مکتبۂ عالیہ سے جلد ہی موصول ہوا۔

محترمہ! ہم ایسی ہی حماقتوں کو چھاپنے کیلئے یہاں بیٹھے ہیں مسودہ بھیج دیجیے دیکھ کر مزید کچھ عرض کرسکیں گے۔

میں نے جھٹ مسودہ بھیج دیا۔ چند روز بعد اطلاع ملی۔

''آپ کی حماقت چھپ جائے گی۔'' شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مجھے کم از کم تین عدد اور حماقتوں کو ان کے ہی یہاں سے چھپوانا ہوگا۔ یہ کون سی بڑی یا کڑی شرط تھی ہم نے فوراً مان لی۔ ہم بھلا تین اور ناول کیا لکھ بھی پائیں گے۔؟ نہ لکھیں گے نہ کہیں سے چھپے گا۔

ہمیں اپنی صلاحیت کا پہلے ہی سے علم تھا۔ آخر ہوا بھی تو یہی وہ آج تک اگلی حماقت کا انتظار کر رہے ہیں اور ہم اب عقلمند ہوگئے ہیں۔

اب جو مرحلہ درپیش تھا وہ دیباچے کا تھا۔

کلیم صاحب برابر مانگ رہے تھے اور ہم اس سوچ میں تھے کہ لاہور اور پبلشر تو اچھے مل گئے۔ مجنوں صاحب مجھے کیسے دستیاب ہوں گے۔ اور یہ کہ ذہن میں مجنوں صاحب کے علاوہ کوئی جگہ نہیں لے پا رہا تھا۔ مجنوں گورکھپوری اور بس مجنوں گورکھپوری۔۔ دو ملکوں کا فاصلہ۔ پھر مجنوں صاحب کی لیاقت اور میری حماقت کے درمیان کا بھی فاصلہ۔ معاملہ نپٹے کیسے۔ کئی مہینے گزر گئے اور ہمارے تعلقات پبلشر سے خراب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مجھے بار بار سمجھا رہے تھے۔ ایک سے ایک بڑے لوگ کراچی میں موجود ہیں کسی کی بھی خوشامد کر لیں۔ مجھے اختیار دیں۔ لاہور میں بڑی بڑی شخصیات موجود ہیں میں لکھوا دوں۔ مگر نوجوانی کی ضد اور خواہش اس کے آگے بھلا کون ٹھہرا ہے یا ٹھہر سکتا ہے۔ نہیں بس مجنوں صاحب!

واہ رے خواہش کی شدت کہ ایک انہونی ہوگئی۔ مجنوں صاحب نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ پاکستان آ گئے۔ بلکہ کراچی آ گئے۔ بلکہ ناظم آباد آ گئے میں آج تک کہتی ہوں حالانکہ حماقتوں کا زمانہ بھی گزر گیا ہے کہ مجنوں صاحب صرف میرے لئے کراچی آئے تھے۔

میں کسی کو علیگ نہیں مانتی جب تک کہ وہ شخص ایک امتحان میں پاس نہ ہو۔ امتحان کا واحد سوال یہ ہوتا کہ آپ اگر میرے والد یا دادا کو نہیں جانتے تو آپ علیگ ہرگز نہیں۔ یہ امتحان میں ہر علیگ کا لیا کرتی اور نسخہ سو فیصد درست اترتا۔ میں نے حسب عادت پہلی ہی ملاقات میں مجنوں صاحب کو سو فیصد علیگ مانتے ہوئے اپنے دادا اور والد کا نام لیا۔ مجنوں صاحب کی مسکراہٹ اور پھر شفقت نے مجھے ان سے پل بھر میں بہت قریب کر دیا۔ اب مرحلہ تھا اپنے شوق کے اظہار کا۔ میں اپنے بارے میں کسی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی پھر یہ اظہار کیونکر کرتی کہ وہ میرے ناول پر مقدمہ لکھ دیں لیکن مجھے یہ بات ان سے کہنی تو تھی ہی۔ میرے شوق میں کتنا وزن اور میرے اٹکتے ہوئے لہجے میں کتنی لجاجت تھی کہ مجنوں صاحب نے نہ مجھے ڈانٹا نہ شرم دلائی' نہ غصہ ہوئے نہ منع کیا' نہ حامی بھری' بس اتنا کہا

''ناول دیکھ کر بتاؤں گا۔''

ان کے اس ایک جملے نے شریانوں میں خون کی رفتار تیز کر دی۔ سارے آنسو آنکھوں سے ایک ساتھ ٹپک پڑے۔ لرزتے ہونٹ تھم گئے۔ اپنے لکھے کی شرمندگی البتہ بڑھ گئی۔ ''اب کیا ہوگا''

یہ خوف ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اور بڑھ گیا۔

دوسرا دن طے ہوا ان شرائط کے ساتھ:

انہیں ان کے گھر سے اپنے گھر لانا میری ذمہ داری تھی۔ یہ ان کے مطابق وہ فرض تھا جو انہیں میرے خاندان سے واقفیت کی بناء پر اتارنا ہی تھا۔ تھرماس چائے سے بھرا ہوگا، کمرے میں کوئی تیسرا نہیں ہوگا، چائے کی پیالی خالی نہیں رہے گی اور میں مقابل کی کرسی پر بیٹھ کر درست لہجے اور تلفّظ میں انہیں روانی سے سناتی جاؤں گی۔ جہاں چاہوں گا چپ کرادوں گا۔ اُٹھ کر گھر چلا جاؤں گا۔ پھر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ سفارش ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔

شروع کی شرائط نرم مگر آخری بہت گرم اور سخت تھیں۔ لہجہ، تلفّظ روانی سب پر ناز تھا خواہ بیجا ہی سہی، مگر پھر بھی یہ ناز ان کے مقابل آنے سے گھبرا اور کترا رہا تھا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور شوق بہر حال اپنی قوّت منوا رہا تھا۔

کام شروع ہوا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک نامی گرامی نقّاد، افسانہ نگار، شاعر، استاد، ادیب مقابل ہو ایک ایسے نالائق کے جسے قلم بھی پکڑنا نہ آتا ہو تب صورتِ حال کیا ہوتی ہے۔

نوجوانی کا دور ہو تو یہ نغمہ زبان پر آہی جاتا ہے

میں بچہ پاکستانی ہوں اور کام کروں گا بڑے بڑے

میری سوچوں میں یہ سب کچھ تھا کہ مجنوں صاحب کی چائے کی ایک پیالی ختم ہوگئی۔

"لڑکی شروع کرو"

لڑکی شروع ہوگئی۔ شروع میں آواز کانپی۔ جہالت پر شرمائی پھر ڈھیٹ بن گئی' لہجہ' روانی' تلفظ سب کچھ ٹھیک بلکہ مجنوں صاحب کو قابلِ قبول پڑھتے ہوئے کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھتی جاتی اور سوچ لیا تھا کہ چہرے پر برہمی اور اکتاہٹ کے ذرا سے بھی آثار دیکھے تو صفحے سمیٹ لوں گی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ چائے کی پیالی ایک باب میں دو مرتبہ خالی ہوچکی تھی لیکن ابھی تک ناگواری کے سائے ان کے چہرے پر رنگ نہیں لائے تھے۔ پھر بھی میں تکلفاً تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہوگئی۔ اور یہ محسوس کرنے لگی۔ کہ بس اب وہ خود بھی خوشی خوشی مجھے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جانے کیلئے کہیں گے۔ مگر واہ رے مجنوں صاحب کا ضبط بولے۔ "آگے پڑھو"

شوق کا کیا کہنا وہ تو اور بڑھا۔

دوسرا باب شروع ہوا کن انکھیوں سے دیکھنے کا عمل بھی جاری رہا۔ مجنوں صاحب کا ضبط بھی اپنی جگہ قائم' میری شرمندگی میں کمی کے بجائے پھر بھی اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

مگر "آگے پڑھو" کے حکم نے کتاب آدھی ختم کرادی۔

جب میں یہ سمجھی کہ وہ تھک گئے ہوں گے۔ میں نے کتاب سے ہٹ کر بات کی "مجنوں صاحب باقی آئندہ"

"نہیں۔ آگے پڑھو" اب مجنوں صاحب نے سچ مچ کہانی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ میرا حوصلہ تو کیا بڑھتا۔ اپنی اوقات سے میں بالکل غافل نہیں تھی۔

میں پڑھتی جاتی اور مجنوں صاحب کی جانب چوری چوری دیکھتی جاتی۔ اب ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کا ذرا سا جسم سمٹ کر صوفے میں دھنس چکا تھا۔ چائے کی پیالی خالی تھی۔ میں نے تھرماس سے مزید چائے نہیں انڈیلی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ شاید سو گئے ہیں۔ تھک گئے ہیں یا بور ہو رہے ہیں۔ لحاظ میں یا میری دل شکنی کے باعث شاید پڑھنے سے منع نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مزید سننا شاید اب ان کے بس میں رہا بھی نہیں۔

میں نے یکا یک پڑھنا بند کر دیا۔ کچھ دیر تو وہ اسی حالت میں رہے میرا یقین پختہ ہو گیا کہ وہ سو رہے ہیں۔ میں آہستگی سے اٹھی۔ ارادہ تھا کہ جا کر پانی پیوں گی اور مجنوں صاحب کو اپنی کسی آہٹ سے چونکنے نہیں دوں گی۔ قالین پر کرسی کھسکانے سے تو کوئی آواز ہوتی نہیں لیکن غیر محسوس طور پر ایسی ضرور کوئی آہٹ ہوئی کہ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں ڈھلکا ہوا سر اپنی سیدھ میں آ گیا۔ میں ڈر کر فوراً کرسی میں دھنس گئی ان کی آنکھیں سرخ اور کسی گہری سوچ میں تھیں۔

''مجنوں صاحب چائے اور دوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چائے کا گھونٹ لیکر بولے۔

''کیا پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہو؟''

جی جی نہیں میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر رُک کیوں گئیں؟'' مجنوں صاحب نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔

ان کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ لیکن میں پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر تھی ساری ہمت جمع کی۔ اور ایک بار سلسلہ پھر شروع کیا۔ اب میں کتاب کے اس حصے پر پہنچ چکی تھی جہاں سلینا کراس جو میرے ناول کی ہیروئن تھی وہ اس کشمکش میں تھی کہ وہ جس ماحول میں قدرتی طور پر اچانک پہنچ گئی تھی اس ماحول میں رچ بس جائے۔ یا چھوڑ دے۔ اٹھ جائے۔ بھاگ جائے اور بالکل مڑ کر نہ دیکھے۔

میرے لئے بھی ناول کا یہ موڑ مشکل تھا کہ میں سلینا کراس کو کدھر لے کر جاؤں۔ وہ رہنا ایک طرف چاہتی تھی۔ چل دوسری طرف رہی تھی۔ اور جانا اسے کسی تیسری سمت تھا۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ میرا قلم خود بھی سلینا کو کوئی راستہ دکھانے سے قاصر تھا۔ سلینا دراصل مغربی معاشرے کی پیداوار تھی۔ وہیں پلی بڑھی لیکن سوچ میں اپنی ماں کے برعکس تھی۔ وہ معاشرے اور طرز زندگی سے مطمئن نہیں تھی کیونکہ اس کا باپ مشرقی تھا اور اپنا دل دماغ اس میں ڈال گیا تھا۔ مگر وہ تو پھر بھی سلینا کراس تھی۔ انور اختر اور گھر کے مختلف

کردار اسے سلینا کراس سے کچھ اور بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ کہہ کچھ بھی نہیں رہے تھے لیکن ان کی تہذیب اور وہ ماحول جس میں سلینا کچھ دنوں کے لیے آ گئی تھی اس کی آوازیں سلینا کا بری طرح پیچھا کرتیں۔ وہ انور کے ساتھ دن بھر رہتی اور رات کو اسے سلا کر جب اپنے کمرے میں آتی تب وہ یسوع مسیح کی اس تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور کمرے میں آنے کے بعد پہلا کام یہی کیا تھا کہ ایک خالی کیل تلاش کر کے تصویر اس پر آویزاں کر دی تھی۔ صبح ضروریات سے فارغ ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ پوری بندگی کے ساتھ دعا مانگتی۔ ''یسوع مسیح مجھے یقین دے۔ استقامت دے کہ میں اپنے فرائض بہتر طور پر انجام دے کر واپس اپنے اسپتال لوٹ جاؤں اور دوسرے تمام مریضوں کی اسی طرح نرس بن جاؤں کہ جیسے یہاں آنے سے پہلے اپنے فرائض انجام دیتی تھی۔'' لیکن اس دعا میں اب وہ زور رہ نہیں گیا تھا۔ وہ دعا مانگنے میں ہچکچانے لگی تھی۔ واپسی کے تصوّر سے اس کا جسم ٹوٹنے لگتا۔ وہ کمزور پڑ جاتی یسوع مسیح سے نظریں چُراتی اور دھیرے دھیرے کمرے سے نکل جاتی۔

وہ ڈیوڈ کو بھولنا چاہتی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا سب سے مضبوط رشتہ تھا ڈیوڈ جو اس کا مستقبل تھا۔ وہ تو انور کے گھر بس جانا چاہتی تھی۔ لیکن چاہنے کا فعل آسان اور غیر اختیاری تھا جبکہ نہ چاہنے اور چلے جانے کا تصوّر جبری تھا اور اسے یہی راستہ چننا تھا۔ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی انور کے گھر کو اپنانے کے تصوّر میں حائل تھی۔ اور غضب تو یہ ہوا کہ ایک دن اس نے اس انگوٹھی کو بیدردی سے اتار کر اپنے سوٹ کیس کے کسی ایک کونے میں رومال سے لپیٹ کر رکھ دیا۔ پھر کئی دن تک وہ یسوع مسیح کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی۔ انگوٹھی تو اس نے پھر نہیں پہنی لیکن وہ اپنے باپ کی بڑی طرفدار بھی نہیں تھی۔ کچھ دن بعد وہ پھر عقیدت کے ساتھ سینے پر صلیب بنا کر آنکھیں موند کے کھڑی ہونے لگی۔ یقین، اعتماد اور ثابت قدم رہنے کی دعا اب بھی اس کے لبوں پر ہوتیں۔ ایسی گھڑی ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کی زندگی میں تواتر کے ساتھ آتی جاتی رہتی۔ وہ معافی

مانگ لیتی اور پھر صلیب بنا کر یسوع مسیح کو راضی کر لیتی۔

اور یہاں سے میرے لئے بھی گزرنا آسان کام نہ تھا کہ میں نے یہ کہانی سلینا کیلئے ضرور لکھی تھی لیکن سلینا اب میری زندگی کی پرچھائیں بن چکی تھی۔ دائیں بائیں اپنے اردگرد اسے چلتے پھرتے دیکھتی۔

مجنوں صاحب بھی یہاں اس مقام پر آ کر بہت سنجیدہ ہو چکے تھے چائے کی پیالی جو پہلے منٹوں میں خالی ہو جاتی اب اسی طرح پڑی ٹھنڈی ہوتی رہتی۔ میں خاموش ہو جاتی تب وہ بھی چونک جاتے اور پیالی منہ سے لگا کر یکدم خالی کر دیتے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ٹھنڈی چائے پئیں۔ پیالی اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھاتی۔ تب وہ دھیمے سے کہتے ''آگے پڑھو''

وہ کہتے کچھ اس طرح کہ جیسے اس میں یہ بات چھپی ہو کہ آگے نہ پڑھو...... وہ آگے کے واقعات سے خوفزدہ تھے۔ کبھی وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیتے۔ کبھی اپنی آنکھیں بند کر کے بے سکت ہو جاتے میں کن انکھیوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی یہ نہیں جان پا رہی تھی کہ مجنوں صاحب کی بے چینی کیوں ہے؟ اور کس لئے ہے۔

صبح سے دوپہر ہو چکی تھی۔ میں اب ایسے مقام پر تھی کہ نہ پڑھنے سے باز آ سکتی تھی نہ آسانی سے جاری رکھ سکتی تھی۔ بس ان کی خواہش کی پابند تھی۔ میں سامنے کی لائین مُنہ سے دہرا رہی تھی اور ذہن اس سوچ میں تھا کہ مجنوں صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔ انہیں میری تحریر میں اس قدر دلچسپی کیوں ہے۔ یہ سوال با آوازِ بلند کرنا کچھ ایسا آسان نہ تھا کہ میرا قد بہت چھوٹا اور وہ بڑے ہی دراز قامت تھے۔

صبح سے اب شام ہو چکی تھی۔ صفحے تمام ہو گئے۔ اب ایک آخری صفحہ میرے ہاتھوں میں بچا تھا۔ مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ سرخ آنکھوں میں خوف' بے بسی' مجبوری' محرومی' یادیں۔ احساس اور آگے جاننے کی تمام تر خواہش رچی بسی تھی۔ میں مجنوں صاحب کی اس کیفیت سے گھبرا رہی تھی۔ میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ایسا کچھ کیوں کر رہے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ یہ سوال بھی بڑا

اہم تھا مجنوں صاحب کا میرے ناول سے کیا رشتہ ہے۔ وہ کس کردار سے قریب اور کس کردار سے دور ہونا چاہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ کیسے جان سکتی تھی اور یہ سب کچھ جاننا بھی ضروری تھا۔ شاید اس پر ہی اس بات کا انحصار بھی تھا کہ مجنوں صاحب کیا میرے ناول کا مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟

آخری صفحہ میرے لئے لکھنا مشکل بھی تھا اور سنانا بھی کہ ہر بار جب میں نے اپنی تحریر دہرائی آنسو میری آنکھوں سے چھلک جاتے۔ میں خود بھی افسردہ ہو جاتی اور میں سوچتی کہ بہت آسان ہے میں سلینا کی ٹرین آگے جانے سے روک دوں۔ اسے اتارلوں مخالف سمت لے جاؤں اس سمت سے کہ جدھر وہ روانہ ہو چکی ہے۔ لیکن ہر بار میں یہ نہ کر پاتی۔ حالانکہ سلینا بھی مجھے منّت کرتی ملتی۔ وہ اپنی صلیب گلے سے اتار دینا چاہتی تھی اور اس کے لئے وہ میری مدد کی طالب تھی۔ مگر میں نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ وہ دور ہوگئی۔ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں جو دور بہت دور جا کر آپس میں مل جاتی ہیں سلینا وہاں تک پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ ٹرین کی دو متوازی پٹریاں کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل پاتیں۔ یہی تو سراب ہے اور سراب میں سلینا گم ہو چکی تھی۔ وہ ایک انجانے مقام کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کا کوئی اتا پتا اس نے اپنے میزبانوں کے پاس نہیں چھوڑا تھا۔

اس بار میں نے گلوگیر آواز کے ساتھ باب ختم کیا اور خاموش ہوگئی۔

مجنوں صاحب پسینے میں شرابور تھے۔ ان کا نحیف سا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھیں بند اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں گتھم گتھا ان کی گود میں تھے۔ انگلیاں ہل رہی تھیں اور وہ سکتے میں تھے یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئی۔

اگر مجنوں صاحب کو کچھ ہو گیا تو...... آگے میں سوچ بھی نہیں پائی۔ پنکھا تیز کر دیا پیالی میں گرم گرم چائے انڈیلی۔ انہیں قدرے زور سے آواز دی۔

مجنوں صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں سرخ اور ذہن کی ہلچل محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں نے جگ سے پانی نکال کر گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے

ہاتھوں سے گلاس تھام لیا اور سارا پانی ایک بار ہی میں پی گئے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نظریں چرا رہی تھی۔ امتحان گزر چکا تھا۔ نتیجے کی صبر آزما گھڑیاں تھیں۔

نہیں۔ ہاں۔ مجھے بار بار یہ دونوں فیصلے خاموش آواز میں سنائی دے رہے تھے کہ یکا یک مجنوں صاحب بولے۔

سلینا کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا وہ منطقی تھا۔ اگر چہ یہ مشکل کام تھا۔

پھر انہوں نے نتیجہ سنایا۔ ''قلم پکڑو اور لکھنا شروع کرو۔''

یہ وہ جملہ تھا جو میری زندگی میں اس وقت بھی اہم تھا اور آج بھی ہے۔ مجنوں صاحب نے بولنا شروع کیا اور میں لکھتی گئی۔

ناول کیا ہوتا ہے؟ دنیا کے بڑے ناول کون کون سے ہیں؟ اور ان ناول کے نسوانی کرداروں کا تذکرہ کیا۔ اور پھر جب اپنے احساسات کا اظہار کیا کہ اس ناول کو سننے کے بعد میں اپنے ماضی میں چلا گیا تھا کہ آج اس عمر میں اس کی بازیافت میرے لئے بڑی خطرناک تھی۔ میں نے اپنی پوری توانائی کو استعمال کیا۔ ''مجھے فوراً پھر اسے بھلا دینا چاہئے''

یہ کہتے کہتے وہ بڑے دکھی لگ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی انسان اپنے ماضی میں جا کر بعض اوقات کتنا کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ کیسا پل ہوتا ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے۔ وہ کون سی کمزوری ہوتی ہے جو برسوں سالوں گزرنے کے بعد بھی آنسوؤں آہوں میں گندھی ملتی ہے۔ جو دل کے کسی کونے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ ہوتی ہے۔ جسے نہ یاد کیا جاسکتا ہے نہ بُھلانے کی سکت ہوتی ہے۔ وہ کرب وہ دکھ وہ احساس انسان کے شریانوں میں سیال مادّہ بن کر گردش کر رہا ہوتا ہے زندگی آگے بڑھ رہی ہوتی ہے لیکن اس کی گردن پیچھے مڑی اس نشانِ راہ کو تک رہی ہوتی ہے جو معدوم بھی ہو چکا ہے لیکن پوری طاقت اور توانائی بن کر زندہ بھی ہے۔ مجنوں صاحب ماضی کی کسی ایسی ہی یاد میں جکڑے جا چکے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ کاش میں اس وقت ان کی ہم عمر اور ان کی دوست ہوتی تو ضرور پوچھتی کیا کوئی سلینا ان کی یاد کا مرکز ہے۔ کیا وہ اتنی اہم تھی جو آج بھی

پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔

میں آج بھی مجنوں صاحب کی وہ کیفیت وہ لمحے وہ دن اور انکا فیصلہ یاد کرتی ہوں تو مجھ پر وہی ساری کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو آج سے تقریباً 33 برس پہلے ایک دوپہر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ میں اپنی یادوں میں مجنوں صاحب کو تازہ رکھتی ہوں۔ اپنے دل میں انہیں عزیز تر مانتی ہوں اور اپنی دعاؤں میں انہیں سرفہرست رکھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا فضل رکھے۔ (آمین)

(10 جون 2005ء، پروگرام بیادِ مجنوں، آرٹس کونسل آف پاکستان)

☆☆☆☆

مادرِ ملّت ــــ فاطمہ جناح

آج مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح کی یوم پیدائش کے سلسلے میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں شرکت کرتے ہوئے مجھے اپنے اسکول میں گزارے ہوئے دن بڑے یاد آرہے ہیں۔ میری ابتدائی تعلیم کے دن وہ تھے جب کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ تمام سیاسی اور بڑی بڑی شخصیات کراچی ہی میں ہوا کرتی تھیں اور میں جس اسکول میں پڑھا کرتی تھی وہ اس شہر کا سب سے جانا پہچانا اور نامی گرامی اسکول تھا۔ جہاں آئے دن ملکی اور غیر ملکی قابلِ ذکر شخصیات آیا کرتیں ہم تقریباً روزانہ ہی گلدستہ تیار کر کے کسی نہ کسی شخصیت کا انتظار کرتے ہوئے۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس تعلیم کے شعبے کی ایک قابلِ احترام اور قابلِ تقلید شخصیت تھیں۔ اسی باعث تعلیم کے ساتھ ساتھ ہماری تربیت کچھ اس طور پر ہو رہی تھی کہ ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے اپنے اندر دیگر خصوصیات بھی پیدا کریں۔ اُن دنوں فاطمہ جناح کی شخصیت کسی پرستان کی پری کی طرح ہمارے دِلوں میں سمائی ہوئی تھی۔ سفید برّاق کپڑے اور سفید بال ان کی شخصیت میں جاذبیّت اور کشش پیدا کئے ہوئے تھے اور ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم کسی نہ کسی طور پر ان سے بھی ملیں۔ ہوا یوں کہ ہم گرلز گائیڈ میں شریک کر لئے گئے چند ہی دنوں بعد قائداعظم کی برسی تھی اور ہماری ٹیچر نے ہمیں بتایا کہ 11 ستمبر کو ہمیں فاطمہ جناح کے گھر جانا ہے جہاں قرآن خوانی ہے۔ اور ہم قائد کے مزار پر پھول چڑھانے کے بعد قرآن خوانی میں شریک ہوں گے۔ میرے دل کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ وہ دن قائد کی برسی کا دن تھا جس دن پہلی بار میں اپنی ساتھی

طالبات کے ساتھ لائن میں کھڑی فاطمہ جناح کو اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ یہ دن میری زندگی کا ایک نا قابل فراموش دن تھا۔ فاطمہ جناح ایک مقام پر خاموش اور اداس کھڑی تھیں۔ ان کا دایاں ہاتھ مستقل آگے تھا لائن میں لگے لوگ آہستہ آہستہ بڑھتے ان تک جاتے اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ وہ ہر آنیوالے سے گویا ہاتھ ملا رہی تھیں۔ میری باری ابھی بہت دور تھی اور میں ایک ایک قدم جس شوق، فخر اور نا قابلِ یقین احساس سے اٹھا رہی تھی آج بھی اس کی شدّت میں پوری طرح محسوس کر سکتی ہوں۔ میری باری آئی۔ دل کی دھڑکن انتہائی تیز تھی۔ میں نے اپنے پیشرو لوگوں کی طرح اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھُو لیا۔ اس لمحے میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا قد بڑا ہوگیا ہے۔ میں بڑی نامور ہوگئی ہوں میرے اندر حوصلہ اور مردانگی سرایت کر گئی ہے اور یہ کہ میں اپنے ملک اور قوم کیلئے بڑے بڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا کر چکی ہوں۔ گویا میں بھی پاکستان کی سپاہی بن چکی ہوں وہ نرم و نازک اور ٹھنڈا ٹھنڈا ہاتھ اور اس کا لمس مجھ میں جادو سا بھر گیا ہے۔ آنیوالوں کا استقبال ختم ہوا اور عین ہمارے سامنے فاطمہ جناح تحریکِ پاکستان کی نمایاں خواتین کے ساتھ لائن میں بیٹھ گئیں۔ ان کی گود میں انگریزی زبان میں ترجمہ شدہ قرآن تھا وہ دھیرے دھیرے اسے پڑھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ کر کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں سپارہ کم پڑھ رہی تھی اور ان کی طرف توجہ زیادہ تھی۔ مجھے وہ آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھیں۔ سفید پھیلا ہوا دوپٹہ، سفید بال، سفید لباس اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا۔ یہ فاطمہ جناح تھیں۔ میں نے کسی کتاب میں قائداعظم کا یہ جملہ پڑھ رکھا تھا کہ ''میری سیاست میں کامیابی کا انحصار میرے ٹائپ رائٹر اور فاطمہ جناح کی ذات کا ہے۔''

ٹائپ رائٹر جو جلدی جلدی چلتا ہے اور فاطمہ جناح جو چپ اور ٹھہراؤ کا بے پناہ اظہار تھیں۔ ان دونوں کی مماثلت کا مجھے بہت بعد میں احساس ہوا۔

پھر ہر سال 11 ستمبر کا انتظار رہتا۔ اور یوں پانچ سال لگاتار میں ان کے گھر جاتی

رہی ہاتھ ملاتی اور سال بھر کیلئے ان کا لمس اپنے اندر محفوظ کر لیتی۔ ان کو قرآن پڑھتا دیکھتی اور آنکھوں سے ٹپکتے ان موتی کے قطروں کو گرتے دیکھتی اور آئندہ سال پھر آنے کے عہد کے ساتھ واپس آ جاتی۔ اور ان پانچ سالوں میں، میں نے ان کی ذات کے سحر میں مدہوش ہو کر تحریک پاکستان سے متعلق تقریباً ہر تحریر کو پڑھ ڈالا۔ جہاں سے ملی جس طرح ملی بس یہی میرا جنون بن گیا۔ اور جب میں نے یونیورسٹی کی تعلیم کو خیر باد کہا فاطمہ جناح نے بھی پاکستان کی سرزمین سے اپنا تبادلہ خُلد میں کرا لیا۔

میں نے جس قدر بھی ان کے بارے میں جانا وہ بس اتنا تھا کہ وہ کوئی سیاست دان نہ تھیں اور نہ ہی وہ اس کا شوق رکھتی تھیں۔ وہ تقریبات میں شرکت کرتیں۔ عزیزوں کے گھر جاتیں۔ دوستوں سے خوش گپیاں کرتیں۔ گھر کی بنی چٹنی اچار کی شیشیاں خاندان کی عورتوں تک پہنچاتیں' باغبانی کرتیں' کچن سنبھالتیں' روٹی بھی پکاتیں' سودا سلف خود خریدنے بھی چلی جاتیں۔ کپڑے خریدتیں گھر پر درزی کو بلا کر سلواتیں۔ غرضیکہ کوئی بھی گھریلو کام کرنے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ قوم کی حالت بھی جانتی تھیں۔ قوم کے سدھار کی فکر کرتیں۔ اپنے پیغام میں وہ نوجوانوں کو جذبہ دیتیں جرأت اور سچائی سکھاتیں۔ وہ ایک بھرپور عورت تھیں۔ اپنے بھائی کو سیاست میں گھرا دیکھ کر انہوں نے ان کی دیکھ بھال کی اور انہیں چاق و چوبند رکھنے کے تمام جتن کیئے۔ وہ چونکہ اپنے بھائی کے گرد گردش کرتی تھیں یوں ان کا سامنا سیاست سے ہو گیا۔ انہوں نے ساری زندگی براہِ راست کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا کیونکہ ان کے بھائی نے سیاست کو اپنے خاندان کی میراث بننے ہی نہیں دیا۔ سیاست سے ملاقات تو اب بالواسطہ ہی رہی اور سیاست بھی کیسی جس میں سچائی' ایمانداری' راست گوئی' ہمت' جرأت' مقابلہ اور ٹکرا جانے' مقصد کے حصول کا عزم کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ انہوں نے سارے جراثیم کو اپنے اندر اتار لیا۔ جب بھائی موجود تھا تب وہ ان تمام عناصر کی مدد لیکر بھائی کیلئے ہمت کا مینارہ بنی رہیں اور جب بھائی نہیں رہا تو یہ جراثیم اس کے بنائے ہوئے ملک میں ڈھونڈنے نکلیں۔ مگر اس کا فقدان

پایا۔ اور کئی بار تو ایسا ہوا کہ جراثیم ڈھونڈے بھی نہ ملے تب سال میں پانچ مواقع پر اپنے نحیف گلے سے چیخ چیخ کر اعلان کیا کہ پاکستانیو اپنا راستہ نہ بدلو۔ اپنے قائد کے افکار کو اپنا ایمان بنا لو کہ تم جس راہ پر چل نکلے ہو وہ بدخواہوں کی راہ ہے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ جمہوریت کی میز پر بیٹھ کر بننے والا پاکستان لفظ جمہوریت سے ہی ناآشنا ہو گیا ہے تب انہوں نے اپنے بوڑھے اور نحیف جسم میں قائد کے ایمان سے نئی روح ڈالی اور ملک کے دونوں حصوں کے بے پناہ دورے کئے۔ بارہ کروڑ عوام نے ان کی پذیرائی کی انہیں قائدِ حزبِ اختلاف کا باعزّت عہدہ دیا کہ وہ جمہوریت کی بقا کا نشان بن گئیں انہوں نے ایسے میں وہ مجاہدانہ کردار ادا کیا جو نہ صرف پاکستانی خواتین بلکہ خود پاکستان کی تاریخ کا درخشاں باب بن گیا۔ وہ عہد آفرین دور کی نمائندہ اور تاریخ ساز شخصیت کہلائیں۔

نظم و ضبط اوقاتِ کار کی پابند۔ حق و صداقت کی علمبردار بن کر اندھیری راتوں کو صبح کے اجالوں میں بدل دینے والی عظیم خاتون ٹھہریں۔ جب پاکستان کا حقیقی مقصد غلط بتایا جانے لگا تو فاطمہ جناح نے برملا ٹوکا۔ کہا نہیں پاکستان کا مقصد یہ نہیں بلکہ یہ ہے انہوں نے اپنے عوام سے کہا کہ اپنے قائد سے غدّاری نہ کرو اپنے پاکستان سے وفا کرو۔ پاکستان کی طویل جدوجہد کو نہ بھلاؤ۔ یاد رکھو سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو اس کے بعد آنیوالے سرسیّدؒ مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں کو اقبالؒ نشترؒ لیاقت اور ان گمنام مجاہدوں اور شہیدوں کو کہ وہ تمہارے محسن تھے تمہارے محسن ہیں۔

وہ اپنی عمر کے آخری حصّے میں جب اعضاء شل ہو جاتے ہیں اور ہمّت جواب دے جاتی ہے تب وہ پیرانہ سالی میں قائد کے اس قول کی تائید کر رہی تھیں۔

''میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کر توانائی کا آخری اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کردوں گا اور جب وہ بھی ختم ہو جائے گا تب میرا کام مکمل ہو جائے گا۔''

قائد کا کام پاکستان کے قیام کے بعد ختم ہو گیا تب مادرِ ملّت کا کام شروع ہوا۔ بقاء

کی جنگ تو ہمیشہ ماں ہی لڑتی ہے اور اس کی تکلیف کا اندازہ تو اسے ہی ہوتا ہے نہ جانے وہ کیسے کیسے صبر آزما مقام سے گزری ہوں گی لیکن تب ہی تو لعل و گہر بھی پیدا ہوتے ہیں اور اگر فوری پیدا نہیں ہوتے تو پیدا ہونے کی اُمّید تو جنم لے ہی لیتی ہے۔ فاطمہ جناح نے اُمید کی وہ جوت اور لگن کی وہ تڑپ تو پیدا کر ہی دی ہے جو آج تک لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی بنی ہوئی ہے اور چند سر پھرے تو پیدا کر ہی دیئے ہیں جو سر سے کفن باندھے حق کے راستے کے شہید بننے کے آرزومند رہتے ہیں۔

اقبال نے طرابلس کی جنگ میں زخمیوں کو پانی پلانے والی ایک لڑکی پر اپنی معرکتہ الآرا نظم لکھی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اقبال کے باطن میں ایک اور بھی فاطمہ تھی جو پاکستان کی بقاء کی جنگ میں شہید ہوتی ہوئی جمہوریت کو زندہ رکھنے کی لگن میں ادھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ اور اقبال کہہ رہے تھے۔

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

کیا فاطمہ جناح کی تربت پر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ہم اقبال کے یہ الفاظ نہیں دہرا سکتے۔

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

(31 جولائی 2005ء فرزندانِ پاکستان کی تقریب میں پڑھا گیا جو آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہوئی۔)

☆☆☆☆

نامی گرامی — حمید نظامی

میں نے ہمیشہ ایسے لوگوں پر رشک کیا ہے جو مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گئے ہیں۔ ان کیلئے بار بار محفلیں منعقد کی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں ان کے دوستوں نے اور ساتھیوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی ہیں۔ اور جب ان کے جاننے والے بھی دنیا میں نہ رہے تو آنیوالوں نے ان کا کام سنبھال لیا۔ انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اپنے وقت کے بڑے آدمی تھے۔ وقت کی گرفت ان کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے مردانہ وار مشکل وقت سے مقابلہ کیا۔ کسی مقصد کے حصول کیلئے جان کی بازی لگا دی۔ قول کے پکّے ثابت ہوئے۔ مشکل وقت میں دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے رہے۔ حق گوئی و بیباکی کی مثال بن گئے۔ کسی تحریک سے وابستہ ہوئے تو اس کے حصول کے لیے تن من دھن سے جُت گئے۔ بڑے مقصد کے حصول کیلئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے رہے۔ اپنے مفاد سے دامن بچایا اور اپنے نظریئے پر مرمٹ گئے۔

ایسے کئی لوگوں پر اکثر بولنے اور لکھنے کا موقع ملا اور آج بھی ایک ایسی ہی تقریب میں شریک ہوں۔ یہاں بھی ایک ایسے ہی شخص کی یاد منائی جا رہی ہے جس نے اپنی ابتدائی زندگی ہی میں کسی ایک مقصد کو اپنا مقصد بنالیا۔ کسی ایک نظریئے کو اپنایا۔ کسی ایک شخص کو اپنا رول ماڈل بنالیا اور پھر یہ نہ سوچا کہ اپنے مقصد اپنے نظریئے اپنے من چاہے شخص کے نقشِ قدم پر چل کر زندگی کتنی دشوار ہو جائے گی۔

زندگی میں راستے تو ہمیشہ دو ہی ہوتے ہیں۔ ایک سیدھا سادھا مگر بے مقصد۔ دوسرا

دشوار گزار اور بامقصد۔ پہلا راستہ چُننے والے اپنی زندگی میں زندہ رہتے ہیں۔اپنے گھر والوں کے ساتھ اور آسانیاں سمیٹ کر بس یونہی جی کر وقت گزار دیتے ہیں۔ایک وقت وہ آتا ہے کہ موت سے جا ملتے ہیں اور ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔لیکن دوسرے راستے پر چلنے والے لحہ لحہ' قدم قدم اس رہگزار پر کانٹوں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔لیکن جب انہیں موت کا سامنا ہوتا ہے تب وہ اپنا ظاہری بدن تو موت کے فرشتے کو پیش کر دیتے ہیں لیکن اپنا کام اور اپنا نام دنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے کیلئے چھوڑ جاتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں ایک وہ بھی شخص ہے جو تاریخ کے ایک نازک موڑ پر پیدا ہوا اور اپنے لیے وہ راہ چنی جو تحریک پاکستان سے جا ملتی ہے۔اس کی خوش نصیبی یہ بھی رہی کہ وہ 23 مارچ 1940 کے اس اجلاس میں بھی شرکت کرتا ہے جسے مسلمانان ہند نے پاکستان کے حصول کیلئے ایک قرار داد کی صورت منعقد کی تھی اُس دور میں بھی آج کی طرح ہزاروں طالبعلم تھے اور انہوں نے بھی پاکستان کیلئے نعرے لگائے اور دل سے چاہا کہ ایک نیا ملک مسلمانوں کیلئے بن جائے لیکن ان کی راہیں آسودہ تھیں لیکن ایک طالبعلم اُن میں سے ایسا بھی تھا جس کے دل میں تڑپ اپنے ساتھیوں سے زیادہ تھی۔اور اس نے وہ راہ چنی جو اس کے دل کی تڑپ اور مقصد کے حصول کی راہ تھی اس نے قائداعظم اور علاّمہ اقبال کو اپنا رول ماڈل بنایا اور ان شخصیات کی خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کی۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

سچ کی کڑوی گولی لیے اس نے اپنے قلم کو صحافت کیلئے وقف کر دیا اس تاریخی دن اس کے سینے میں دل نہ جانے کیسے کیسے دھڑکا ہوگا اس پر کیا کیا نہ کیفیت طاری ہوئی ہوگی۔اس نے نہ جانے کتنی اعصابی جنگ لڑی ہوگی کہ وقت کی نوا کو دل کی دھڑکن بنا بیٹھا نوائے وقت کا آغاز کر گزرا یہ قسم کھا کر کہ ہر جھوٹ' ہر فریب کا مقابلہ کیا جائے گا۔ بڑے بڑے بُتوں سے ٹکرانے کا عزم' بڑے بڑے جھوٹ کو جھٹلانے کا تہیہ کیا ہوگا۔قائد کے

اس پیغام کو سامنے رکھ کر اس نے اردو کا ایک بڑا اور زندہ رہنے والا اخبار نکالا کہ ''اردو کی خدمت قوم کی خدمت ہے۔''

اُس دور میں کانگریسی اخبارات کی روش قرار دادِ پاکستان کی مخالف تھی۔ جو ظاہر ہے تحریکِ پاکستان کی نفی کرتی تھی لیکن اس شخص نے اپنی مقصدیت کو تحریکِ پاکستان سے وابستہ کر کے مولانا محمد علی جوہر کی یاد تازہ کر دی۔ اور اسلامی مملکت کے قیام کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی قسم کھا بیٹھا۔ پھر تو اس کی زندگی میں آسان لمحے ناپید ہو گئے۔ مشکل راہیں۔ طرح طرح کے چیلنج، چیختے چلاّتے دور، جیل کی سلاخیں اور سچ کا زہر ہر لحہ اس کے گرد موجود رہا۔ لیکن جب بھی کوئی فرد بڑے مقصد کا بیڑا اٹھاتا ہے تو اس کے لئے پھر یہ ساری دشواریاں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ جنون غالب آ جاتا ہے۔ اور وہ مقصد کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے۔ ایسے میں تحریر اور تقریر دو ایسے جوہر ہیں کہ جن سے کام لیکر جوش، جذبہ، عمل، ہمّت اور جرأت پیدا ہوتی ہے۔ بڑے لوگ ان ہی دو خوبیوں کا مرکّب ہوتے ہیں۔ قائداعظم کو لے لیجئے، علامہ اقبال کو دیکھئے، مولانا محمد علی جوہر کا نام لیجئے، نواب بہادر یار جنگ کو یاد کیجئے، یا مولانا ظفر علی خان کے کارنامے پر نظر ڈالئے۔ ان ہی دو قوّتوں یا خوبیوں کا سہارا لیکر وہ لوگ اپنی قوم کے رہنما بن گئے۔ ایسے میں طالبعلموں کی قوت سے انکار ممکن نہیں کہ نوجوان ہی کسی تحریک کے روحِ رواں ہو سکتے ہیں کہ ان کے جسم میں تازہ خون اور جوان حوصلہ ہوتا ہے۔ یہی سوچ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا آغاز ہے۔ طالبعلموں کی ایک ایسی تنظیم کہ وہ وقت کی پکار کو لیکر چلے کہ جو اس وقت کی سب سے بڑی پکار تھی۔ یعنی تحریکِ پاکستان اور بعد میں استحکام پاکستان میں یہ بات اس لئے بھی یہاں کہہ رہی ہوں کہ یہ جلسہ بھی نوجوانوں اور طالبعلموں کا ہی ہے۔ اُن طالبعلموں کیلئے یہ تقریب منعقد کی گئی ہے۔ جنہوں نے کتاب کا سہارا لیا ہے اور اپنا سبق یاد کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن میں ایک استاد ہونے کے ناطے ہمیشہ اسے آدھی کامیابی کہتی ہوں۔

اگر آپ نے عملی زندگی میں اس کتاب کے حروف کو تحریر' تقریر اور مقصد کے روپ میں نہ ڈھالا تو جان لیجئے کہ آپ ان گمنام نوجوانوں میں سے ایک ہوں گے کہ جنہیں بعد میں کوئی بھی یاد نہ رکھے گا۔ آپ اپنی زندگی میں مقصد کو پہچانیں۔ اپنا رول ماڈل تلاش کریں اور اپنی ایک راہ کا انتخاب کریں اور دیوانہ وار اس راہ پر چل پڑیں۔

آج کی یہ تقریب جس شخص کے نام سے منسوب ہے اسے زندگی کے صرف 45 یا 46 سال ہی ملے مگر اس نے کتاب سے حاصل کئے ہوئے اپنے سبق کو یاد رکھا۔ تحریر' تقریر اور مقصد سے پوری طرح واقف ہوا۔ اپنے لئے صحافت کی راہ چُنی۔ اس پر دیوانہ وار دوڑتا رہا دوڑتا رہا۔ قلم کا ہتھیار لئے۔ سوچ کا خزانہ لیے۔ ہمّت کا پہاڑ لئے اور اس نے پھر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے سچ کا زہر پیا اور امر ہوگیا۔ ہاں میں ایسے ہی لوگوں پر ہمیشہ رشک کرتی ہوں۔ اور آج اس تقریب میں شریک ہو کر اپنے دو فرائض پورے کر رہی ہوں ایک تو یہ کہ اپنے نوجوان طالبعلموں کو ایسے لوگوں سے متعارف کراؤں اور دوسرے یہ کہ ایسے شخص کو خراجِ عقیدت پیش کروں کہ جس کا نام حمید نظامی ہے۔''

(تقریب 28 نومبر 2005 بمقام کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کلب گلشن اقبال کراچی)

☆☆☆☆

دوست جو ابھی مرانہیں......

آج سے پچیس سال پہلے میں نے پہلی انگریزی فلم The Cranes are flying دیکھی تھی آج بھی یاد ہے یہ فلم مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں اپنے ہر اچھے اور بُرے جذبے کو صرف ایک شخص سے Share کیا کرتی۔ اس شام جب وہ میرے گھر آئے میں نے بے تکان فلم پر تبصرہ شروع کر دیا۔ ہمیشہ یہ ہوتا کہ میں بولے جاتی اور وہ چپ چاپ پان چباتے ہوئے میری تمام باتوں کو انتہائی غیر اہم انداز کے ساتھ سنتے جاتے۔ میں چڑ جاتی۔''آپ سے میں کچھ کہہ رہی ہوں۔''

وہ اطمینان سے جواب دیتے۔ میں سن رہا ہوں۔

اور جب میں ان سے پوچھتی آپ نے کیا سنا۔ تب وہ مجھے لفظ بہ لفظ وہی کچھ بتادیتے جو انہوں نے انتہائی بے توجہی سے سنا تھا۔

یہ فلم مجھے آج تک یاد تھی جبکہ اس کے بعد دیکھی ہوئی بے شمار فلموں کے نام تک میں بھول چکی تھی۔

PTN پر جب انگریزی فلموں کا سلسلہ شروع ہوا تب میں نے اپنے بیٹے سے اس فلم کا تذکرہ کیا۔ لیکن مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ یہ فلم میں پھر کبھی دیکھ پاؤں گی۔ لیکن اُس رات جب اسکرین پر اس فلم کا اشتہار آیا تب میرے بیٹے نے با آواز بلند مجھے کچن سے بلا کر بتایا کہ کل یہ فلم ٹی وی پر دکھائی جائے گی۔ میرے ذہن میں 25 سال پہلے والا سین گھوم گیا۔ وہی مخصوص صوفہ جس پر وہ بیٹھا کرتے سامنے میز پر چائے کی پیالی' مقابل

والے صوفے پر میں بیٹھی انہیں فلم کی کہانی سنا رہی تھی۔

وقت سرک چکا تھا۔ نہ وہ گھر تھا نہ وہ صوفہ نہ درمیان کی میز نہ چائے کی پیالی۔ اب میں احمق لڑکی کے بجائے 14 سالہ بیٹے کی ماں تھی اور وہ بھی شاید کئی بچوں کے باپ تھے۔ وہ ملک سے دور تھے اور میں میکے سے سسرال آ چکی تھی۔ فاصلہ ناظم آباد سے کلفٹن تک کا تھا۔

رات کے پروگرام میں بستر میں بیٹھ کر نثار کے ساتھ دیکھا کرتی ہوں۔ اب مجھے فلم سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں ان گھنٹوں میں میری نٹنگ ہو جاتی ہے ساتھ ساتھ نثار سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ بچوں کی تعلیم، گھریلو مسائل، دفتر کے قصّے کالج کی باتیں، دوست احباب کے تذکرے، ماضی کی یادیں، مستقبل کے ارادے، ان تذکروں کیلئے ہمیں یہ وقت بہت مناسب محسوس ہوتا ہے۔ اس روز بھی یہی معمول تھا۔ میں پورے اہتمام سے یہ فلم دیکھنے یا باتیں کرنے بیٹھی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے کہنے والا اٹک اٹک کر ان کے انتقال کی خبر سنا رہا تھا۔ وہی فلم شروع ہو چکی تھی جسے میں نے انہیں سناتے ہوئے کئی بار یہ یقین کیا تھا کہ وہ سن بھی رہے ہیں یا نہیں وہ بے توجہی سے سنتے ہوئے بھی پوری طرح سنتے اور پھر مجھے سنا کر حیران کر دیا کرتے فلم شروع ہو چکی تھی مگر ان کی زندگی کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھوں سے نٹنگ چھوٹ گئی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ نظریں اسکرین پر تھیں۔ کردار آ رہے تھے جا رہے تھے مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے سامنے وہ مخصوص صوفہ تھا۔ سامنے کی میز پر چائے کی پیالی۔ نثار نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ اور بہ مشکل مجھ سے کہلا سکے کہ وہ انتقال کر گئے۔ اب نثار چپکے چپکے رو رہے تھے۔ انہیں میرے ہر دوست سے محبت ہو جاتی اور میرا ہر دوست ان کا دوست بن جاتا وہ یہ جانتے تھے کہ میرے ذہن میں ان کی ٹھنڈی میٹھی یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ وہ ان کا ذکر سنتے۔ پوری توجہ سے سنتے۔ اور میرے جذبات کی شدّت کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش بھی کرتے۔ مجھے ان سے کبھی نہیں پوچھنا پڑتا کہ آپ سن رہے ہیں نا۔ کیونکہ وہ پوری توجہ

سے میری ساری یادوں کو اپنے ذہن میں منتقل کرنے پر آمادہ رہتے۔ میری نظریں اب بھی اسکرین پر تھیں حالانکہ ٹی وی اب بند تھا مجھے ساکت دیکھ کر نثار نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے جذبے کو سمجھ رہے تھے۔ میری کیفیت سے آگاہ تھے۔ مجھے صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ حالانکہ میں تو رو بھی نہیں رہی تھی۔ کچھ بولو بولو تم' نثار گھبرا گئے۔

اور پھر میں نے بے تکان بولنا شروع کر دیا۔

ان سے میری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے بہت سینئر تھے۔ میں فرسٹ ایئر آنرز کی طالبہ تھی۔ فراک اور دو چوٹی میں شاید میں اپنی عمر سے بھی کم لگتی تھی سفید کپڑے اور سفید ربن مجھے نمایاں کرتے۔ مجھے ان سے کبھی ملنے یا بات کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی لیکن ایک دن انہوں نے خود ہی مجھے مخاطب کر لیا۔

''ڈھائی روپئے دو اور یہ ناول خرید لو''

''زبردستی ہے'' میں نے اوپر سے نیچے تک انہیں دیکھ کر خفگی سے کہا۔

مگر اتنی دیر میں کتاب میرے ہاتھ میں تھمائی جا چکی تھی۔

'' کچھ جلوے کچھ طور'' یہ ان کا ناول تھا۔

''فروخت کا اچھا طریقہ ہے'' میں نے طنز سے کہا۔

''بہت اچھا'' انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں ایک غریب طالبعلم ہوں شام میں نوکری کرتا ہوں۔ دن میں پڑھتا ہوں رات میں لکھتا ہوں۔ میں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ شاعری بھی کر لیتا ہوں مگر چھپواتا نہیں۔ یہ میرا پہلا ناول ہے۔ مجھے معلوم ہے تم بچوں کی کہانیاں لکھتی ہو میرا ناول کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ معاشیات پڑھنے سے وقت ملے تو پڑھ لینا۔ پھر بتانا کیسا لگا۔ ہاں سنو' اعزازی کاپی دینا میرے بس سے باہر ہے۔ ایک ہی سانس میں انہوں نے یہ سب کچھ کہہ دیا۔

''پیسے کل دوں گی۔ آج نہیں ہیں میرے پاس۔''

لیکن وہ کل بہت دن بعد آئی کیونکہ وہ خود کئی دن بعد نظر آئے۔ اور میں نے کتاب سے ایک ایک روپے کے تین نوٹ نکال کر انہیں پکڑا دیئے۔

''آٹھ آنے پھر واپس کروں گا'' مگر یہ بتاؤ پسند بھی آئی۔

''مجھے پسند آئی''

کچھ سمجھ میں بھی آئی۔ بچوں کے صفحے میں لکھنے والی نونہال۔

انہوں نے گویا میرا انداق اڑایا۔

لیکن اتنے سارے لوگوں میں سے صرف مجھے ہی کیوں دی گئی۔ میں نے سوال بھی کیا اور اپنی اہمیّت بھی جتائی۔

''ہاں یہ تو سوچنے کی بات ہے۔ سوچ کر جواب دوں گا۔ وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے میں نے بقیہ آٹھ آنے ان سے واپس نہیں مانگے لیکن ہر بار اپنا نیا افسانہ دیتے ہوئے یہ کہتے تمہارے آٹھ آنے کا میں مقروض ہوں۔

جب افسانہ پڑھ کر میں انہیں واپس کرتی وہ جواب دیتے۔ رکھ لو اپنے پاس ایک ساتھ لے لوں گا۔ دراصل میں اپنی تحریر بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتا۔ یوں میں ان کے افسانوں کا بینک بن گئی۔ وہ جو کچھ لکھتے میرے پاس جمع ہوتا رہتا۔ میں نے کئی بار انہیں یقین بھی دلایا کہ وہ اچھا لکھتے ہیں۔

شعبے کے سالانہ فنکشن میں انہوں نے ایک خوبصورت ڈرامہ لکھا۔ اور جب اسے اسٹیج کرنے کا وقت آیا تب ایک کردار میں نے بھی کیا۔ یہ ان کا مجھ پر جبر بھی تھا۔ دوستی پکی ہوچکی تھی۔ وہ ایم اے کا سال مکمل کرکے یونیورسٹی چھوڑ گئے۔ میں انہیں بھولی بھی نہیں اور انہیں یاد بھی نہیں کیا۔ کئی سال گزر گئے۔ اور جب میں نے ایم اے کرلیا۔ تب شعبے کی معرفت مجھے مبارکباد کی ایک مختصر سی تحریر ملی۔

''نونہال ایم اے مبارک''

اس وقت تک میں بڑی ہوچکی تھی۔ فیشن سے فراک غائب اور دو چوٹیاں بھی مسترد

ہو چکی تھیں۔ اب میں اپنی عمر کے مطابق نظر آتی۔ بچوں کے صفحے میں اب بھی لکھتی لیکن افسانے بھی لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ نونہال کا خطاب اب مجھ پر بالکل بھی نہیں جچتا تھا لیکن ہاں بہت سی مبارک بادوں میں ان کی یہ مبارک باد مجھے بہت اہم اور اچھی لگی۔ اور اسی لئے جب گرو مندر پر اچانک وہ مجھے نظر آئے تو میں لپک کر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ گھر آ گئے اور پھر میرے گھر والوں سے بے تکلّف ہو گئے۔ اب وہ مجھے نونہال نہیں کہتے بلکہ میرے گھریلو نام 'مُنّی' کہہ کر پکارنے لگے۔ جس میں کچھ ہی عرصے بعد دادی کا اضافہ ہو گیا۔ ایک دن اچانک انہوں نے مجھ میں اپنی دادی کا چہرہ دیکھا۔ کہا اگر میری دادی ہوتیں تو بالکل تمہاری طرح ہوتیں۔ میں مُنّی دادی بن چکی تھی۔ پھر ہم نے ملکر بہت ساری کتابیں پڑھیں تبصرے کئے۔ افسانے لکھے' ڈرامے لکھے' میں نے مزید ایم اے کئے اور انہوں نے افسانے چھوڑ کر شاعری شروع کر دی۔ وہ پُرزوں پر اشعار لکھتے اور یوں ہی پھینک کر چلے جاتے۔ جنہیں میں چن چن کر رکھ لیا کرتی۔ اور ایک دن انہیں پتہ چلا کہ میرے پاس تو ان کا مجموعۂ کلام مرتّب ہو چکا ہے جبکہ خود ان کے پاس ایک شعر بھی محفوظ نہ تھا۔ اس دن مجھے ایک اور خطاب ملا۔ اب میں مُنّی دادی سے ''کباڑن'' بن چکی تھی۔ میں نے اس نام پر تھوڑا سا احتجاج بھی کیا مگر میری ایک نہ چلی اور مجھے قائل کر لیا گیا کہ میں واقعی اپنے اندر کباڑیئے کی تمام خصوصیات رکھتی ہوں۔

اسی عرصے میں مجھے انہیں جاننے کا موقع ملا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ حسّاس انسان ہیں۔ ہمدرد بھی ہیں۔ دوسروں کے کام آتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں اپنی رائے رکھتے ہیں اور اس رائے کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتے۔ چہرے پہچانتے ہیں اور پہچان پر ناز بھی کرتے ہیں۔ ہر ایک سے بے تکلّف نہیں ہوتے۔ اور اگر ہو جاتے ہیں تو وہ ان کا پکّا دوست بن جاتا ہے۔ مگر دوست بنانے میں وہ بے حد کنجوس ہیں۔ ان کے پاس دُکھ کم ہیں لیکن اپنے لئے دکھ خرید لینے پر وہ ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہیں۔ مزاج میں شگفتگی ہے۔ شوخی بھی' گفتگو میں مذاق بھی کرتے ہیں لیکن تنہائی میں اذیّت پسند ہیں۔ اپنی ذات کو دُکھ کے

حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اذیّت کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔ بہتر زندگی گزارنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کے لئے کسی سمجھوتے پر کسی سے تیار نہیں۔ ان کے پرستار ہیں اس کے بدلے میں بڑی سے بڑی رعایت لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تحریر کی قوت سے بھرپور ہیں۔ مگر لاابالی بھی ہیں۔

افسانے اس لئے لکھنے شروع کئے کہ چھپنے کیلئے زیادہ جگہ ملتی ہے۔ شاعری مختصر جگہ گھیرتی ہے۔ یہ الگ بات کہ شاعری کرنا پسند ہے۔ اور شعر کہنے پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں۔

اسی عرصے میں ایک دن انہوں نے اعلان کر دیا کہ میں اب تھوڑی بہت بڑی ہوگئی ہوں اور یوں انہوں نے مجھے اہمیّت دینی شروع کر دی۔ اب وہ مجھ سے سنجیدہ مسائل پر گفتگو کر لیتے۔ سیاست' ادب اور صحافت پر بحث انہیں اچھی لگتی۔ لیکن جب میں نے صحافت اپنائی تو انہیں بالکل اچھا نہیں لگا میں نے ان کی ناپسندیدگی کی بالکل پروانہیں کی انہوں نے بارہا اصرار کیا یہ پیشہ تمہارے لئے مناسب نہیں۔ اور جب ان کا اصرار دم توڑ گیا تب میں نے آپ ہی آپ صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور معلّمی اپنالی۔ اب ایک اور خطاب ملا۔ مجھے پروفیسر کے نام سے پکارنے لگے تمام خطاب کی طرح میں نے اسے بھی بے چوُن و چرا قبول کرلیا۔

ایک دن انہوں نے کہا۔

پروفیسر مجھے تم سے بات کر کے مزا آتا ہے کیونکہ تمہارا موڈ اللہ میاں نے بڑی فرصت سے بنایا ہے۔ مگر سنو تم بہت اچھی ہو۔ تمہاری وجہ سے زندگی میں وہی کیفیت ہے جو مرچ سے کھانے میں پیدا ہوتی ہے۔ بس تم ذرا تیز قسم کی مرچ ہو۔ اور اس دن میں ان سے ناراض ہوگئی۔ وہ میرے گھر آتے' سب سے ملتے بات کرتے' میرے چہرے پر ناراضگی کے اثرات دیکھتے اور چلے جاتے۔

پھر ایک دن آپ ہی آپ کھلکھلا پڑے۔ میں مزید خفا ہو کر سامنے سے ہٹ گئی جب وہ واپس گئے تو میز پر پرچہ پڑا تھا۔

''آثارِ قدیمہ'' ہاں یہ تمہارا نیا نام ہے۔ آج تمہارا چہرہ بالکل آثارِ قدیمہ کی طرح اجاڑ اور بے نشان لگ رہا تھا۔ اور تم مزاجاً بھی آثارِ قدیمہ ہو' پرانی باتیں' پرانی یادیں' پرانی کتابیں' کباڑن کہیں کی۔

اپریل 1969ء کا لکھا ہوا یہ پرزہ بھی میرے کباڑ خانے میں محفوظ ہو گیا۔ اور میں نے ساری خفگی ختم کر ڈالی۔ اور ایک دن وہ نہ جانے کس موڈ میں تھے بولے نہیں کاغذ پر لکھ کر یہ تحریر میری طرف بڑھا دی۔

''مُنّی دادی میں نے تمہیں اپنی اولاد کی طرح چاہا ہے۔ اور تم سے کبھی کسی دور میں بدظنی محسوس نہیں کی۔ تم سے مجھے وہی آس ہے جو بڑھاپے میں اولاد سے ہوتی ہے۔ میری آس کبھی نہیں توڑنا۔ بڑھاپے کی آس کی اولاد سعید ہوگی اور باعثِ وقار ہوگی۔ کیا تم میرا یہ مان رکھوگی؟''

اور ہمیشہ کی طرح کوئی جواب دیے بغیر یہ پرزہ بھی میرے کباڑ خانے کی زینت بن گیا۔

پھر ایک دن جب وہ میرے گھر آئے تو شب بارات تھی۔ میرا روزہ تھا ململ کے بڑے سے دوپٹے میں سر تک لپٹا اور جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر وہ ہنسنے لگے ''کیا مانگ لیا اپنے اللہ سے شبراتن؟'' اور یہ میرا ایک اور نیا نام تھا۔ جو اگلا نام ملنے تک چلتا رہا۔

مصطفیٰ زیدی کی موت پر میں بہت جذباتی ہوگئی تھی۔ ان کے اشعار کثرت سے پڑھتی۔ بس ان کا ہی ذکر کرتی۔ ایک دن بڑی گلوگیر انداز سے میں ان کی نظم پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے میرے جذبات کی شدّت پر حیرت کا اظہار کیا سچ مچ تمہیں بے دیکھے شخص کی موت پر اتنا دکھ ہوسکتا ہے۔

میں نے جواب دیا مجھے موت پر دکھ ہوتا ہے خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔

کیوں؟

اس لیے کہ پھر اسے کسی قیمت پر دوبارہ دنیا میں نہیں لایا جاسکتا اور یہ انسان کی بڑی

بے بسی ہے۔ انسان انسان سے محبت کرتا ہے۔ بچھڑنا اور ہمیشہ کے لیے بچھڑنا بڑا المیہ ہے۔

کیا کوئی شخص بچھڑ کر اور قریب نہیں ہو جاتا۔ خیال میں مستقل جگہ نہیں پا لیتا؟ انہوں نے سوال کیا۔

میں کیا جواب دوں۔ میں الجھی ہوئی تھی۔ بس مجھے رونے دیں اور میں سچ مچ رو پڑی۔

وہ بغور میری جانب دیکھتے رہے۔

تم آج بھی نونہال ہو پروفیسر۔ جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔

اور جب میں چائے بنا کر لائی تب ایک عید کارڈ کے خالی صفحے پر ایک نظم تھی جو مصطفیٰ زیدی کے اس نظم کے جواب میں تھی۔

تُو مرے واسطے کیوں مُوردِ الزام ہُوا
تُو نے کیوں ترک کیا رشتۂ جاناں زیدی
اب نہ وہ کوچۂ و بازار میں آنا جانا
اب نہ وہ صحبتِ اصحاب و ادیباں زیدی

زیدی کی جگہ مُنّی لگا کر انہوں نے پوری نظم کہہ دی۔ کباڑ خانے میں ان کی یہ تحریر بھی محفوظ ہے۔

سرخیٔ بابِ تمنا کا نشانِ اول
پہلوئے درد حدیثِ غم جاناں مُنّی
درد کی دھوپ میں اک سایۂ گیسو جیسے
زیست کی تیرہ شبی اور چراغاں مُنّی
بے کسی ہائے زمانہ کہ نہ دشمن ہے نہ دوست
بے کسی ہائے تمنائے دل و جاں مُنّی
دشت کی طرح سمندر بھی ہے عُریاں پیکر
دل کی مانند ہر اک شہر ہے ویراں مُنّی

یہ نظم خاصی طویل ہے اور 1970ء کا تحفۂ عید کہہ کر مجھے پیش کر دی گئی۔

ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ آتے ہی انہوں نے اسے میز پر ڈال دیا۔

''تمہارے دو بچوں کا تو سامان ہوگیا۔ بقیہ دس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔'' ان کی بے تکی باتوں کا میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پیکٹ میں چھوٹے چھوٹے کترے ہوئے کپڑے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا ''میرے بش شرٹ سے بچے ہیں یہ کپڑے۔ سوچا درزی کے پاس کیوں چھوڑوں تمہارا بھلا ہو جائے گا لے آیا۔''

جی چاہا کہ اب میں ان سے ہمیشہ کیلئے لڑلوں اور کبھی نہ بولوں۔ لیکن اگر وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھ کر اس کا اظہار کر سکتے تھے تو میں بھی تو چپ چاپ انہیں اپنے سے بڑا اور اچھا انسان سمجھ کر ان کا ادب کرتی تھی۔ ان کے سامنے میرا قد سمٹ جاتا اور میں اپنے آپ کو اپنی عمر سے کم محسوس کرنے لگی۔ ان کی عمر مجھے دوگنی معلوم ہوتی اور یوں میرے اور ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ اُبھرتا جس میں شفقت اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔

یوں کپڑے کے یہ ٹکڑے بھی میرے کباڑ خانے میں داخل ہو گئے۔

پھر وہ اکثر کہنے لگے۔ پروفیسر تمہارے درجن بھر بچوں کے ساتھ تمہیں دیکھنا مجھے اچھا لگے گا۔ میں جہاں کہیں رہوں مجھے بلا کر دکھانا۔ اپنے بچوں سے ملانا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

میں کبھی بھی کہیں بھی جا سکتا ہوں اور چلا بھی جاؤں گا۔ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

اس دن جب میرا کہیں سے رشتہ آیا تب انہوں نے پوری بزرگی کے ساتھ مجھے نصیحت کی۔ ''پروفیسر اکثر لڑکیاں زندگی کو فٹ بال کا کھیل سمجھ کر کھیلتی ہیں تم اپنی زندگی کو بال کی طرح مت اچھالنا۔ اور سنو اگر ایسا ویسا کچھ ہو بھی جائے تو یہ مت سمجھنا کہ تمہارے پاس نہ باپ ہے نہ بڑا بھائی۔ مجھے آواز دے لینا میں تمہارا کڑوا کسیلا سمندر ہوں۔ یاد رکھو دوست وسیع القلب ہوتے ہیں ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ وہ دوست ہی ہوں۔''

And my little thorn bush, you are my unbelievable belief, remember this forever.

ان کی بہت سنجیدہ باتوں میں سے یہ گفتگو سب سے زیادہ سنجیدہ تھی۔

اور جب انہیں جرمنی میں ایک بہت بہتر ملازمت کی آفر ہوئی اور جسے انہوں نے قبول نہ کرنے کی ٹھانی تو میں نے پہلی بار بزرگی کے ساتھ انہیں سمجھایا۔

اگر قدرت کسی کو ترقی کا موقع فراہم کرتی ہے تو اسے ضرور avail کرنا چاہئے اور اپنی تمام تر قوت اور کارکردگی صرف کر کے اعلیٰ مقام کی طرف بڑھنا چاہئے کہ قدرت انسان کو بار بار موقع نہیں دیتی۔

جواب میں انہوں نے کہا۔

پروفیسر تم اب سچ مچ پروفیسر بن چکی ہو۔ چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ ہاں بس یہ ہوگا کہ میرے کھانے سے مرچ کا ذائقہ جاتا رہے گا۔ اور میری بہت سی چیزیں تمہارے کباڑ خانے میں جمع نہ ہو پائیں گی اور ضائع ہو جائیں گی۔ میں یورپ میں رہنا چاہتا ہوں لیکن میں وہاں مرنا نہیں چاہتا۔

اچھا تو آپ مرنے سے پہلے پاکستان چلے آئیے گا۔

وہ ہنسے بہت ہنسے۔

مُنّی دادی موت کے آنے میں آہٹ بھی نہیں ہوتی۔ لیکن شاید میری چھٹی حس مجھے کچھ اشارہ کر دے۔ میں لوٹ آؤں گا۔ مجھے تمہاری روتی صورت بھی تو دیکھنی ہے مرتے مرتے۔

انہوں نے ایئرپورٹ سے مجھے آخری بار فون کیا۔

''پروفیسر میں تمہارے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

میں ڈر گئی۔ میں شاید اپنے بارے میں ان سے کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ ریسور میرے کان سے لگا تھا۔

''تم اپنے آپ کو نایاب سینٹ کی شیشی سمجھتی ہو۔ بچا بچا کر رکھتی ہو۔ کاگ بند، مہر

بند'' میں چھپ تھی۔ اور ''لب بند'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ پھر مجھے لندن سے ان کا ایک خط ملا۔

''پروفیسر میں یہاں آ گیا ہوں۔ اس لئے کہ تم نے مجھے بھیج دیا۔ سنو۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے یورپ ڈوب رہا ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ آج انگریز کی بالکل وہی حالت ہے۔ جو شاہ عالم کے زمانے میں مغلوں کی تھی ان کے پاس بس روایات۔ لال قلعہ اور تاج محل جیسی یادگاریں تھیں۔ اور ان کے پاس بھی روایات اور میوزیم ہیں۔ مغلوں کو انگریز تاجر لے ڈوبے انگریز کو یہودی تاجر لے ڈوبیں گے۔ تاریخ کا یہ چکر بالکل واضح ہے ورنہ ناپختہ لوگوں کیلئے یہاں کی رنگینیاں اب بھی سحر انگیز ہیں۔ اور انہیں یہ ملک اب بھی عظیم نظر آتا ہے۔ بس بات یہ ہے کہ جس طرح ہاتھی مرنے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کا بھی ایک مقام ہے مگر کب تک؟ تاریخ کا یہ عمل بالکل واضح ہے۔

جہاں تک ان کا اور ہمارا تعلق ہے تو مجھے اس سلسلے میں اب کوئی احساسِ کمتری نہیں ہے۔ اس فرق کو اس طرح سمجھو کہ یہ لوگ اپنی طاقت صرف Preserve کرنے میں صرف کر رہے ہیں اور ہم پوری طاقت سے Construct کرنے میں لگا رہے ہیں۔ Preseve کرنے میں عمل تھم جاتا ہے اور Construct کرنے میں ارتقاء ہے۔ اس اعتبار سے ایک دن ہم ان سے آگے نکل جائیں گے۔ ہم غریب ہیں مگر ان کے مقابلے میں بہت خوش ہیں ہمارے مسائل بہت معمولی ہیں۔ یہاں آ کر اگر کوئی نصیحت کر سکتا ہے تو یہ کہ گھر سب سے بڑی جنّت ہے۔ یعنی ایسا گھر جس میں کوئی تم سے بڑا ہو اور کوئی تم سے چھوٹا ہو۔ جہاں بڑوں کی غلط بات بھی سُننی پڑتی ہے اور جہاں رات کو دیر سے آؤ تو چوروں کی طرح آنا پڑتا ہے یہ سارا حُسن یہاں عجائب خانے میں بھی نہیں ملتا۔ رہیں عورتیں ان کی جتنی مٹّی پلید یہاں یورپ میں ہے اتنی شاید دوزخ میں بھی نہ ہو عورت مردوں کے دوش بدوش کام کرنے نکلی تھی اور کام کر رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کا کوئی گھر نہیں ہے اور نہ صنفِ نازک کا کوئی پُر اسرار سا تصور باقی رہ گیا ہے۔ وہ اب ایک کھلی ہوئی

کتاب ہے۔ اورفٹ پاتھوں پر بکھری پڑی ہے۔ عورتیں نہیں جانتیں یہ سو فیصدی گھاٹے کا سودا ہے بہر حال کہنا یہ ہے کہ لندن عبرت سرائے ہے بشرطیکہ دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

اس کے بعد کتابِ زندگی کے بہت سارے ورق پلٹتے گئے وہ یورپ میں رہے اور ہم اپنے ملک میں۔

میں نے اپنے ذہن میں ان کا جو نقشہ جمایا ہوا تھا وہ اپنی جگہ مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ میں بڑی بھی ہوگئی لیکن ان کے تصوّر اور وجود کے سامنے ہمیشہ دس بارہ برس کی بچّی بنی رہی۔ اس رشتے میں بڑا حُسن تھا۔ جو ڈھائی روپے کی کتاب سے شروع ہوا تھا۔ اور وہ ہمیشہ آٹھ آنے کے قرضدار رہے۔ وہ وہاں سیکڑوں کما رہے تھے اور مجھ سے بار ہا وعدہ کرتے تھے کہ اطمینان رکھو میں تمہیں تمہارے آٹھ آنے ضرور لوٹاؤں گا۔

نثار تم نے ان کی کہانی سنی۔ اور نثار سنو وہ شخص آج مر گیا جو میرے نام رکھا کرتا تھا۔ جو میرے کباڑ خانے میں اپنی اَلا بَلا ڈال دیا کرتا تھا۔ میری اس سے 30 سال کی دوستی تھی۔ ہم نے پندرہ سال اس ملک میں ساتھ گزارے اور بعد کے 15 سال اُس نے یورپ میں گزارے۔

مجھے وہ اکثر یاد آجاتے۔ میں اکثر انہیں بھول جاتی۔ مگر وہ میرے اردگرد ہمیشہ موجود رہے۔ کبھی طنز کرتے ہوئے کبھی مذاق اڑاتے۔ کبھی شوخی اور شرارت کرتے ہوئے اور کبھی بے حد سنجیدہ بن کر زندگی کی باتیں کرتے۔

میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ مجھے موت اچھی نہیں لگتی کہ انسان کو انسان سے جدا کر دیتی ہے۔ اسے بے بس بنا دیتی ہے۔ اسے جدائی دیتی ہے اسے غمزدہ کر دیتی ہے۔ پھر بھی انہیں میرا خیال نہیں آیا۔ موت آئی اور وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ مر گئے دل کو بچا بچا کر رکھنے والا ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں لُٹ گیا اور موت کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سن سکے۔ انہوں نے کہا تھا۔ ''مُنّی دادی اگر میں کہیں کھو گیا۔ تو تم گونگی ہو جاؤ گی۔ تمہاری بات سمجھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ جانتے اور مانتے ہوئے بھی وہ کھو گئے۔

لوگ مجھ سے ان کی موت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اخبار میں چھپنے والی اس خبر کی تفصیل چاہتے ہیں۔ شہر والے ان کی موت کی کہانی مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ میرے گھر کیوں آ رہے ہیں۔ مجھ سے تعزیت کیوں کرتے ہیں؟ میں ہر ایک سے کہہ رہی ہوں۔ ہاں وہ شاعر مر گیا جسے اس دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ افسانہ نگار خود افسانہ بن گیا جس کا ایک افسانہ بھی کسی اور کے پاس نہ ہوگا۔ وہ انسان مر گیا جس نے پندرہ برس میں جتنی باتیں مجھ سے کی ہیں کسی سے بھی نہیں کیں وہ پندرہ برس خاموش رہا اور اس کی خاموشی کی تمام آواز میں سنتی رہی آج وہ شخص مر گیا جو کسی کا شوہر تھا۔ اور کسی کا باپ۔ لیکن وہ کسی کا بھی سمندر نہیں تھا وہ صرف میرا اکڑ واکسیلا سمندر تھا اس نے کسی اور سے یہ نہیں کہا تھا کہ زندگی کو فٹ بال کی طرح نہ کھیلنا۔ اس نے کسی کے اتنے بہت سارے نام نہیں رکھے تھے۔ کسی کو مُنّی دادی نہیں کہا تھا۔ کسی سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں یورپ سے لوٹ آؤں گا تو تمہارے اور بھی بہت سے نام رکھوں گا۔ ایسی ایسی تلمیحات ایجاد کروں گا کہ جس کے حوالے سے ہم دونوں خوب محظوظ ہوں گے اور کوئی تیسرا اسے سمجھ بھی نہیں سکے گا۔ اس نے کسی سے یہ اقرار نہیں کیا تھا کہ اس کے مزاج میں بہت سفّا کی ہے اور اگر وہ چاہے تو مجھے ایک ہفتے میں ادھ موا کر کے رکھ دے۔ اور کسی سے نہیں کہا تھا کہ تم مجھے ننھی بچی لگتی ہو۔ پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تمہارا قد بڑا ہو گیا ہے اور تب وہ جذبہ ابھرتا ہے کہ جب کسی کے سر پر ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ پتہ نہیں شاید ماتا اسی کو کہتے ہیں۔ اس نے میرے درجن بھر بچوّں کا خاکہ بنایا تھا اور اس کے نتیجے میں میرے موٹے بھدے وجود کا مذاق اڑایا تھا۔ میرے بڑھاپے کا نقشہ کھینچا تھا۔ اور میرے ان دیکھے شوہر کو ہمیشہ ''تمہارا چغد'' کہا تھا۔ ہاں آج وہ ساری کہانیاں سُننے والا مر گیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا۔ وہ جو میرے بار بار رونے پر ہنسا کرتا تھا۔ آج میں انتقاماً اس کے مرنے پر بھی نہیں رو رہی۔

لیکن جب نثار نے جاڑے کی آدھی رات میں چپکے سے بستر چھوڑ کر جائے نماز

سنبھالی اور اس کی مغفرت کی دعا مانگی تو میری ہچکی بندھ گئی میرا اکڑوا کسیلا سمندر کہاں چلا گیا۔ آج میں اپنا سمندر آپ ہوں میرے اردگرد آنسوؤں سے سمندر اُبل پڑا ہے۔ لوگ آخر مر کیوں جاتے ہیں۔؟ اور وہ پہلے کیوں مر گیا؟ میری موت پر رونے سے بچ گیا۔ سفّاک کہیں کا۔ کہتا تھا دنیا کے میلے میں تم بالکل اکیلی ہو میری بچّی'' آج اسے اس بچّی کا خیال بھی نہ آیا۔ کہتا تھا میں یورپ میں رہنا پسند کرلوں گا لیکن یورپ میں مرنا پسند نہیں کروں گا۔

نور جہاں کا گایا ہوا گانا سن کر وہ جھوم جھوم جاتا۔

دُکھائے دل جو کسی کا وہ آدمی کیا ہے
کسی کے کام نہ آئے وہ زندگی کیا ہے

کہتا تھا مُنّی دادی نور جہاں غضب کا گاتی ہے مگر اس گانے میں تو اس نے کمال کر دیا ہے۔ بلقیس خانم کو وہ صرف ایک نغمے کے حوالے سے پہچانتا تھا۔

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

اور جب میں نے اسے یہ دونوں نغمے کیسٹ میں ریکارڈ کر کے تحفے میں دیئے تو وہ بہت خوش ہوا۔ ایک چھوٹی سی تحریر اس نے جواب میں لکھی۔

پروفیسر اگر کسی کے کتبے پر یہ تحریر ہو انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند تو بتاؤ اس کے بارے میں تم کیا کیا سوچوگی؟ وہ مجھے ایسے ایسے ہی ہوم ورک دیا کرتا اور میں سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی۔

میں سوچ رہی ہوں اس دن کو جب وہ بہت خوش خوش میرے گھر آئے۔ ''اپنی ساری بے وقوف سہیلیوں کو جمع کرلو۔ مفت کی فلم دکھانی ہے اور پتہ کرنے پر انہوں نے بتایا اس فلم کی کہانی انہوں نے لکھی ہے اور آج اس کا خصوصی شو ہے ان کی خاص ہدایت تھی کہ فلم کے ٹائٹل پر میرا نام ضرور پڑھنا۔ مکالمے غور سے سننا۔ مجھے تو آج بھی اس کے بے شمار مکالمے حفظ ہیں۔

میں نے تو اپنے تمام وعدے نبھائے لیکن وہ اپنے وعدے کیوں بھول گئے۔ یورپ کے شور میں موت کی آہٹ انہیں محسوس ہی نہیں ہوئی اور وہ وہیں مر گئے۔ وہیں دفن ہوگئے جہاں مرنا انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ کتنے ہی سال بیت گئے انہوں نے میرے بڑھاپے کا جو نقشہ بنایا تھا اسے دیکھنے بھی نہیں آئے۔ میرے بچوں سے بھی نہیں ملے۔ اس گاڑی کا بھی آرڈر نہیں دیا جس میں میرے بچوں کیلئے بارہ سیٹیں خصوصی طور پر بنانی تھیں۔ انہوں نے میرے چغد کو بھی مخاطب نہیں کیا۔ نہ جانے انہیں اتنا جلد لوٹ کر دنیا سے چلے جانے کی دھن کیوں سنوار ہوگئی۔ انہوں نے یہ فیصلہ فوری طور پر کیوں کرلیا۔

مجھے تو ابھی اپنی نئی زندگی کی کہانی انہیں سنانی تھی۔ مجھے بتانا تھا کہ میں نے زندگی کو فٹ بال کا کھیل نہیں سمجھا۔ میں انہیں بتاتی کہ اب میں زندگی کے میلے میں تنہا نہیں ہوں۔ میں گونگی بھی نہیں ہوں۔ نثار میری باتیں سنتے سنتے تھک جاتے ہیں اور بچے میری ڈانٹ سن سن کر سہم جاتے ہیں۔ میرے ناخنوں پر جمے ہوئے آٹے کا حُسن دیکھا جاسکتا ہے جو انہیں بے حد پسند تھا۔ میں اپنی عمر کی پختگی اور لہجے کے دھیمے پن سے انہیں باور کراتی کہ اب میں نونہال نہیں رہی میں نایاب سینٹ کی شیشی نہیں۔ اپنی عنایت اور محبت اپنے بچوں پر نچھاور کرتی ہوں۔ اپنی گرہستی سے نثار کی جھولی بھر رکھی ہے۔ میرے گھر میں اب بھی یہ روایت زندہ ہے کہ دیر سے گھر آؤ تو چوروں کی طرح دبے قدموں آؤ اور بڑوں کی غلط بات پر بھی خاموش رہو۔ میں نے مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے بجائے اپنا چھوٹا سا گھر سجا کر رکھا ہے۔ اور کسی فرد کا زیاں نہیں ہونے دیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں عورت ہوں۔ اور یورپ کی عورت ہرگز نہیں ہوں جو تمہیں سخت ناپسند تھی۔ میں اب بھی کسی مصطفیٰ زیدی کے ناحق قتل پر رو پڑتی ہوں۔ میری آنکھوں میں آج بھی سمندر موجود ہے جو بات بات پر بہہ جاتا ہے۔ سیلاب لے آتا ہے۔ تباہی مچا دیتا ہے۔ میرے پاس آج بھی بے شمار پُرزوں کا خزانہ ہے۔ میں آج بھی کباڑن ہوں۔ شبراتن ہوں۔ پروفیسر ہوں۔ میں آج بھی نونہال ہوں۔ میں آج بھی مُنّی دادی ہوں۔ میں نے اپنے ماضی سے رشتہ جوڑ

رکھا ہے۔ مگر ہاں میرے صوفے کے سامنے کا صوفہ خالی ہے۔ درمیان کی میز پر چائے کی پیالی جوں کی توں پڑی ہے۔ زندگی کی وہ کہانی ختم ہو چکی ہے جو برسوں پہلے اپنے تعلیمی دور میں شروع ہوئی تھی۔ میں تو آج بھی آٹھ آنے کی دعویدار ہوں۔ صبح اخبار میں ایک مختصر سی خبر ہوگی تمہارے انتقال کی۔ اور وہ تراشہ بھی میرے کباڑ خانے میں شامل ہو جائے گا۔ میں اپنے کباڑ خانے کو کسی صندوق میں بند کر دوں گی اور اس کی چابی ہوا میں اچھال دوں گی۔ بالکل فٹ بال کی طرح کہ زندگی تو بس صرف فٹ بال کا کھیل ہی ہے۔

(7 دسمبر 1989ء خود لکھا، خود پڑھا اور خود سُنا)

☆☆☆☆

درخشاں ہیرا — عَطِیّہ بیگم فیضی

آج سے دو سال پہلے 31 دسمبر کا دن طلوع ہوا تو میرے دل میں عَطِیّہ بیگم فیضی سے ملنے کی تمنا جاگی۔ یہ وہ سال تھا جو عَطِیّہ فیضی کی زندگی کا آخری سال تھا۔ وہ اسپتال کے بے کیف ماحول میں موت سے نبرد آزما تھیں یا شاید زندگی سے برسرِ پیکار۔ یا شاید ان کے دل میں اقبال، گاندھی، شبلی اور علی برادران سے ملنے کی تمنا شدید ہوگئی تھی۔ وہ ان تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں اور مصنوعی سہارے حرکت میں تھے۔ میں ان کے پائینتی کھڑی عمارت کے گرتے ڈھانچے کو دیکھ رہی تھی جس کے شاندار نشان ان کی بوڑھی جھریوں میں پنہاں تھے یہ وہی عَطِیّہ بیگم تھیں۔ جو پوری صدی کی ایک نامور عورت تھیں۔ وقت کا ہر بڑا شخص ان سے متاثر تھا۔ ان کے فن، ان کی شخصیت ان کی ذہانت و قابلیت کا معترف تھا بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے کی تمنا بڑی حسرت کے ساتھ کرتے تھے۔ آج وہ خود اسپتال کے اجنبی ماحول میں شاید بہتوں سے ملنے کی تمنّائی تھیں۔ لیکن ویران سنسان کمرے میں کوئی بھی نہ تھا سوائے مصنوعی سانسوں کی کمزور آواز کے۔

میں نے طالبعلمی کے زمانے سے ہی ان سے ملنے کی تمنّا کی تھی لیکن اسی شہر میں رہتے ہوئے مجھے ایسا کوئی موقع نہ ملا۔ اب میں اخبار جہاں کی سب ایڈیٹر کے طور پر ان کی تصویر بنانے اور ان پر کچھ تاثرات لکھنے کیلئے آئی تھی۔ یہ سال کا آخری دن تھا۔ ہمارے فوٹو گرافر نے ان کی زندگی کی آخری تصویر بنائی۔ میں نے بغور ان کے چہرے کے نقوش اپنی آنکھوں میں قید کیے اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اطلاع ملی عطیہ بیگم

چل بسیں تمام مصنوعی سہارے نکال دیئے گئے اور وہ خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ یہ سال کا آخری دن تھا۔ نئے سال کیلئے میری بہت سی دعائیں تھیں۔ اپنے لئے، پاکستان کیلئے، لیکن مجھے پہلی خبر عَطِیَّہ بیگم کے انتقال کی ملی۔

آج انہیں رخصت ہوئے دو سال گزر چکے ہیں۔ اس سال جب 31 دسمبر کا سورج طلوع ہوا تو مجھے عَطِیَّہ بیگم بے تحاشہ یاد آئیں۔

بلدیہ کراچی کی جانب سے فیضی رَحمین آرٹ گیلری آراستہ ہوگئی ہے میں وہاں جا پہنچی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے ہم جیسے لوگ۔ اس کی تصدیق ٹکٹ والے سے ہوگئی۔ گمنامی کی موت مرنے والی عَطِیَّہ بیگم اب بھی گمنام ہیں۔ حالانکہ ہماری روایت تو یہ ہے کہ زندگی میں ہر بڑے فرد کو پہچاننے سے انکار کرتے ہیں لیکن موت کے بعد اسے بڑے احترام کے ساتھ رحمت اللہ علیہ کی الگنی پر ٹانگ دیا کرتے ہیں۔ لیکن بیچاری عَطِیَّہ بیگم تو اس سے بھی محروم رہیں۔

ڈینسو ہال کے بارونق علاقے میں ایک پُراسرار سی عمارت ان کے نام سے معنون ہے لیکن کاروباری زندگی سے بھلا کسے فرصت ہے جو گھڑی دو گھڑی کیلئے یہاں ٹھہر جائے اور دیکھے کہ یہاں اس عَطِیَّہ بیگم کی چیزیں نمائش کیلئے رکھ دی گئی ہیں جو کبھی بڑی اہم ہستی ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی جب کہ ہندوستان میں مسلمان لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ اس ہیرے کی چمک دمک سے مشرق، مغرب کا ہر ذہن متاثر تھا۔ ہر ذہن اس کا قدر دان تھا۔ خواہ برنارڈ شا جیسا ڈرامہ نویس ہو، ایچ جی ویلز کے پائے کا ادیب ہو۔ ابوالکلام جیسا لیڈر، گاندھی جیسی شخصیت، یا علی برادران جیسے جری سپاہی، اقبال سا شاعر، شبلی سا مؤرخ یا قائداعظم جیسا مردِ آہن، یہ سب لوگ اس ہیرے کے قدر دان تھے۔ جو ایک ایک کر کے اس کے سامنے بجھتے چلے گئے اور یہ خود شکستہ دل لیے ایک دن گمنامی کی موت مر گئیں۔

علامہ اقبال نے عَطِیَہ بیگم کو جرمنی سے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آخر کار ہندوستان کے درخشاں ہیرے کو رخصت کرنے کا وقت آ گیا۔ وہ تارا جو یہاں چمکتا تھا اور رقصاں تھا اور جو دور و نزدیک کے مجمعوں کو روشن کرتا تھا۔ جو امن اور شانتی کے جھنڈے کی طرح خبر گیری کرتے ہوئے ہر جگہ برہم مزاجوں کو سکون دیتا تھا۔ آخر کار اسے رخصت کرنے کا وقت آ ہی گیا۔''

انہوں نے کہا۔

''ہم ایک بڑی آہ کے ساتھ آراستہ ہو کر یہاں آئے تھے''

لیکن جب عَطِیَہ بیگم فیضی دنیا سے رخصت ہو رہی تھیں تو ہم عید کی تیاریوں میں خراماں خراماں شاداں و فرحاں اسپتال کے سامنے سے گزر کر بوہری بازار کی خوبصورت اور پُر رونق گلیوں میں نت نئے نگینوں کی تلاش میں بھٹکتے رہے۔ ستارے خریدے، کتنی ہی کرنیں مول لیں دوپٹے جگمگانے کیلئے اور یہ ستارہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتا رہا۔ بجھتا رہا یہ دیا ٹمٹما تا رہا اور ہم اس عظیم خاتون سے ناواقف ہی رہے اس خاتون سے جس نے پوری صدی حکومت کی تھی۔ جس نے دلوں پر راج کیا تھا۔ جس کے متعلق جارج برنارڈ شا نے کہا تھا۔

''مشرق عظیم ہے جس نے عَطِیَہ بیگم جیسی شخصیت پیدا کی''

شبلی نے کہا:

''اگر خدا اجازت دیتا تو میں عَطِیَہ کی پرستش کرتا۔''

وہی شبلی اپنی ایک تخلیق عَطِیَہ کے نام معنون کرنے کی تمنّا رکھتا تھا۔ عَطِیَہ جو اقبال کی عظمت اور اس کے جانے کتنے رازوں کی امین تھی۔ جن کے خیال سے اقبال کے ذہن میں تر و تازگی پیدا ہو جاتی تھی۔

میں فیضی رحمین آرٹ گیلری میں گھوم پھر کر اس کے نوادرات دیکھ رہی تھی نقرئی لباس، ملبوساتِ شاہی، سیپ کے کام کا غرارہ، چندن ہار، ریشم پر بھونرے کے پروں کا کام، مغلئی انگرکھا، مرجان سے مزیّن لباس، نقرئی 'چمپئی پٹکے اور شاہی کمر بند، شاہی مہریں،

زیورات، فیضی رحمین کی تصاویر، نازلی بیگم کی شاہانہ چیزیں اور عطیہ بیگم کے اہم قلمی خطوط۔ اخبار کے تراشے، قلمی ڈائری، سپاسنامے، جانے کتنی پرانی تحریریں۔اعزازی نشانات۔

میری نظریں ان کی ذاتی ڈائری پر ٹھہر گئی۔ میرے دل میں چپکے سے خواہش پیدا ہوئی کاش میں اس ڈائری کو پڑھ سکتی۔ میرے اشتیاق کو وہاں کے منتظمین نے محسوس کر لیا اور جس لمحے وہ ڈائری میرے ہاتھوں میں آئی میں نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی قیمتی چیز مجھے مل گئی ہو۔ میں نے کوئی خزانہ پالیا ہو۔ یہ سعادت میرے نصیب میں تھی۔

خوش خوش ڈائری کی بوسیدگی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے انتہائی احتیاط سے اٹھایا 1896 کی تحریریں میرے سامنے تھیں۔جن میں عطیہ بیگم کی گھریلو زندگی عیاں تھی۔ عزیز واقارب کے قصے کس پیار سے اس میں قلمبند تھے۔ بہن کا جہاں جہاں ذکر تھا پیاری بہن نازلی سے شروع ہوتا۔تحریر میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا کہ بارہ بج گئے اور مجھے بتایا گیا کہ اب یہ گیلری تین بجے تک بند رہے گی۔ مجھے وقت کی پابندی زندگی میں پہلی بار بُری لگی۔ میں نے احتیاط سے ڈائری رکھ دی اور آرٹ گیلری سے باہر نکل آئی۔

میں وہاں سے تو آ گئی لیکن کئی دنوں تک اُن ہی کے خیال میں گم رہی۔ میں سوچ رہی تھی موجودہ اور آنے والی صدیاں اسے کیسے جانیں گی کہ وہ تو خاموشی سے مرگئی۔آنے والی صدی کی خواتین کیونکر یہ جان پائیں گی کہ اس ایک عطیہ بیگم فیضی نے خواتین کی تعلیم اور ترقی کیلئے کتنے پہاڑ گرائے۔ کتنی راہیں بنائیں کہ آنیوالی خواتین اس سے گزر کر علم حاصل کریں۔

مگر عطیہ بیگم فیضی تو اپنے تمام تر کارناموں خوبیوں اور لیاقت کو قصوں کو اپنے ساتھ اپنی قبر میں لے گئیں کہ ان پر تحقیق کرنے والوں نے اب تک کوئی کام نہیں کیا۔

(6 جنوری 1969 روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور ان کی دوسری برسی پر پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

خاتونِ باکمال و بے مثال ـ بیگم رعنا لیاقت علی خان

ہماری قوم پر یوں تو کئی دن منحوس گزرے ہیں لیکن 13 جون 1990ء کی سہ پہر پاکستانی قوم اور بالخصوص پاکستانی عورتوں کے لئے تاریخ کا بدترین دن ثابت ہوا۔ پاکستان کے پہلے شہید وزیراعظم کی بے مثال اہلیہ رعنا لیاقت علی چل بسیں ان کی شخصیت کے لیے سب سے بڑا حوالہ قائدِملت کی ذات تھی اور دوسرا بڑا حوالہ تحریکِ پاکستان اور اس کی جدوجہد ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ حوالے بہت مضبوط ہیں۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کی اسلام اور پاکستان کے درد نے کایا پلٹ دی۔ قائداعظم کی رفاقت میں پاکستان کے لیے جدوجہد کی۔ نوابی چھوڑی اور پاکستانی بن کر پاکستان آ گئے۔ دو بچے اور بیوی آج تک پاکستان میں اپنے کسی ذاتی گھر میں منتقل نہ ہو سکے۔ بیوی بھی کیسی جو رعنا لیاقت علی تھیں۔ شہید وزیر کی بیگم کی زندگی کا پَل پَل عمل سے عبارت رہا ہے۔ انہوں نے زندگی کا کوئی لمحہ کبھی ضائع نہیں کیا اور خدا نے فیّاضانہ انہیں زندگی کے 85 سال عطا کیے۔ جو انہوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ گزارے۔

مجھے 1973ء کے وہ دن کبھی نہیں بھولتے جب میں نے سوچا کہ میں اپنی طالبات کو بیگم رعنا سے ملواؤں۔ میرا کالج ایک ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں مضافاتی بستی کی طالبات حصولِ علم کے لیے آتی ہیں۔ اور جو شہر میں ہونے والی کسی تقریب میں شرکت نہیں کرسکتیں۔ جس کے باعث انہیں یہ کبھی موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنے شہر یا وطن کے ان لوگوں سے ملیں جنہیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔ طالبات کی غیر نصابی

سرگرمیوں کی نگراں ہونے کے ناتے مجھے یہ اختیار حاصل تھا کہ مختلف اہم شخصیات کو کالج میں مدعو کرتی اور طالبات کو ان سے ملنے کا موقع ملتا۔ ایک موقع پر میں نے بیگم رعنا کو بلانا چاہا اور میری خواہش کی شدّت اس قدر بڑھی کہ میں اسے دبا نہ سکی۔ اتفاق سے ان دنوں وہ گورنر سندھ بن چکی تھیں۔ ان تک پہنچنے کے راستے نسبتاً مشکل ہوگئے تھے اور وہ خود بھی عام دنوں سے زیادہ مصروف رہنے لگی تھیں۔ میں نے گورنر ہاؤس سے رابطہ کیا لیکن معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ علیل ہیں اور حال ہی میں اسپتال سے گھر منتقل ہوئی ہیں۔ میں نے کچھ روز بعد پھر رابطہ کیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا جس کے جواب میں گورنر ہاؤس سے مجھے ایک خط موصول ہوا کہ بیگم صاحبہ نے معذرت کرلی ہے۔ وہ چلنے پھرنے میں دقت محسوس کرتی ہیں اور یوں بھی وہ درسگاہوں میں مہمان بن کر نہ جاسکیں گی۔ کیونکہ شہر میں بہت ساری درسگاہیں ہیں اگر وہ ایک میں گئیں تو دوسرے کے لیے انکار ممکن نہ ہوگا۔ میں مایوس ضرور ہوئی لیکن ہمّت نہیں ہاری۔ میں نے گورنر ہاؤس فون کیا اور ان کے سیکریٹری سے صرف یہ کہا کہ آپ بیگم صاحبہ سے اس قدر کہہ دیں کہ ان کو بلانے کی خواہش مضافاتی بستی کی طالبات کی ہے جو یہ یقیناً حق رکھتی ہیں کہ وہ اپنے عہد کی اس عظیم عورت کو دیکھ سکیں۔ جس کا نام رعنا لیاقت علی ہے اور جسے وہ صرف اپنے کالج میں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ شہر کی تقریبات میں ان طالبات کا جانا ممکن ہی نہیں۔ رہیں دوسرے اداروں کی طالبات وہ شہر سے متعلق ہیں اور وہ شہر کی تقریبات میں بھی جاسکتی ہیں اور مل سکتی ہیں؟ ہماری طالبات کے لئے بیگم صاحبہ اپنی پالیسی پر نظرثانی کریں۔ میرا یہ پیغام بیگم صاحبہ تک پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن گورنر ہاؤس سے ایک شخص دستی خط لے کر آیا۔ جس میں بیگم صاحبہ کی طرف سے یہ تحریر تھا کہ وہ ضرور آئیں گی اور آپ کی طالبات سے مل کر خوشی محسوس کریں گی۔ میں آج بھی اس لمحے کی خوشی کو شدّت سے محسوس کرسکتی ہوں۔ طالبات پر تو ایک نشے کا عالم طاری تھا۔ 4 جون 1973ء آج بھی میری زندگی کے اہم دن میں شمار ہوتا ہے۔ جب بیگم صاحبہ ہماری دعوت پر کالج تشریف لائیں۔ انہیں سہارا دے کر گیٹ سے

اسٹیج تک لایا گیا اور چونکہ ان دنوں وہ گورنر بھی تھیں۔ ان کے باڈی گارڈ ہمراہ تھے جو اسٹیج پر ان کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ میں اسٹیج کو تصویر کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہوں۔ اور اسے اسی طرح سجاتی ہوں کہ کیمرہ اسے خوبصورتی سے محفوظ رکھ سکے۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ یونین کی طالبات' میں اور میرے پرنسپل صاحب بیٹھے تھے اور بس میں چاہتی تھی تصویر کی ترتیب یونہی رہے۔ کھڑے ہوئے دو دربان مجھے اچھے نہ لگے۔ یوں بھی مجھے عجیب سا محسوس ہوا کہ ہم بیگم صاحبہ کی حفاظت کے لیے کافی ہیں۔ لہٰذا میں نے ملٹری سیکریٹری سے درخواست کی کہ باڈی گارڈ ہٹا دیئے جائیں لیکن انہوں نے معذوری ظاہر کی۔ میں نے براہ راست بیگم صاحبہ سے بات کی۔ وہ مسکرائیں اور انہوں نے خود ہی باڈی گارڈ ہٹا دیئے جو ہمارے حاضرین کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس بات پر پنڈال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ آخر کار بیگم صاحبہ ہی کو ہاتھ کے اشارے سے روکنا پڑا۔

میں نے بیگم صاحبہ کا استقبال ان الفاظ میں کیا کہ آج ہمارے شہید وزیراعظم کی بیگم ہماری مہمانِ خصوصی ہیں۔ وہ گورنر بھی ہیں لیکن ہم نے گورنر کو نہیں بلوایا ہے۔ بیگم رعنا لیاقت علی کو بلایا ہے۔ کیونکہ گورنری بیگم صاحبہ کے لئے کوئی اعزاز کی بات نہیں ہے۔ ہاں سندھ کی گورنری کو ہمیشہ اس بات پر ناز رہے گا کہ بیگم رعنا بھی سندھ کی گورنر رہی ہیں۔ بیگم رعنا نے اپنی تقریر میں میرے اس جملے کو سراہا اور کہا کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں اپنی بچیوں سے ملنے آئی ہوں۔ جنہوں نے مجھے آج یہاں محبت کے ساتھ بلایا ہے۔ انہوں نے ہماری طالبات کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی کارکردگی کو سراہا ان کو انعامات تقسیم کئے۔ طالبات کے ساتھ بے شمار تصاویر بنوائیں اور اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ کر واپس لوٹیں۔ ہم نے مدّتوں اس ایک دن کو یاد کیا۔ جس دن ان کی شخصیت کا خوشگوار جھونکا ہم سے چھو کر گزرا تھا اور آج ان کی رحلت پر ایک بار پھر ہم نے البم کے اوراق کو الٹا اور ان کے ساتھ بنوائی ہوئی ان تصاویر کو دیکھا جو کیمرے کی گرفت میں آ گئی تھیں۔ اس دن کا

ایک ایک لمحہ ہمارے احساس کو چھو رہا ہے۔

یہ عظیم عورت جس کا سفر 47ء سے شروع ہوا تھا۔ جب اس نے اپنے محل سے رخصت ہوتے وقت ایک قالین جو ان کو بہت پسند تھا اٹھایا اور پاکستان کے سفر پر روانہ ہونے لگیں۔ لیکن اپنے شوہر کی ایک گہری نظر کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے وہ قالین اپنی جگہ پر رکھ دیا اور دونوں خالی ہاتھوں کو ایک دوسرے سے بھینچ کر گھر سے نکل آئیں۔ وہ اس چھوٹے سے قالین کو یاد کرتے ہوئے اب بھی مسکرا کر کہتی تھیں۔ نہ جانے کیوں میں نے چلتے وقت اسے اٹھالیا تھا۔ جبکہ بسا بسایا محل ہم نے یونہی چھوڑ دیا تھا۔ اچھا ہوا۔ آج ہم یہ کہنے کے قابل تو ہیں کہ ہم وہاں سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں آ کر بسنے والوں نے اپنے لیے چمکتی دمکتی دنیا بنائی لیکن عورت ہونے کے ناتے بھی بیگم رعنا کے دل میں دو کمروں کا ایک مکان بھی جو ان کی اپنی ملکیت ہوتا گھر نہ کر سکا۔ پورا پاکستان ان کا اپنا گھر ٹھہرا۔ انہوں نے ایسے گھر بنائے جو درسگاہیں کہلائیں۔ رعنا لیاقت علی ہوم اکنامس کالج کراچی' ہوم اکنامس کالج ڈھاکا اور لاہور انٹرنیشنل ویمن کلب سارے پاکستان میں اپوا کے دفاتر۔ گل رعنا نصرت انڈسٹریل سینٹر' گل رعنا نصرت کمیونٹی سینٹر' پاکستان کاٹیج انڈسٹریز شاپ اور وہ بے شمار ادارے جن کی وہ سرپرستی کرتی رہیں۔ جنہیں اپنا وقت اور اپنی توجہ دیتی رہیں۔ اور تمام تر امتیازات اور سراہے جانے کی خواہش سے بے نیاز وہ صرف انسانیت اور خواتین کی عزّت و عظمت کے لئے دن رات کام کرتی رہیں۔ لیکن وہ اس لحاظ سے خوش نصیب بھی ثابت ہوئیں کہ انہیں ان کی زندگی میں سراہا گیا۔ ان کی قدر کی گئی۔ انہیں اعزازات سے نوازا گیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی ذات ہمیشہ اوّلیت کی مظہر رہی۔ انہیں کئی ایوارڈ اور تمغے ملے۔

جین ایڈمز میڈل امریکا نے 1950ء میں دیا۔ 1950 ہی میں امریکا نے انہیں ''وومن آف اچیومنٹ'' کا اعزاز دیا۔ 1950ء ہی میں امریکا کی جانب سے انہیں ''مدر آف پاکستان'' کا اعزاز ملا' 1959ء میں پاکستان نے بھی بیگم رعنا کو ''نشان امتیاز'' سے

نوازا۔ نیدر لینڈ نے ''گرینڈ کراس آف اورنج ناسو'' 1961ء میں دیا۔ انٹرنیشنل گیمبل ایوارڈ 1961ء میں امریکا نے پہلی ایشیائی خاتون کے طور پر دیا۔ ترکی کی خواتین انجمن کی جانب سے 1956 میں انہیں ''وومن آف ورلڈ'' دیا گیا۔ 1966 میں اٹلی نے بھی انہیں اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ یونائیٹڈ نیشنز ہیومن رائٹس ایوارڈ 1978ء میں نیو یارک میں دیا گیا۔ 1978ء ہی میں عالمی حقوقِ انسانی کا ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ اپنوں اور غیروں نے انہیں کس کس نام سے پکارا اور کس کس طور پر ان کی عزت افزائی کی۔ اس پائے کی خاتون ہونے کے باوجود انہوں نے غرور وتکبّر کو اپنے پاس نہ آنے دیا۔ وہ خوبصورتی کی پرستار تھیں۔ وہ شے کو حسین بنانے کی آرزومند رہتی تھیں۔ چیزیں جگہ پر رہیں صاف ستھری رہیں پھوہڑپن کا اظہار نہ ہو اور وہ وقت کی قدر کرنے والی خاتون تھیں۔ انہیں اپنی سماجی سرگرمیوں میں جس قدر فرصت ملی انہوں نے لکھنے پڑھنے میں گزاری 1980ء میں ''چیلنج اور چیلنج'' کے عنوان سے اپنی تقاریر کا مجموعہ تیار کیا۔ ہندوستان کی زراعت میں خواتین کا حصہ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا جسے سال کا بہترین مقالہ قرار دیا گیا۔

1980-85ء تک کے بیانات اور تصاویر کو بھی مرتّب کیا۔ پیرانہ سالی کے باوجود اپوا کی محفلیں جمتی رہیں اور وہ اس میں شرکت کرکے اپنی ممبرز کے حوصلے بلند کرتی رہیں۔

پاکستان میں وہ سندھ کی پہلی خاتون گورنر اور چانسلر سندھ یونیورسٹیز رہیں اور انہوں نے یہ عہدہ قبول کرکے اہل وطن کے سامنے مثال قائم کر دی کہ تین سال کی گورنری اس کے علاوہ سفارت و وزارت کے باوجود وہ اس قابل پھر بھی نہ ہوسکیں کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے صرف اتنی رعایت حاصل کرلیتیں کہ ان کی اپنی کوئی چھت ہوتی۔ حکومت پاکستان کے عطا کردہ ایک گھر میں انہوں نے بے سروسامانی میں زندگی گزار دی اور اب اپنے بچوں کے لیے یہ چیلنج چھوڑ گئی ہیں کہ محنت کرو اور اگر رزقِ حلال سے اپنے لیے کوئی جگہ حاصل کرسکو تو کرو ورنہ وزیراعظم اور ایک خاندانی نواب کی اولاد ہوتے ہوئے بھی تم دُنیا کے لئے ایک مثال ہو کہ آج تک زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تمہارے نام سے منسوب

نہیں اور تم اس شہید نواب کی اولاد ہو جس کی شہادت پر اس کی غربت کا راز کھلا چند روپے جو اس کی وفات کے بعد اس کے بچوں اور بیوی کے لئے ایک ماہ بھی نہ چل سکتے تھے۔ آج کی وزارتیں اور سفارتیں اگر اس شہید کی بیوہ سے سبق لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں کہ باوجود بے سروسامانی کے عزّت و عظمت پھر بھی انسان کی پہچان بن سکتی ہے۔

14 جون کی شام بیگم رعنا اپنے لیاقت علی کے پہلو میں جا سوئیں کہ شاید مدتوں سے جاگ رہی تھیں یا شاید اب وہ بہت تھک چکی تھیں یا شاید اب ان کے بوڑھے دل میں پاکستان کی شکستگی کو دیکھنے کی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گولیوں کی آوازوں سے خوفزدہ ہوگئی تھیں۔ وہ چیخوں اور آہوں کو سنتے سنتے تھک گئی تھیں۔ وہ مختلف نعروں، قومیتوں اور مختلف پرچموں کو اپنی برداشت سے باہر جاننے لگی تھیں۔ وہ ایک پاکستان سبز ہلالی پرچم کی حامی تھیں کیونکہ انہوں نے یہی ایک نعرہ لگایا تھا اور اسی نعرے نے انہیں پاکستان دیا تھا۔ وہ صوبوں اور زبانوں کی شناخت سے نا آشنا تھیں۔ وہ تو صرف ایک زبان بولتی تھیں۔ محبت کی، اخوّت کی، ان کا تو ایک ہی رویّہ تھا۔ بھائی چارے کا اور جب سارا ماحول ان کے لیے اجنبی ہوگیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے بوڑھے جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ہوا کے اس تند و تیز جھونکے سے مقابلے کرسکیں۔ تو چپکے سے اپنے شوہر کے پہلو میں جا سوئیں۔ اب نہ جانے یہ چپکے چپکے ان سے اپنی بھرپور زندگی کی کہانی سنا رہی ہیں یا ٹوٹی پھوٹی شکستہ دکھ بھری پاکستان کی کہانی؟

(12 اگست 1990ء، روزنامہ جنگ میں شائع ہوا اور پہلی برسی پر پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

مکرّم بھائی ۔ سب کے بھائی

تعلیمی دور کو ریل کے سفر سے تعبیر کیا گیا ہے برسوں ساتھ رہنے والے ساتھی اپنے اپنے اسٹیشن پر اُتر کر غائب ہو جاتے ہیں اپنی یادیں ایک دوسرے کو دے جاتے ہیں کچھ پھر دوبارہ ملتے ہیں اور کچھ کبھی نہیں ملتے لیکن ان کی یادیں اور ان کی باتیں ذہنوں میں تازہ گلاب کی طرح کھلی اور مہکی رہتی ہیں ایک ایک دن اور دن کا ہر ہر لمحہ یادوں میں دلکشی بکھیرتا رہتا ہے زندگی کی کسی بھی اداس گھڑی میں آنکھیں بند کر کے اگر درسگاہوں کے ساتھیوں کو یاد کر لیا جائے تو تھوڑی دیر کے لیے اداسی دور ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہو جو اپنا یہ ریل کا سفر بھول پاتا ہو۔ میرے ذہن میں بھی ماضی کی ایک فلم سی چل رہی ہے میں بیٹھی سوچ رہی ہوں لمحے جو گرد بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئے ہیں وہ لمحے کتنے خوبصورت تھے۔ میری آنکھیں برس رہی ہیں بہت سے آنسو بہہ گئے ہیں اور بہت سے بہہ نکلنے کو تیار ہیں۔ میں انہیں روک روک کر تھک سی گئی ہوں حالانکہ میں جانتی ہوں کہ آنسوؤں کو واپس آنکھوں میں لے جانا بہت مشکل کام ہے کہ عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔ میری آنکھوں میں آنسو مکرّم بھائی کے لیے ہیں جو آج اب سے کچھ دیر پہلے دنیا سے چلے گئے ہیں۔

شہر کراچی میرا سارا ماضی ہے میری زندگی کا تمام سفر یہیں سے شروع ہوا اور یہیں پر ختم ہو گیا ہے ساری یادیں ساری باتیں بس اسی شہر کے حوالے سے ہیں میرا اسکول میرا کالج میری یونیورسٹی اور اب بعد کی تمام تر زندگی اور اس تمام تر عرصے میں اس تمام سفر میں کتنے ہی ساتھی کتنے ہی اسٹیشن پر اتر کر گم ہو گئے ہیں لیکن میرے دل کی دھڑکنوں میں

ان کی یادیں بسی ہوئی ہیں اور میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں بھولی ہوں پھر مکرّم بھائی کو کیسے بھول جاؤں؟

گھر سے نکلنے کے بعد مکرّم بھائی وہ پہلے مرد ہیں جن سے میں نے بات کی یا جنہوں نے مجھے مخاطب کیا میٹرک کے بعد جب میں داخلہ لینے نیشنل کالج پہنچی تو سب سے پہلے انہوں نے مجھے آواز دے کر پکارا۔

اے لڑکی کہاں جانا ہے؟ مجھے پریشان اور گھبرایا ہوا دیکھ کر انہوں نے مجھ سے پوچھا جی پرنسپل سے ملنا ہے۔

کیا کام ہے؟

رعب اور تحکّم لہجے سے نمایاں تھا۔

داخلہ لینا ہے فرسٹ ایئر میں۔

ہیں؟ اب کے ان کی آنکھوں میں حیرت تھی کانوں کے پاس کس کر دو چوٹیاں جن میں سفید ربن کے پھول بنے کانوں کو ڈھک رہے تھے چُنّٹ دار فراک حلیہ بہر حال کالج والا نہ تھا ڈھیر ساری شرارت ان کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

ساتویں کلاس پاس کرلی۔ ان کے اس جملے پر میں کٹ کر رہ گئی۔

عجب شخص ہے یہ میں کہہ رہی ہوں فرسٹ ایئر میں داخلہ لینا ہے اور یہ حضرت پوچھتے ہیں ساتویں کلاس کے بارے میں۔ میں انہیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی لیکن اس چھوٹے سے بنگلے نما کالج کا راستہ بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ قریب آ کر انہوں نے میرے سر پر ایک چپت رسید کی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا میں ان کی بے تکلفی پر حیران و پریشان پرنسپل آفس تک پہنچ گئی یہ میری اور ان کی پہلی ملاقات پہلی گفتگو اور ان کی پہلی چپت تھی بعد میں پتہ چلا کہ یہ بی اے فائنل میں پڑھتے ہیں یونین کے صدر ہیں۔ کالج میں ان ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ یہ بہت بڑے ہیں بہت اونچے ہیں ہم بہت چھوٹے اور بالکل بے وقعت یوں ہم اپنی ہر ضرورت میں ان کے محتاج تھے اور ہم سب کی مدد کرنے میں حد

درجے فراخدل تھے۔ سارے کالج کے وہ مکرّم بھائی تھے اور ہم نے بھی چپ چاپ انہیں اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب درسگاہوں پر بُرا وقت ابھی نہیں آیا تھا روایات زندہ تھیں محبتیں دلوں میں بستی تھیں تعلیمی زندگی عروج پر تھی کالج کے اسٹیج آباد تھے میگزین نکلتے تھے غیر نصابی سرگرمیاں طالب علموں کی زندگی میں چاند ستارے ٹانکا کرتی تھیں اور ان سب سرگرمیوں کے روح رواں مکرّم بھائی ہوا کرتے تھے یوں وہ ہماری زندگیوں میں اس طرح داخل ہو گئے کہ ہم تمیز ہی نہ کر سکے کہ ہمارے اور ان کے ماں باپ الگ الگ ہیں اور ہم میں کوئی خونی رشتہ نہیں۔ دراصل جن لڑکیوں کو بھائی گھر میں نہیں ملتے وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوتی ہیں میں بھی ایسی ہی جذباتی لڑکی تھی مکرّم بھائی میری زندگی میں داخل ہو گئے ایسے ہی جیسے کالج کی ہر لڑکی کے دل میں وہ بھائی بن کر رہ رہے تھے لیکن شاید میں زیادہ خوش نصیب تھی کہ میرا ان کا ساتھ آج تک تھا وہ اب تک مجھ سے ملتے تھے اور کسی اسٹیشن پر اتر کر وہ کبھی گم نہیں ہوئے وہ تو اگلے ہی سال یونیورسٹی چلے گئے میں نے ایک اور سال کالج میں گزارا اور پھر آنرز کرنے میں بھی یونیورسٹی پہنچ گئی۔ یہاں پر بھی مکرّم بھائی سب کے بھائی بن چکے تھے مجھے اُس دور کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا اس زمانے کی یونیورسٹی جس کی فضاؤں میں محبت رچی بسی تھی کالج گاؤن میں ملبوس تمام طالب علم ایک ہار کے موتی تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے قہقہے۔ مسکراہٹیں تقریریں' شاعری' ہوٹنگ امتحان نتیجے اور کچھ نہیں تو کیفے ڈی گھاس پھوس اور پھر آرٹس فیکلٹی کی وہ مرکزی جگہ جہاں سارے سرکردہ طالب علم اپنی اپنی صلاحیتوں کے جوہر چمکانے اکٹھے ہو جاتے تھے الیکشن کی دھوم دھام اور فنکشن کے سنہرے رُو پہلے دن۔ زندگی سے اگر ان یادوں کی نفی کر دیں تو شاید زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ رہ جائے۔ یونین کے صدر کے لیے مکرّم بھائی کیا کھڑے ہوئے ہم سب کی زندگیوں میں بھونچال آ گیا۔ دن رات مکرم بھائی کی کنویسنگ کے لیے کام شروع ہو گیا اس زمانے میں ہمیں اپنے ہاتھوں سے امیدواروں کے ناموں کی پرچیاں لکھ کر تقسیم کرنی ہوتی تھیں۔ بینر خود بنانے ہوتے تھے کوئی چیز چھپی ہوئی حالت

میں اگر ہوتی تو وہ امیدوار الیکشن کیلئے نا اہل قرار دیا جاتا ساری ساری رات مکرّم بھائی کے لیے بینر بناتے اور سارے دن پرچیاں ایک دوسرے کو تقسیم کرتے اور مکرّم بھائی اپنے مخالف امیدوار کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مزے میں گھوما کرتے۔ یہ بھی اس زمانے کا دستور ہوا کرتا تھا کہ امیدوار اپنی کنویسنگ خود کبھی نہیں کرتا مکرّم بھائی کہتے یہ حسین نقی ہیں صدارت کے اُمیدوار، اِنہیں ووٹ دیں اور حسین نقی کہتے یہ ہمارے دوست مکرّم علی شیروانی ہیں انہیں صدر کے لیے ووٹ دیں۔ اخلاق و روایت کا یہ معیار اگر آج کے طالب علموں کو بتایا جائے تو شاید وہ یقین کرنے پر بھی آمادہ نہ ہوں اور جب چند ووٹوں سے مکرّم بھائی ہار گئے تو ہمیں دنیا یوں اندھیر نظر آئی کہ جیسے اب ہم جی بھی نہ پائیں گے لیکن حسین نقی نے ہمارے پاس آ کر اس بات کا یقین دلایا کہ ہم بھی آپ کے لیے آپ کے مکرّم بھائی ہیں۔ ہمارا ساتھ دیں ہم وہی کچھ آپ کے لیے کریں گے جو مکرّم کرتے اور پھر ان دونوں نے مل کر یونین چلائی ہمیں پھر یاد بھی نہ رہا کہ کون جیتا کون ہارا مکرّم بھائی نے پیار بھری ایک نظر سے ہماری تمام تر کوششوں کا شکریہ ادا کر دیا۔

آج جب عارفہ شمسہ کی آواز مجھے کسی کھنڈر سے آتی ہوئی محسوس ہوئی یہ چُلبلی شمسہ روئے جا رہی تھی اور آج فون پر ہم پہلی بار سنجیدہ تھے۔ ہم دونوں کے ذہنوں میں یونیورسٹی کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں اور دل خون کے آنسوؤں میں ڈوبا جا رہا تھا۔

مکرّم بھائی جب یونیورسٹی سے نکلے تو استاد بن گئے اپنے اسی کالج میں استاد مقرر ہوئے جہاں انہوں نے اپنی طالب علمی کے دن گزارے تھے ان کے بعد جب میرا دورِ طالب علمی گیا تو میں بھی اسی پیشے سے وابستہ ہوگئی جس سے مکرّم بھائی ہوئے تھے۔ یوں ہم دونوں نے کا۔ لے گاؤن کے بعد ہرا گاؤن پہن لیا اور ہماری دوسری ملاقاتوں کے علاوہ سالانہ وہ ملاقات لازمی قرار پا گئی جو بورڈ کے امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کے وقت ہم ایک سینٹر پر تقریباً مہینہ ڈیڑھ مہینہ روز جاتے یہ زمانہ ہماری استادی کے زمانے کا بڑا سنہرا زمانہ تھا۔ شہر کے تمام اساتذہ روز ایک دوسرے سے ملتے۔ دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ کچھ

مشورے باہم ہوتے اور زندگی کا مزا حاصل کرتے بورڈ نے اب اپنا طریقہ بدل لیا ایسے ہی جیسے شہر کا اب چہرہ بھی بدل گیا ہے کون ہرا گاؤن پہن رہا ہے اور کس نے گاؤن اتار دیا۔ اب ہمیں ایک دوسرے کی کچھ بھی خبر نہیں۔ شہر کی بدنصیبی اور بدہیتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے اور ہماری اب اتنی حیثیت بھی نہیں کہ ہم اپنے ہی بورڈ سے کہیں کہ ملاقاتوں پر پہرے نہ بٹھائیں ہمیں ایک دوسرے سے مل لینے دیں کہ زندگی کا سفر تو کسی بھی لمحے کبھی بھی ختم ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے مکرّم بھائی کا سفر ختم ہوا۔

ہمارے کمرے میں آ کر مکرّم بھائی ضرور ملتے اور ہر بار ہر ایک سے میرا تعارف ضرور کراتے یہ میری چھوٹی سی بہن ہے اور میں ہر بار بگڑ جاتی میں اب بڑی ہوگئی ہوں۔ وہ وہاں بھی چیت مارنے سے باز نہ آتے اور چھوٹی سی بہن کہتے ہوئے نیشنل کالج کا وہ پہلا دن شاید کبھی نہ بھولتے۔ میری پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے کبھی ایک سال کا بھی اضافہ نہیں کیا میں اکثر ان سے ناراض ہو جاتی تو یہ اعلان کر دیتی کہ میں ساجدہ کی بہن ہوں اور آپ میرے بہنوئی ہیں اور جب صلح ہو جاتی تو یہ اعلان دوبارہ ہوتا کہ اب آپ بہنوئی نہیں بھائی ہیں یہی وجہ ہے جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا وہ فوراً پوچھتے آج میں بھائی ہوں یا بہنوئی۔

جناح اسپتال کے کمرے میں جب پہلے پہل وہ بیمار ہوکر پہنچے تو میں انہیں دیکھنے گئی وہ مجھ سے مخاطب تھے ضبط کے باوجود آنکھیں چھلک رہی تھیں جذبات پر بہت کنٹرول کے باوجود سینے کا زیر و بم ان کی دلی کیفیت کی عکاسی کر رہا تھا میں تو ان کے سامنے جانے سے بھی کترا رہی تھی وہ بہت سنجیدہ تھے ان کی آواز میں وہ گھن گرج نہیں تھی لیکن نقاہت سے چُور ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ایک چیت لگائی اور پوچھ ہی لیا آج اپنے بھائی کو دیکھنے آئی ہے یا بہنوئی کو اور پھر میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ ریڈیو پاکستان کے یاور بھائی ان کے کئی ایک دوست کئی ایک پروفیسر عیادت کو آئے ہوئے تمام لوگوں کو انہوں نے بھائی اور بہنوئی کی کہانی بتائی مگر ان کی آنکھوں میں آنسو تھے میری آنکھوں

سے زیادہ آنسو۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے تُو میری بہن ہی ہے اور یہ کہ تو رو کیوں رہی ہے؟ پھر انہوں نے مجھے شیخ سعدی کی وہ حکایت سنائی جس میں انہیں اس بات کا غم تھا کہ ان کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا لیکن جب ان کی نظر ایک ایسے فقیر پر پڑی کہ جس کے پیر ہی نہیں تھے تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے پاؤں تو سلامت ہیں مجھ سے مخاطب ہو کر انہوں نے کہا میرے اردگرد اتنے زیادہ بیمار لوگ ہیں کہ مجھے اپنی حالت پر اللہ کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے کہ میں ان میں سے بہت سوں سے بہتر ہوں یہ میری ان سے وہ آخری ملاقات تھی کہ جب وہ مجھ سے مخاطب تھے اس کے بعد میں جب بھی انہیں دیکھنے گئی سامنا کرنے سے کتراتی رہی۔ دُور سے دیکھتی کہ ضبط کے بندھن اب اپنے قابو میں نہیں رہے تھے لیکن مضبوط بنے رہنا تھا کہ ساجدہ نے تو مضبوط بنے رہنے کا ریکارڈ قائم کیا ہوا تھا جبکہ میرے سامنے ساجدہ کا سارا ماضی تھا مکرّم بھائی سے ٹوٹ کر محبت کرنے کا زمانہ۔ دیوانگی کا روپ دھار لینا اور پھر انہیں حاصل کر لینے کے بعد ان کی خدمت کو عبادت سمجھنا یہ سب ساجدہ جیسی لڑکیاں ہی کرتی ہیں اسپتال میں بیماری کا تمام تر زمانہ ساجدہ کی خدمت محبت اور ضبط کی وہ مثال ہے جس سے کوئی بھی درس حاصل کرسکتا ہے۔

ہزاروں کو درس دینے والے مکرّم بھائی اپنا پینتیس چھتیس سالہ پرانا نیشنل کالج چھوڑ کر آج کہاں چلے گئے۔ یونی کیرینز اُداس ہے پی سی ٹی اے انہیں ڈھونڈتی ہے ہاکی کے گراؤنڈ' سارا شہر' شہر کی گلیاں کراچی کی صحبتیں شامیں ان کے قہقہوں سے محروم ہیں انہیں یاد کر رہی ہیں یاد کرتی رہیں گی اور میں مکرّم بھائی اپنے گھر کے ایک کمرے میں اندھیرا کیے اپنی یادوں میں آپ کی یاد کی قندیل جلائے چپ چاپ بیٹھی ہوں آنسو میری آنکھوں سے برس برس کر تھک گئے ہیں میں سوچ رہی ہوں اس شہر میں اب آپ کہیں نہیں ہیں۔ اب آپ مجھ سے وہ سوال کبھی نہیں کریں گے جو پچھلی چوتھائی صدی سے آپ پوچھتے چلے آ رہے تھے لیکن آج مکرّم بھائی میں آپ سے سوال کر رہی ہوں۔ آپ میرے کون تھے؟

آپ کے کیا سیاسی نظریات تھے؟ آپ کیا عقیدہ رکھتے تھے؟ کہ آج کے دور میں تعلقات کیلئے یہ سب جاننا ضروری ہے تو پھر ہماری محبتوں میں یہ سوال کیوں نہ ابھرے؟

ہمیں تو مکرّم بھائی بس یہی معلوم ہے کہ ہم ایک درسگاہ کے ساتھی تھے۔ ایک ماحول میں تربیت پائی تھی۔ ہمارا ماضی ایک' ہمارا حال ایک تھا' ہم ایک شہر سے محبت کرتے تھے اور اپنی مادرِ علمی سے عشق کرتے تھے اور اس کے حوالے سے پیڑ پتے ہوا فضا عمارت سڑک سب سے محبت کرتے تھے مکرّم بھائی میرا سوال ہے کہ کیا ہم دیوانے نہیں تھے؟

؎ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(16 جولائی 1993ء جنگ میں شائع ہوا۔ نیشنل کالج اولڈ اسٹوڈنٹس کے جلسے میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

سلام ٹیچر — تمام ٹیچر

سلام ٹیچر! سلام صفیہ آپا کہ آپ میری زندگی میں رہنمائی کا وہ مینار ہیں جن کی روشنی مستعار لے کر میں آج تک کی زندگی کا سفر کامیابی سے طے کرتی رہی ہوں۔

صفیہ آپا! آپ میری زندگی میں جب داخل ہوئیں تب میں بہت چھوٹی تھی۔ اور مجھے رہنمائی دینے والا دنیا میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میری ماں ایک گھریلو خاتون تھیں اور میرا باپ بڑے بڑے کام کرکے اور اپنے ٹیچر کا بے حد ادب کرکے نصابوں میں جگہ پا چکا تھا۔ کلاس روم میں پڑھایا جا رہا تھا اور ہمیشہ کیلئے امر ہو چکا تھا لیکن جسے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ مجھے کچھ بھی رہنمائی دیئے بغیر دنیا سے جا چکا تھا تب تقدیر مجھ پر یوں مہربان ہوئی کہ آپ مجھے مل گئیں۔

ساری زندگی سفید ساڑھی بلاؤز میں ملبوس نور جیسی سادہ اور پُر وقار سی صفیہ خان جنہیں ایک زمانہ صفیہ آپا کہتا تھا نیو ٹاؤن گرلز اسکول کی بانی اور پرنسپل۔ صاف ستھرا اسکول آپ کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کراچی صدر مقام تھا اور ہم نے اپنی درسگاہ میں وقت کے ہر حکمران کو خوش آمدید کہا۔ بڑی بڑی علمی شخصیات روز ہماری مہمان ہوتیں۔ ہمارا اسٹیج ہر روز آباد رہتا۔ ہم تقریر کرتے۔ ڈرامے کرتے۔ نغمے گاتے۔ تاریخی دن مناتے۔ تاریخ کی بڑی بڑی شخصیات کو یاد کرتے ان کے رہنما اصول اپنانے کے ہمیں درس دیے جاتے۔ سول ڈیفنس گرلز گائیڈ۔ جونیئر بریگیڈ ٹائپنگ' شارٹ ہینڈ' نیٹ بال' باسکٹ بال' ہمیں کلاس روم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یوں سکھائے جاتے کہ جیسے ہمیں ان کا بھی امتحان

دینا ہے اور یہ بھی ہمارے لئے ضروری ہیں۔ ہم اپنے کلاس روم خود صاف کرتے شیشے چمکاتے۔ درخت کے ٹوٹے ہوئے ایک ایک پتّے کو خود اٹھاتے بس کے ٹکٹ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ڈسٹ بن میں ڈالنا ہماری ذمہ داریوں کا ایک ضروری جزو تھا۔ اسکول یونیفارم کا تصور دینے والا شہر کراچی کا پہلا اسکول۔ اپنے زمانے کی مانی ہوئی درسگاہ جہاں سے صرف علم ہی نہیں بلکہ عمل کے بھی سوتے پھوٹتے تھے۔

ہاں میں اس درسگاہ کی طالبعلم تھی۔ جب پہلے دن میں اپنی ساتھیوں کے ساتھ اپنی کلاس میں داخل ہوئی تب صفیہ آپا آپ نے ہماری پہلی کلاس لی۔ اس دن کے اثرات۔ آپ کی شخصیت کا سحر آپ کا دیا ہوا درس آج تقریباً آدھی صدی بعد بھی تر و تازہ ہے۔

ٹیچر آپ کہہ رہی تھیں۔

''اپنی زندگی میں کسی نہ کسی کو اپنا آئیڈیل بنالو اور پھر اس کی ہر اچھی بات کی نقل کرنا شروع کردو''

آپ کی اس بات کو سنتے ہی میں نے آپ کو اپنا آئیڈیل بنالیا اور سب سے پہلے آپ کی جس بات کی میں نے نقل کی وہ وقت کی پابندی تھی۔ میں نے درسگاہ میں جتنے بھی دن گزارے یہ نہ دیکھا کہ آپ کبھی دیر سے اسکول آئی ہوں کبھی دیر سے کلاس لی۔ کبھی جلدی چلی گئیں۔ کبھی دیر سے تقریب شروع ہوئی ہو۔ کبھی کوئی بات سکھانے میں دیر کی ہو۔ آپ کی کلائی پر بندھی گھڑی آپ کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

سلام ٹیچر! کہ میری زندگی میں بھی وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ٹیچر میں آپ کو بتاؤں کہ میں بھی اپنی درسگاہ میں کبھی دیر سے نہیں جاتی۔ اپنے مقررہ وقت تک رہتی ہوں۔ ٹیچر میں اپنے آئیڈیل کی آج بھی نقل کرتی ہوں۔

آپ نے کہا تھا آج کا کام بس آج کرنا۔ مہلت نہیں مانگنا آخری تاریخ کا انتظار نہ کرنا۔ تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس دن سے اب تک میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے اور سلام ٹیچر کہ مجھے واقعی آج تک کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

ٹیچر آپ نے کہا تھا کہ نصابی تعلیم ضروری ہوتی ہے لیکن زائد از نصاب سرگرمی بہت زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ آپ نے درسگاہ کے اسٹیج پر جو کچھ ہمیں سکھایا آج زندگی کے اسٹیج پر چلتے بولتے ہنستے سنتے کہتے ہمیں کوئی دقت کبھی نہیں ہوئی ہاں شاید کلاس روم کے بہت سارے اسباق یاد کر کے نمبر لینے کے بعد ہم بھول گئے ہوں لیکن اسٹیج کی باتیں آج بھی ہمیں زندگی گزارنے کے طریقے سمجھاتی رہتی ہیں۔

ٹیچر آپ نے قانون کی پابندی ہمیں سکھائی تھی۔ آپ نے بہت سارے موقعوں پر خود اس کی پابندی کر کے ہمیں دکھائی بھی تھی ہم نے آپ کا دیا ہوا یہ درس بھی اپنی زندگی میں رچا بسا لیا ہے۔

ٹیچر! آپ میرا آئیڈیل تھیں اور آپ نے ہمیں ایک درس یہ بھی دیا تھا کہ دیانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

دیانت روّیے میں بھی ہوتی ہے۔ روابط میں بھی دولت میں بھی فرائض میں بھی۔ مجھے نہ صرف آپ کا دیا ہوا یہ سبق یاد ہے بلکہ میں نے حتی الامکان اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

ٹیچر آپ نے کہا تھا ہر صورت اپنے بڑوں کا ادب کرو۔ میں نے آپ کو اسکول کے چوکیدار کو خود سلام کرتے دیکھا۔ مالی کو ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے سنا۔ فاطمہ بی کینٹین والی کی عزّت بھی کرتے دیکھا کہ یہ تینوں آپ سے عمر میں بڑے تھے۔ اور آپ مرتبے میں بڑی تھیں۔ میں نے آپ کی یہ بات بھی پلوّ سے باندھ لی تھی۔ سلام ٹیچر کہ آپ اپنے وقت کی بڑی ہستی تھیں۔ واقعی آئیڈیل تھیں۔ ہماری رہنما تھیں۔ آپ کے ایک ایک عمل میں سبق تھا آپ واقعی روشنی کا مُنارَہ تھیں۔ آپ کی پھیلائی ہوئی روشنی آپ کی شاگردوں نے مستعار لیں۔ اسے قرض اور فرض سمجھتے ہوئے آگے پہنچایا۔ دوسری تیسری نسل آپ سے آپ کی غیر موجودگی میں بھی بہرہ ور ہو رہی ہے۔

لیکن ٹیچر ہماری صفیہ آپا' میں آج کے دن آپ سے کچھ اور بات کرنا چاہ رہی

ہوں۔ آج سلام ٹیچر ڈے منایا جا رہا ہے میری ساری زندگی میں پہلی بار۔ یہ پہلی بار کے حکمرانوں کا فیصلہ وہ ٹیچر جو قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ جو کبھی اپنے شاگردوں کی چمڑی ادھیڑنے کا حق رکھتے تھے آج ان کی اپنی چمڑی اندیشوں اور آفتوں کی زد میں رہتی ہے۔

آج کے دن میں اپنی زندگی میں آنے والے تمام استادوں کو سلام کہتی ہوں اور اپنی آئیڈیل ٹیچر آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ آپ نے میرے چھوٹے سے پلوّ میں کئی گرہیں ڈال دی تھیں وقت کی پابندی کرتے کرتے اب میں تھک بھی گئی ہوں اور دوسروں کی نظروں میں گر بھی گئی ہوں۔ ہر تقریب میں سب سے پہلے پہنچتی ہوں پنڈال خالی ملتا ہے۔ اپنے کالج میں سب سے پہلے پہنچتی ہوں تالا بند ملتا ہے اپنے گھر پر ہر کام وقت پر کرتی ہوں بچے مذاق اڑاتے ہیں اور کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے اپنی اس عادت سے دوسروں کو تکلیف پہنچاتی ہوں۔ اور شکایت کی زد میں رہتی ہوں۔

آپ نے کہا تھا زائداز نصاب سرگرمیاں شخصیت بناتی ہیں میں اپنے طالبعلموں میں اس کا رس گھولنا چاہتی ہوں گھولتی بھی ہوں لیکن اس راہ کی مشکلات اتنی ہیں کہ اکیلے یہ درس دینا مشکل بن گیا ہے کہ ساتھی اساتذہ اسے غیر ضروری سمجھ کر پنڈال بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

قانون کی پابندی کرتے کرتے میں ہر ایک کی نظروں میں گر گئی ہوں۔ میری کوئی وقعت نہیں سگنل نہ توڑوں تو راستہ چلنے والوں کی بُری بُری سنوں۔ درسگاہ میں جاؤں تو اپنوں کے تمسخر کا نشانہ بن جاؤں۔ محکموں میں جاؤں تو لوگ میرے کام سے زیادہ میرا چہرہ دیکھتے ہیں کہ انہیں میرے چہرے پر اس پابندی کے بدنما نقش نظر آتے ہیں۔

دیانت آپ کا دیا ہوا سبق تھا۔ آج جب میں زندگی کے اس مقام پر ہوں کہ موت کا بلاوا اب آیا تب آیا۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتی ہوں کہ یہ دامن تو زندگی میں مجھ سے کبھی چھوٹا ہی نہیں۔ روابط میں بھی۔ دولت میں بھی فرائض میں بھی۔ لیکن بڑے ادب کے ساتھ آپ کے حضور کہتی ہوں کہ بد دیانت انسان بھی آ کر تہمت لگاتے دیر نہیں کرتا اور خود مسندِ دیانت پر بیٹھ کر سرخرو ہوتے ہوئے بھی دیر نہیں کرتا اور دنیا آج

ایسے ہی بددیانت کے گیت بھی گاتی ہے۔

بڑوں کا ادب کرتے کرتے میں بھی بڑوں کی فہرست میں آ گئی اور اپنے تمام چھوٹوں کی بے ادبی برداشت کرنا اب دوبھر ہوتا جا رہا ہے۔

آپ نے ایک درس یہ بھی دیا تھا کہ نہ سفارش کرنا نہ کرانا کہ یہ میرٹ کا قتل ہوتا ہے اور قاتل کبھی معاف نہیں ہوتا آپ گستاخی نہ سمجھیں تو عرض کروں بات دوسری طرح ہے۔ میرٹ خود قاتل ہوتا ہے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ قاتل کبھی معاف نہیں ہوتا۔

آپ کے اور بھی تمام دیئے ہوئے درس مجھے یاد ہیں۔ لیکن میں آپ کی بتائی ہوئی سکھائی ہوئی ایک بات اپنے پلّو کی گرہ سے کھول کر ضرور لاؤں گی۔ اسے ضرور دہراؤں گی۔ وہ یہ کہ آپ نے کہا تھا تم سب اچھی اچھی باتوں کو اپنی زندگی میں شامل کرلو اور ایک اچھی انسان اور اگر استاد بنو تو ایک اچھی استاد بن جاؤ' اچھی سربراہ بن جاؤ' اور جب تمہیں اس کا صلہ نہ ملے اور تمہاری خوبیوں کا اعتراف نہ ہو' اور وہ لوگ جو ان سب باتوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھتے ہوں اور انہیں دستارِ فضیلت باندھ دی جائے۔ انہیں بڑے منصب سے نوازا جائے انہیں خطاب اور اسناد دی جائیں۔ عزت اور معاوضہ دیا جائے تب تم صبر کرنا اور اپنے صلے کے لیے قیامت کا انتظار کرنا۔

ٹیچر! گستاخی معاف اسے میں دوسری نظر سے دیکھ رہی ہوں اور شاید اس لئے بھی کہ اب میرے بال سفید ہوگئے ہیں۔ تجربے اور عمر کی لکیریں چہرے پر گہری ہو گئی ہیں۔ میں بھی تجربہ کاروں کی صف میں کھڑی ہوں اور اب اپنے ذہن سے سوچ سکتی ہوں۔ اور اختلاف کی جرأت بھی رکھتی ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ بے منصب لوگوں کا منصب پاجانا بھی معاشرے کے قبلے کا رخ بدل دیتا ہے اور برائی' بھلائی اور منفعت بخش بن جاتی ہے اور ایک نسل اسی شعار کو اپنا لیتی ہے۔ اس غلط روش کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ آپ دنیا سے جاچکی ہیں میری بات کا جواب نہیں دے سکتیں میں آپ کے پاس آ کر اپنا اختلافی نوٹ آپ تک ضرور پہنچاؤں گی اور آج آپ ہی کے دیے ہوئے درس پر اپنی زندگی اور

اپنی ملازمت کے دور کا اختتام اسی وعدے پر کرتی ہوں کہ ہاں ''تم نہ صلے کی تمنا کرو نہ ستائش کی پروا کہ ایک استاد کا کام تو بس کام ہے۔ کام اور صرف کام نہ ستائش نہ صلہ''

سلام ٹیچر کہ آپ نے ہمیں یہ درس دیا اور خود بھی کسی صلے اور کسی ستائش کے بغیر دنیا سے چلی گئیں لیکن ہاں آج بھی آپ کی شاگردوں نے اپنے دلوں میں آپ کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بس دلوں میں زندہ رہنا ہی تو صلہ ہے۔ بات صرف صبر اور سمجھ کی ہے۔''

(15 اکتوبر 2004 بمقام آدم جی کالج ہال محکمہ تعلیم کی جانب سے سلام ٹیچر ڈے پر پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

دو اشعر

صبح سویرے اگر اخبار نظروں سے نہ گزرے تو صبح کے طلوع ہونے میں پھیکا پن رچ بس جاتا ہے۔ منہ کا مزا خراب اور جسم میں سستی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لیکن اخبار پڑھنے کے بعد بلڈ پریشر ہائی اور ذہنی کیفیت دگر گوں ہو جانا بھی معمول ہے۔ درمیانی راستہ کوئی بھی نہیں سوائے اس کے کہ اپنے اعصاب کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کا فن ہمیں سیکھ لینا چاہیے کہ خبروں کی نوعیت میں شاید کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔

آج کی خبر ایک 6 سالہ طالبعلم اشعر کی ہے۔ اس خبر نے دل اور دماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ اشعر پر اپنے ہی استاد نے تشدّد کیا ہے۔ اس سے قبل گلشنِ اقبال کے ایک اسکول کی استانی نے بھی ایک بچےّ پر بے پناہ تشدّد کیا تھا۔ اس موقع پر ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ ایک خاتون کسی کمسن بچےّ پر ظلم کرتے ہوئے اپنے بچےّ کو کیونکر بھلا دیتی ہے کہ بچےّ تو سب ہی ایک شکل وصورت کے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹی کلاسوں کے لیے خاتون اساتذہ کا تقرر بہتر ہوتا ہے کہ وہ ماںتا کے جذبے سے سرشار ہوتی ہیں اور رحم دل ہونے کے علاوہ بچوّں کو بہتر طور پر تربیت دینے کیلئے موزوں ہوتی ہیں۔ وہ بچےّ کی نفسیات سمجھتی ہیں اور انہیں تعلیم دینے میں دشواری پیش نہیں آتی ہے۔ یہ اصول ساری دنیا میں جانا اور برتا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو ہر کلیّہ فیل ہے۔ بچوں پر تشدّد کے حوالوں سے مرد کے ساتھ ساتھ خواتین اساتذہ بھی کسی سے پیچھے نہیں۔

ہمارے یہاں کسی بھی ایسے واقعے کو اس وقت کا ایک حادثہ تصور کیا جاتا ہے کہ جب

وہ رونما ہوتا ہے جبکہ چاہیے تو یہ کہ حادثے کی نوعیت اور چھان بین کے ساتھ ساتھ متعلقہ استاد کے ذہن کا معائنہ بھی ضروری قرار پائے۔ یہ دیکھا جائے کہ تشدّد اس کے ذہن میں کیوں موجود ہے؟ وہ پھول جیسے بچوں پر ہاتھ کیوں اٹھاتے ہیں۔؟ وہ انہیں اذیّت ناک سزائیں کیوں دیتے ہیں؟ بچوّں کو تکلیف دے کر وہ اپنی کس حس کی تسکین کرتے ہیں اور یہ بھی کہ چھوٹے بچوں کے استاد کے تقرر کے وقت ان کا پس منظر ان کی عادات۔ ان کے اطوار اور ذہنی کیفیت کی تمام تحقیق ضروری قرار پائے یہ جانا جائے کہ ان میں بچوں کی تربیت اور تعلیم کا جذبہ موجود بھی ہے یا وہ محض ایک ملازمت کرنے آئے ہیں کہ انہیں یہ ملازمت دیگر کسی اور ملازمت کے مقابلے میں آسانی سے مل رہی ہے۔ اگر ان کا مقصد ماہوار تنخواہ لیکر ہی گھر جانا ہے تو انہیں کان کنی۔ اسٹیل کو شعلوں سے ہم آہنگ کر کے مصنوعات بنانے یا سڑکوں کے پتھر کوٹ کر راہ بنانے کے کام پر معمور کیا جائے بچوں پر تشدّد کے حوالے سے خبریں روز اخبار کی زینت بن رہی ہیں۔ ان ہی جیسی خبروں میں ایک خبر 6 سالہ اشعر پر بے پناہ تشدد کی خبر ہے۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ ایک 70 سالہ ریٹائرڈ شخص جو 10 برس قبل اپنی پہلی ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ اور اب وہ کمسن بچوں کے ایک اسکول میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوگیا ہے۔ اس نے ایک 6 سالہ بچے پر بے پناہ تشدّد کیا۔

عمر کے جس حصے میں یہ شخص ہے یہ عمر اپنے پوتوں اور نواسوں سے کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔ ان سے بے پناہ محبت کرنے کی عمر ہوتی ہے۔ یہ عمر تو پھر سے بچہ بن جانے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو دل محبت سے لبالب بھرا ہوتا ہے۔

یہ اسرار شمسی کونسا پُر اسرار دل رکھتا ہے جہاں بچوں سے نفرت اس کے دل میں پل رہی ہے۔

6 سالہ اشعر پر تشدّد کی تفصیل پڑھ کر اور بچے کی باتیں جان کر میرا کلیجہ کانپ گیا۔ بچہ کہتا ہے اب وہ اسکول نہیں جائے گا۔ گویا اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ وہ

ملک کے بے شمار ان پڑھ لوگوں میں سے ایک ہوگا۔ کہاں گیا ماں باپ کا خواب' اور کہاں گیا اشعر کا تابناک مستقبل۔ اشعر نے تو ابھی تعلیمی سفر کی پہلی ہی سیڑھی پر اپنا ننھا ننھا پہلا ہی قدم رکھا تھا اور اسے ایسا اذیت ناک سبق ملا جو اس کے نازک سے وجود کو ہلا گیا۔ اس کی باتوں میں تو مجھے اپنے اشعر کی تڑپ نظر آ رہی ہے۔ 1994ء کا واقعہ ہے میرا بیٹا اس وقت سولہ سال کا تھا۔ اس نے او لیول کا امتحان پاس کیا تھا اور اس کے بعد اسے اے لیول میں داخلہ لینا تھا۔ تب میں نے اچانک اس کے مستقبل کا فیصلہ یوں کیا کہ وہ آکسفورڈ کیمبرج کی پڑھائی چھوڑ کر پاکستان کے کسی بورڈ یا یونیورسٹی کو اپنائے۔ اپنے ملک کی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو جان پائے' شاید میں نے یہ فیصلہ اس لئے کیا کہ میں خود استاد ہوں اور اردو زبان اور اردو ذریعہ تعلیم کی حامی ہوں۔ اپنے پر تنقید بھی نہیں چاہتی تھی۔ اور دُہرے معیار کی گنہگار نہیں بننا چاہتی تھی۔ تب میں نے اشعر کا داخلہ کراچی کے ایک کالج میں کرا دیا۔ اشعر کی انگریزی قدرتی طور پر اچھی تھی اسے انگریزی ادب سے بھی لگاؤ تھا وہ مضامین لکھا کرتا' شاعری کرتا اور خوبصورت لب و لہجے میں گفتگو بھی کرتا۔ اس کی تحریریں مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ انگریزی ادب اس کا اختیاری مضمون بھی تھا جس میں وہ اچھے گریڈ سے پاس ہوتا آیا تھا۔ لیکن اپنی ان صلاحیتوں کے باوجود اس کا واسطہ اپنے ہی کالج کے ایسے استاد سے پڑا جو اس کی صلاحیت کی تعریف یا حوصلہ افزائی کے بجائے حسد میں مبتلا ہو گیا۔ کیونکہ نوجوانی کے جوش اور اعتماد کے باعث وہاں اُن کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دیتا۔ میں نے اشعر کو اس بات سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کے اعتماد نے اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ وہ کالج کے امتحان میں بھی اس استاد سے اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتا لیکن فرسٹ ایئر کے بورڈ کے امتحان میں اسے 80 نمبر ملے جس نے اسے حوصلہ بخشا۔ دوسرے سال اس کی کاپی ایک ایسے ہی استاد کے پاس پہنچ گئی جس نے اسے 34 نمبر کے قابل سمجھا۔ اس کی اوّل پوزیشن ماری گئی جو قطعی تھی۔ اس نا قابلِ یقین نمبر کے باعث کاپی نکالنے کی درخواست دی گئی تب اس وقت کے بے رحم کنٹرولر جو خود بھی کبھی

اُستاد رہ چکے تھے کسی قسم کے تعاون سے گریزاں رہے یوں نہ کاپی دوبارہ چیک کی گئی نہ صحیح نمبر دیے گئے۔اس کی وجہ بحثیت بورڈ کے ایک ممتحن کے مجھے معلوم تھی اور کنٹرولر صاحب کے طور طریقوں سے بھی میں واقف تھی۔لیکن بات میرے بچوں کے مستقبل کی تھی اور بات آیندہ آنے والے ان بچوں کی بھی تھی جو مستقبل میں شکار ہونے والے تھے۔ میں نے اپنا کیس محتسب کے حوالے کر دیا۔ کاپی میں نمبر کا راز یہ تھا کہ ممتحن صاحب خود انگریزی سے کورے تھے۔ سارے صحیح جوابات پر غلط کا نشان لگا کر انہوں نے طالبعلم کو قتل کر دیا تھا۔جانے کنٹرولر صاحب نے انہیں بچانے کی کیوں کوشش کی۔ جانے انہوں نے اس طالبعلم پر کیا جانے والا ظلم کیوں جائز قرار دیا۔ میں نے اپنے انصاف کیلئے آخرت کا دن چنا ہے لیکن اشعر نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی اذیت پر تڑپ کر کہا تھا میں اب کالج نہیں جاؤں گا۔ میں اب کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں پاکستان میں بھی نہیں رہوں گا۔ اس نے یہ فیصلہ صرف اپنے ہی لیے نہیں کیا بلکہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے لئے بھی کر دیا۔ سب کی کتابیں پھاڑ دیں۔ سب کو اسکول جانے سے روک دیا۔ مجھ سے بھی بدظن ہو گیا کہ اس کے خیال میں، میں بھی اسی انگریزی کے استاد جیسی ہی کوئی استاد ہوں گی۔ میں بھی صبح شام طالبعلموں کا قتل کرتی ہوں گی وہ وقت مجھ پر اور میرے سب بچوں پر بھاری تھا۔ میرا اشعر جس کی ذہانت اس کے اسکول میں گونج رہی تھی۔ اس کی پوزیشن کالج میں اس کا منہ چڑھا رہی تھی۔ ایک استاد نے اشعر کے تعلیمی کریئر کو کس طرح قتل کر دیا تھا۔ میرے سارے بچے اس کا شکار ہو چکے تھے میں بھی ذہنی مریض بن رہی تھی۔ مگر محتسب نے اور گورنر نے اس کے ساتھ انصاف کیا۔ تین سال بعد اس کی پوزیشن بحال ہوئی اسے اعتماد ملا۔ مگر پھر بھی اس استاد کو زندہ رکھا گیا بلکہ صلے میں اس کے بیٹے کو بھی استاد بنا دیا گیا کسی اور اشعر کو اذیت پہنچانے کے لیے۔ شاید اسی استاد کی نسل میں سے یہ ایک اسرار شمسی بھی ہے جس نے ایک بار پھر ایک 6 سالہ اشعر پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اب اس کے والدین پر بھی بُرا وقت ہے۔ اب انہیں بھی اپنے اشعر کو زندہ رکھنے کے لیے بڑے جتن

کرنے پڑیں گے۔ جیسے میرے 16 سالہ اشعر کو زندہ رکھنے کیلئے مجھے جتن کرنے پڑے تھے جو پڑھنے سے یکسر منکر ہو گیا تھا۔ اور استاد کا احترام کھو چکا تھا۔

طالبعلم اشعر کی طرح سے اذیت سہتے ہیں۔ جسمانی بھی اور ذہنی بھی لیکن ڈاکو استاذ جلّاد استاد کو کڑی سزا اگر نہ دی گئی اور استاد کا منصب دیتے وقت اس کی چھان پھٹک نہ کی گئی تب پھر کوئی اشعر اسی اذیت سے گزرے گا۔

میرا اشعر اس وقت چارٹرڈ اکاونٹنٹ ہے۔ دنیا گھوم رہا ہے۔ اپنی صلاحیت کا لوہا منوا رہا ہے کیونکہ اس کے ساتھ انصاف ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے انصاف دلانے کے لیے اس میں اعتماد پیدا کر دینے کے لیے میں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔ میں 6 سالہ اشعر کے والدین سے بھی کہوں گی کہ اپنے معصوم بچے کے ذہن سے ان کربناک لمحات کو کھرچ کر پھینکنے میں اپنی تمام تر طاقت لگا دیں۔ اسے کسی مشفق استاد تک پہنچا دیں تاکہ وہ اپنے دل میں استاد کا احترام بحال کر لے۔ وہ اپنے اسکول کے بھی احترام میں کمی نہ آنے دے تاکہ وہ بھی اپنے پیشرو اشعر کی طرح ذمہ دار شخصیت بن جائے۔ اپنی صلاحیت سے اپنوں کو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ لیکن اربابِ حل وعقد سے بھی کہوں گی کہ بُرائی کا جڑ سے خاتمہ کریں۔ استاد کے منصب پر فائز کرتے ہوئے اسے سارے ضروری امتحانوں سے گزاریں کہ یہ قوم کے ہر اشعر کے لیے بے حد ضروری ہے۔

(10 مارچ 2004 اخبار کی ایک خبر سے متاثر ہوکر)

☆☆☆☆

نُور جہاں کے گُزرے موسم

علاّمہ اقبال کالج کو قائم ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے تھے اور اتنا ہی عرصہ مجھے استاد کے منصب پر فائز ہوئے گزرا تھا۔ ان چند سالوں میں اس کالج نے کراچی کی دیگر اہم درسگاہوں میں اپنا ایک الگ مقام بنالیا تھا۔ ایک طرف مختلف سالوں میں طالبات نے بورڈ اور یونیورسٹی سے نمایاں درجوں میں پاس ہونے کا ریکارڈ قائم کیا تو دوسری طرف ہم نصاب سرگرمیوں میں سرفہرست رہا۔ بزم طلبا ریڈیو پاکستان کراچی کے مقابلوں میں حصہ لے کر تو دھوم مچا دی۔

خوش قسمتی سے میرے ذمے صرف معاشیات پڑھانا ہی نہیں تھا بلکہ میں انجمنِ اتحادِ طالبات کی نگراں بھی تھی۔ یوں طالبات سے میرا تعلق کلاس کے علاوہ اسٹیج کا بھی تھا۔ اُن ہی ابتدائی سالوں میں نور جہاں غضنفر نے اس کالج میں داخلہ لیا۔ وہ کالج کیا آئیں کہ بھونچال سا آ گیا۔ دبلی پتلی دراز قد مسکراتا چہرہ اور کوئی دوسرا میسر نہ ہوتو اپنے آپ سے باتیں کرنا اور خود سے ہی الجھ پڑنا نور جہاں کا وطیرہ تھا۔ وہ جہاں ہوتیں کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ کسی سے الجھی ہوئی ہیں۔ کہیں کچھ الجھا ہوا سلجھا رہی ہیں۔ زور زور سے گا رہی ہیں ڈیسک بجا رہی ہیں۔ بلیک بورڈ پر ٹیچرز کے نام اشعار لکھے جا رہے ہیں۔ ساتھی طالبات کے علاوہ پرنسپل اور اساتذہ کو ہر روز کوئی نیا خطاب دے رہی ہیں۔ مطالبات ہی مطالبات' الیکشن کی تیاری اور اس زور شور سے کہ شارع فیصل بلاک ہو جاتی۔ شام کی شفٹ کے طلباء دیواروں پر بیٹھ کر ان کی تقاریر سنا کرتے۔ کالج کی چاردیواری کے علاوہ

آگے پیچھے دائیں بائیں۔ ریل کی پٹریوں اور ڈرگ روڈ اسٹیشن کے علاوہ اسٹار گیٹ اور بس اسٹاپ بھی ان کی موجودگی سے پریشان رہتے۔ ہر سال الیکشن لڑنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور جیت جانا ان کی شہرت کا سبب۔ ڈراموں میں حصہ لیتیں۔ مشاعروں میں شوق سے جاتیں۔ بیت بازی میں میدان مارنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ نقلیں اتارنا۔ فینسی ڈریس میں اپنا حلیہ بگاڑنا۔ گویا کوئی گوشہ ان سے محفوظ نہیں تھا۔

میری جانی دشمن، تنقید، مطالبات، ضدیں اور جب میں ان کی ایک نہ سنتی تب وہ اپنے اوپر غشی طاری کرلیتیں۔ سچ مچ کی بے ہوش ہو جاتیں۔ اور میں جھٹ ان کی جا اور بے جا باتیں ماننے پر مجبور ہوجاتی زندگی میں بڑی تڑپ تھی۔ کچھ بن جانا۔ مشہور ہو جانا۔ اہمیت حاصل کرلینا ان کی زندگی کے منشور میں لکھا جاچکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی شرارتوں اور صلاحیتوں کے میدان میں نمایاں ہونا شروع کر دیا۔ مجھے ہمیشہ ہی ایسے طالبعلموں کی تلاش رہتی تھی ان کا جھکاؤ گلوکاری۔ شاعری اور ڈراموں کی طرف زیادہ تھا۔ انہیں کالج کی طرف سے بین الکلیاتی مقابلوں میں بھیجا گیا اور وہ ہر جگہ سے انعام لیکر لوٹتیں۔ کالج اور خود ان کا نام اخباروں کی زینت بنتا رہا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے لیکن مانوس بھی کہ جب بھی شاگرد اپنا قد اپنے استاد سے بلند کر لیتے ہیں۔ استاد اسے اپنا کارنامہ قرار دے کر خوش ہو لیتے ہیں۔ آج نور جہاں غضنفر اپنا جو مقام بنا چکی ہیں اس میں کہیں نہ کہیں میں نے بھی اپنی جھلک اور محنت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ شاید ایسا نہ بھی ہو شاید ایسا ہو بھی۔ سرکاری ملازمت سے فراغت کے یہ دو سال شاید افسردگی بیکاری اور مایوسی میں گزرتے لیکن ہوایوں کہ پہلے امریکا سے عشرت آفرین اپنا مجموعۂ کلام لیکر پاکستان آئیں۔ پھر سعودی عرب سے صوفیہ حامد۔ اس کے بعد آسٹریلیا سے عندلیب صدیقی اور اب برطانیہ سے نور جہاں غضنفر جواب نور جہاں نوری ہیں دنیا کے مختلف برِ اعظموں سے آنیوالی طالبات نے مجھے ڈھونڈا۔ مجھے فخر و غرور کا انجکشن لگایا اور اپنے کارناموں کو میری جھولی میں ڈالدیا اور کہا ہماری تمام تر کامیابیاں آپ کی مرہونِ منت

ہیں۔ شاید کچھ لوگ اسے میری خود پسندی کہیں۔ میرا آپ سے کہنا ہے کہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ آپ بھی اس منصب پر فائز ہو جائیے۔ زندگی کے چالیس سال درسگاہ میں گزاریئے۔ طالبعلوں پر محنت کیجئے مجھے یقین ہے۔ آخیر میں آپ کی سوچ میری سوچ سے مختلف نہیں ہوگی۔

نور جہاں غضنفر غیر معمولی طالبہ تھیں۔ اپنے چار سالہ دور میں انہوں نے کالج کو بڑا نام دیا اور اپنے لئے بہت سے انعامات حاصل کئے۔ نغموں میں' شاعری میں' بیت بازی میں' مباحثوں میں' کھیلوں میں' ڈراموں میں اور الیکشن کی گہما گہمی میں۔ ہر جگہ وکٹری اسٹینڈ پر اپنی جگہ مخصوص رکھی۔ ایسے طالبعلم استاد کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ طالبعلمانہ شرارت بھی انہیں دیگر سے ممتاز بناتی ہے۔ نور جہاں غضنفر شرارتوں کی ملکہ تھیں۔ ساتھی طالبات کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور سب سے زیادہ ان کے حملوں کی زد میں میری ذات رہی۔

عرصہ تیس سال بعد وہ اچانک مجھ سے آملیں۔ اور اس درمیان کی ساری کہانی اپنے مخصوص انداز میں سنا ڈالی۔ وہ کہتی رہیں۔ میں دل دل میں فخر کرتی رہی نور جہاں کے چار موسموں کی منظوم کہانی میری ہاتھ میں ہے اور ایک موسم سے نبٹنے کا مجھے الٹی میٹم دیدیا ہے۔ مہلت صرف آج کی رات کی ہے۔

اس رات مجھ پر بس ایک ہی موسم مکمل طور پر حاوی ہے۔ ''درسگاہوں کا موسم'' کاش گزرے دور کی درسگاہیں' پہلے جیسے استاد اور انجمن طلباء کے الیکشن کے دور پھر سے پلٹ آئیں تاکہ ان سے مستفید ہوکر بہت ساری نور جہاں غضنفر پیدا ہوں اور میری مانند ''فخر و غرور'' کے موسم کا مزا لے سکیں جن سے آج وہ محروم ہیں۔

میں کل کی' آج کی' اور آیندہ کی ہر نور جہاں کو ''نورِ جہاں'' بننے پر مبارکباد دیتی ہوں اور بالخصوص اپنی نور جہاں غضنفر کو جو نوری بھی ہے۔

(26 اگست 2007ء ہوٹل مہران میں ''خواب وخیال کے موسم'' کی تقریب اجراء کے موقع پر پڑھا گیا۔ صدارت جمیل الدین عالی۔ مہمان خصوصی چیف منسٹر ارباب غلام رحیم)

☆☆☆☆

زندانِ ذات کی شاعرہ —— اُمّ ِ سارہ

''زندانِ ذات'' میرا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کی تعارفی تقریب آرٹس کونسل میں منعقد ہو رہی ہے۔ '' آپ کے ذمّے اس کی نظامت ہے''۔فون پر اُمِ سارہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

لیکن میں نہ تو آپ سے واقف ہوں نہ آپ کی زندانِ ذات سے۔اب تک آپ کہاں رہیں؟ اور یہ کہ میرا پتہ نشان آپ کو کہاں سے ملا؟ مل کر بتاؤں گی۔ پھر ہم ملے تقریب سے تقریباً دس دن قبل' گویا ہماری ملاقات بس آج کل کی ہی بات ہے۔ اُن دنوں میں ہم دونوں بہت قریب آ گئے۔ میں نے جانا اُمِ سارہ سے قریب آنے کے لیے بہت زمانہ ضروری نہیں تھا یہ تو ایک سادہ سی' پیاری سی ملنسار اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ زندگی پُر پیچ نہیں کہ ان تک پہنچنے کے لیے اور دوستی کے دائرے میں آنے کیلئے راستے کی ناہمواریوں سے گزرنا پڑے یا چھان پھٹک کی ضرورت پڑے۔ بالکل ایسے ہی کہ محبت ہوتے تو بس ایک لحہ ہی لگتا ہے۔ سمجھنے یا جاننے کی ضرورت بعد میں پیش آتی ہے۔ یوں ہم دوست بن گئے۔

اُمِ سارہ کی شاعری کا عرصہ چار سالوں پر محیط ہے۔ وہ بیرونِ ملک مقیم رہیں اور تقریباً گوشہ نشین بھی رہیں۔ پھر انہوں نے شاید مناسب بھی نہیں سمجھا کہ وہ اپنے دل کی بات کو منظرِ عام پر لائیں۔ یوں ہم برسوں ان کے کلام سے محروم رہے۔

وطن واپس ہوتے ہی وہ زندانِ ذات سے کسی قدر باہر جھانکنے پر آمادہ ہوئیں لیکن کچھ ایسے کہ ان کا ذاتی نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اپنی ایک مرحوم بیٹی کی ماں سارہ بن کر

وہ دنیائے شاعری میں وارد ہوئیں۔ چند ملاقاتوں میں ہم نے انہیں صبیحہ اخلاق کے روپ میں دیکھا اور جانا کہ وہ انتہائی حد تک عورت ہیں ایک بچی کو کھو کر وہ اپنا وجود گم کر بیٹھی ہیں۔ لیکن دوسرے بچوں کو انہوں نے اپنی آغوش میں یوں گھیرا ہوا ہے کہ وہ بس ماںتا کی تصویر بن کر رہ گئی ہیں۔۔

تب ہی تو وہ زندانِ ذات سے نکلنا نہیں چاہتیں۔

زندانِ ذات ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں حمد ونعت' منقبت' نظموں' غزلوں کے علاوہ سات عدد سہرے بھی شامل ہیں۔

شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے جانا کہ ان کی آمد نیک فال قرار دی جاسکتی ہے۔ امہ سارہ کیسی شاعرہ ہیں بڑی یا ابھی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ اس کا فیصلہ ان میزان برداروں پر چھوڑتی ہوں جو پورا تولتے ہیں اور سچ بولتے ہیں اور آج زندانِ ذات کی تعارفی تقریب میں اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔

میں ان کی شاعری پر کیا کہوں کیا نہ کہوں کہ میرا مطالعہ محدود ہے۔ لیکن ہاں اشعار پڑھتے ہوئے میری بھی کچھ نہ کچھ رائے تو ضرور ہے۔ اُمِّ سارہ ہوں یا صبیحہ اخلاق یہ ایک نئی سی بات ہے کہ انہوں نے کہیں بھی کسی مقطع میں عرب اور یوپی شعراء کی طرح تخلّص یا اپنا نامُ استعمال نہیں کیا۔ اردو شاعری میں کم از کم ایسا نہیں ہے۔ ہاں سہرے لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے نام کا استعمال کیا ہے اور ان میں ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ ان کی انفرادیت اور ان کا تشخّص ہر ہر جگہ قائم ہے۔ انہیں اپنی ذات سے محبت ہے اندھی عقیدت نہیں۔ کبھی کبھی انسان کے سینے کی زمین کے نیچے زخموں کی ایسی فصل اُگتی ہے جس سے زمین کے اوپر چھالوں اور آبلوں کی لہلہاتی یا منہ چڑاتی کھیتیاں اس کے آلام و مصائب سے پُر زندگی کا منظر پیش کرتی ہیں۔

دل کا عالم بنجر کھیتی   سوکھی مٹی خشک کیاری
گرم ہوائیں پیلے پتّے   ریت کے ذرے تپتا صحرا

جلتی زمیں کے سوکھے ہونٹ بوند بوند پانی کو تر سے
سامنے والا بہتا پانی......

مجھے یقین ہے سامنے والا بہتا پانی کی ترکیب کے سحر سے آپ نہیں نکل پائیں گے۔ غزل دراصل ایک ایسا وسیع اور گھنا جنگل ہے جس میں سب درخت ایک سے لگتے ہیں لیکن شعر سے لگاؤ رکھنے والوں کو اس جنگل کی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی کبھی کچھ درخت اپنے قد اور پھیلاؤ کی وجہ سے خود کو نمایاں کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اُمِ سارہ ایسے ہی درختوں میں سے ایک ہیں۔ وہ ان شاعرات میں شامل ہیں جو اپنی غزل کی چلمن سے صاف نظر آتی ہیں۔ آپ زندانِ ذات کی شاعری کا مطالعہ کریں آپ کی رائے میری رائے سے ملتی جُلتی ہی ہوگی۔

اُمِ سارہ کے کلام میں پاکیزگی اور والہانہ پن ہے۔ انہوں نے دانستہ کسی کا رنگ اڑانے کی کوشش نہیں کی جو کہا اپنے رنگ میں کہا ہے۔ شاعری کے کوئی متعین موضوعات تو ہوتے نہیں۔ شاعری تو زندگی کے تجربات کا بیان ہیں۔ اسی لئے کہتی ہیں۔

آؤ کچھ بات کریں شرحِ جذبات کریں
زندگی چاہتی ہے کیا خود سے سوالات کریں

اذان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہونے والے مسلمان اپنے ہی ہم وطن ہم قوم اور ہم دین لوگوں کے ہاتھوں شہید ہو کر اپنے ہی ساتھی نمازیوں کے کاندھے پر میّت بن کر کیوں باہر آتے ہیں۔

زہر کا درد ملا اس طرح بت خانے میں
آج برسوں کی محبت کا بھرم ٹوٹ گیا

یا یہ کہ

کھوگیا ہے وہ منظر اب کہاں ہے نظّارہ
اب تو چار سمتوں سے دشمنوں نے گھیرا ہے

اُمِ سارہ کے کلام میں تجاہلِ عارفانہ بڑا خوبصورت رنگ لیے ہوئے ہے۔

یوں تو تم اجنبی، بیگانہ نظر آتے ہو
مجھے لگتا ہے کہ برسوں کی شناسائی ہے

سرِ محفل جو کھلتے ہیں کبھی پیوستہ لب ان کے
مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میری بات کرتے ہیں

آپ کے حُسن کا شاید کہ کرشمہ تھا کوئی
ہم سمجھتے رہے گلشن میں بہار آئی ہے

ملک سے باہر جا کر کم وقت میں زیادہ دولت کمانے کی خواہش کتنے ہی خاندانوں کو برباد کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ لوگ اپنے در کا سکھ چھوڑ کر دربدر ہو رہے ہیں۔ ڈالر، پاؤنڈ، ریال، درہم کے بُنے جال میں آدمی ایسا پھنستا ہے کہ اس کا نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارے میں کسی نے کہا ہے۔

میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے

اُمِ سارہ نے ان حالات کی ترجمانی یوں کی ہے:

پی لیا صحراؤں نے اس کا لہو
زندگی بچوں کی تو آسان ہے
ڈھونڈ لوں گہرے سمندر کا سکوت
میرے دل میں اک یہی ارمان ہے

زیادہ تر شوہروں میں سیاستدان بننے کے امکان موجود ہوتے ہیں کیونکہ ہر رات دیر سے گھر آنے پر نئی نئی کہانی سنانے میں وہ ماہر ہوتے ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ ایمرجنسی لگنے کے باوجود بیوی وہ عدالت ہے جو ہر وقت کھلی رہتی ہے اور خوش آمدید کہتے ہوئے کتنے میٹھے لہجے میں وہ اس سے مخاطب ہوتی ہے۔

دیر سے آئے ہو بیٹھو ذرا دم تو لے لو
دیر سے آنے کے سو عذر بتانے والے

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر میں ان کے ذاتی تجربے کا یقیناً دخل ہوگا کہ اخلاق بھائی ایک حلقے کی دیوار پر جابجا لکھے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے بینر آویزاں ہیں اور انتخاب کے نتیجے میں وہ ملک کی اسمبلی کے ایک قابل قدر رکن ہیں۔ دیر سے آنا ان کا حق اور ان کی مجبوری دونوں ہی ہیں اور اُمِ سارہ کو یہ حق اور مجبوری بہر حال خوش دلی سے برداشت کرنی ہے۔

میں نے چند دن پہلے ہی ایک شاعر سے اسی قسم کا ایک شعر سنا تھا سہل تھا یاد بھی رہ گیا۔

تنہائی ملے جب بھی یادوں میں اُتر جانا
یہ کیسی اذیت ہے ہر شام کو گھر جانا

اُمِ سارہ اپنی شاعری میں ماحول کی اتنی بھرپور عکاسی کرتی ہیں کہ زندانِ ذات ایک لینڈ اسکیپ پینٹنگ لگتی ہے

برگزیدہ فیملی کے بارے میں کہتی ہیں ۔

قریہ قریہ کوچہ کوچہ لذت کے وسواس بہت
گھر کی نانی دادی نے پکوان پکانے چھوڑ دیئے

اور حاکمِ وقت کو ان کا مشورہ ہے ۔

چہرے بدل کے آپ ہوں مسند نشیں ضرور
بس اک ہمارے شہر میں امن و اماں رہے

زندانِ ذات دیکھئے آپ کو اُمِ سارہ کی ایک انگریزی نظم بھی ملے گی۔ اپنی بیٹی سمیرہ کی سالگرہ پر لکھی گئی جس کا عنوان ہے "My Butterfly"

اس نظم میں محبت کا سمندر بند ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُمِ سارہ اپنے بچوں کیلئے سرتاپا محبت ہیں۔ اپنے بچوں اور اپنے گھر سے بے پناہ جڑی ہوئی ہیں۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا وہ بس ایک عورت ہیں۔

بچپن میں ہر بچہ بڑوں کے جوتوں میں اپنا پاؤں رکھ کر قد بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے کے اس فعل کو بڑے دیکھ کر اپنے بچپن میں لوٹ آتے ہیں جو سراسر نشاط انگیز اور بھولپن کا دور ہوتا ہے اس نظم کی منظر کشی اُمِ سارہ نے کیونکر کی ہے اس کے لیے آپ کو زندانِ ذات کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

شاعری کی اس کتاب کا مطالعہ یوں بھی ضروری ہے کہ اس فن میں اُمِ سارہ نے بہت سوچ سمجھ کر، سہم سہم کر اور پھر ہمّت اور حوصلے کے ساتھ اپنی ذات کو اپنی ہی قید سے باہر نکالا ہے۔ آیئے ہم ان کا استقبال یوں کریں کہ وہ اپنے اصلی نام اور اپنی ذاتی ذات سے باہر نکل کر دنیا دیکھیں ہم سب سے ملیں اور اپنے مطالعے اور مشاہدے میں ہم سب کو ساتھ لیکر چلیں۔ ہمیں ان کے اچھے اچھے اشعار پڑھنے اور سننے کو ملیں شاعری کو ایک شاعرہ ملے اُمِ سارہ کے نام سے یا صبیحہ اخلاق کے نام سے۔

(14 نومبر 2007، افتتاحی تقریب آرٹس کونسل کراچی)

☆☆☆☆

عابد راؤ — فوجی شاعر

میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری۔ لیکن جب میں ذرا بڑی ہوئی تو گھر میں دو فوجی دیکھے۔ ایک بھائی دوسرے بہنوئی بھائی چھوٹے تھے اور ابھی چھوٹے ہی درجے پر فائز تھے۔ لیکن چھوٹے ہونے کے باوجود دوسرے بڑے بھائیوں پر حاوی تھے۔ انداز جارحانہ' تیز بولنا' زور زور سے بولنا۔ کسی کو نہیں بولنے دینا۔ حکم دینا اور بات منوالینا۔ ہر بات ہر انداز میں تیزی تھی اور خود اعتمادی بھی۔ سکون کے لمحات میں بھی لگتا تھا کہ اگر کہیں اور سے حملہ نہیں ہوا تو پہل ان کی جانب سے ہو ہی جائے گی۔ پڑھنے میں اچھے تھے۔ لکھنے سے بھاگتے تھے۔ سائنس کے طالبعلم تھے۔ شعر و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ہم نے پہلے پہل با آسانی یہ سمجھ لیا تھا کہ بس فوجی کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

پھر دوسرے فوجی ہمارے گھر میں بھاری بھاری بوٹوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ ایئر فورس سے گزرتے ہوئی آرمی میں آئے تھے۔ بڑے عہدے پر فائز تھے۔ تحکمانہ لہجے میں بات کرتے۔ حسِ مزاح تھی مگر اسے استعمال میں لاتے ہتکی محسوس کرتے۔ دل چاہا تو کسی کے ساتھ کسی کی بات پر ہنس لئے اور جب جی نہ چاہے چہرے پر خوفناک تاثرات طاری کر لیے۔ ان سے ہر کوئی دور بھاگتا۔ وہ ہر سویلین کو چھوٹا اور چھوٹے سے چھوٹے فوجی کو بڑا سمجھتے ان کے نزدیک غیر فوجی ہونا ہی کسی فرد کی نا اہلی کا کھلم کھلا ثبوت تھا۔ ہر غیر فوجی دنیا کے تمام عیوب کا مجموعہ ہوتا۔ یوں ہم سب حقیر ذلیل ٹھہرے بات کرلی تو کرلی۔ یونیفارم میں ہوں نہ ہوں ہاتھ میں فوجی چھڑی گھماتے رہنا ان کی عادت ہی نہیں ضرورت

بھی تھی۔

انگریزی ادب اور نفسیات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ قابلیت میں کوئی شک نہ تھا۔ لکھنا لکھانا جانتے تھے۔ لکھتے اور چھپتے بھی رہے تھے۔ لیکن فوج میں آنے کے بعد قلم چھوڑ چھڑی یوں پکڑی کہ ماضی پر شرمندہ شرمندہ رہے۔ آخر اتنا چھوٹا کام کیوں کرتے رہے؟

ہم نے ان دونوں فوجی رشتہ داروں کو دیکھ کر' برت کر اور عادات وخصلت جان کر اپنے تئیں یہ کلیہ بنالیا تھا کہ ہر فوجی بس ایسا ہی ہوگا۔

ہمارے گھر میں ڈھیر ساری کتابیں تھیں۔ شعروشاعری ہر شخص کا عشق تھا۔ ہم سب پڑھتے۔ آپس میں گفتگو کرتے' مشاعروں میں جاتے اور گھر میں بیت بازی کے مقابلے منعقد کرتے۔ ان دنوں گھر میں AC بھی نہیں ہوا کرتا گرمی کی چلچلاتی دوپہروں میں اشعار کی مار ایک دوسرے کو گھائل کر دیتی مگر جب یہ دونوں گھر میں ہوتے تب ہم تیسرے درجے کے شہری بن جاتے۔ اس باعث فوج تو ہمیں اچھی لگتی کہ ہمیں پتہ تھا کہ وہ ملک کی حفاظت کرتے ہیں لیکن فوجی اچھے نہیں لگتے کیونکہ ہم ان دونوں کے دباؤ میں ہوتے۔ فوجی اتنے ہی بُرے لگتے کہ اُن دنوں ایک فوجی کے آئے ہوئے رشتے کو ہماری دوسری باجی نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔

پھر ہوا یوں کہ 65ء کی جنگ چھڑ گئی۔ چھوٹے فوجی نے محاذ سنبھالا اور بڑے فوجی نے کاکول ملٹری اکیڈمی سنبھال لی۔ یہ جنگ فتح پر ختم ہوئی ہمیں اس چھوٹے اور بڑے فوجی پر بے اختیار پیار آیا ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اب ان دونوں نے اپنی عادات پر نظرِ ثانی کر لی ہے۔

71ء کی جنگ چند ہی سال بعد دوبارہ بھگتنی پڑی۔ بڑے فوجی نے مشرقی پاکستان کے محاذ پر فوجیوں کو ٹرینڈ کرنے کا ذمہ سنبھالا ہوا تھا کہ اچانک اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ POW بن کر ہندوستان میں تین سال گزارنے چلے گئے جب لوٹے

تب وہ فوجی پہلے والے فوجی نہ تھے۔ انہوں نے چھڑی وہیں رکھ دی تھی حالانکہ وہ یونیفارم میں اب بھی تھے۔ لیکن اب چھڑی والے ہاتھ میں قلم آ گیا۔ ''رزم و بزم'' کے نام سے شاعری کا ایک مجموعہ بھی جلد ہی آ گیا۔ ہم سب اس تبدیلی پر حیرت زدہ تھے۔ شاعری اور ہم سویلین دونوں سے وہ قریب ہوگئے۔ ان کی شاعری میں جنگی ترانے بھی تھے اور غزلوں کی مخصوص فضا بھی۔ ان کی فوجی شخصیت کم اور شاعری ان پر چھاتی چلی گئی۔

حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ چھوٹا فوجی جواب بڑا فوجی بن چکا تھا اس نے بھی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

بڑا فوجی اب اس دنیا میں نہیں۔ ان کا کلام ان کے بے شمار مضامین اور جنگی چالوں پر ایک مکمل تھیس الماری میں بند پڑے ہیں۔

چھوٹا فوجی اب فوج میں نہیں بس صرف شاعری کر رہا ہے۔ ہم نے بالآخر پھر یہ کلیّہ اخذ کیا کہ ہر فوجی کا انجام بس ایک دو مجموعۂ کلام ہی ہوتا ہے یہ لوگ اوپر سے سخت اور اندر سے نرم ہوتے ہیں۔ یہ جان کر ہم نے اب فوجیوں سے صلح کر لی ہے۔

چند دوستوں نے ہم سے کہا بھی کہ تمہارا یہ خیال سو فیصد درست نہیں کہ ہر فوجی بالآخر شاعر ہو جاتا ہے۔ لیکن جنرل معین الدین حیدر کو پچھلے آٹھ دس سال سے برابر ادبی محفلوں میں دیکھ کر اور برجستہ شعر پڑھتے اور سناتے دیکھ کر میں اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ میں ذہنی طور پر اس خبر کے لیے تیار ہوں کہ جب جناب اختر سعیدی مجھے ایک دعوت نامہ بھیج کر مجھ سے کہیں گے کہ جناب معین الدین حیدر کے مجموعہ کلام کی تعارفی تقریب ہے ایک تقریر تیار کر لیجیے۔

پچھلے دنوں ہمیں ایک ایئر وائس مارشل سے ملنے کیلئے بھی اختر سعیدی ہی نے فون کیا تھا۔ ملنے میں تو خیر کوئی حرج نہیں تھا لیکن ان پر گفتگو کرنا اور شاعری کے حوالے سے گفتگو کرنا بڑا دشوار تھا۔

ان سے ہماری ملاقات ان کے ہی ڈائننگ ٹیبل پر چاکلیٹ کیک کے ساتھ ہوئی۔

ان کا نام عابد راؤ ہے اور آج وہ تقریب کے مرکزی کردار کے روپ میں آپ کے ہمارے سامنے تشریف فرما ہیں۔ مادری زبان پنجابی ہے لیکن بہت شُستہ شائستہ اور نپی تلی اردو میں انہوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور اسی منجھی ہوئی اردو سے ہم پر حملہ بھی کیا۔ ہم اپنی اردو کی کمزوری کے باعث خاموش رہے وہ بولتے رہے ہم سنتے رہے۔ یک طرفہ گفتگو کے باوجود ذرا بھی نہ اکتائے۔ بلکہ سچ جانئے ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ ان کی گفتگو برصغیر بالخصوص پاکستان کی سیاسی تاریخ پر مبنی تھی۔ اس موضوع پر سلسلہ وار اور مرحلہ وار تجزیہ انہوں نے اس خوبی سے کیا کہ ہم مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ کئی بار تو ہم نے دل ہی دل میں انہیں فوجی ماننے سے انکار بھی کیا۔ چہرے مہرے سے وہ ہمارے تعلیمی دور کے ایک بڑے پیارے ساتھی سے مشابہ ہیں جو ڈی آئی جی پولیس کے مرتبے تک پہنچے۔ جبکہ ہم تو کیا کوئی بھی دیکھنے والا انہیں ڈی آئی جی ماننے کیلئے تیار نہیں۔ انتہائی شاعرانہ خطوط کے حامل لوگ پولیس میں۔ ہمارے ساتھی کو جب ہم پر غصہ آیا تو وہ ڈائریکٹر اینٹی کرپشن ہوگئے۔ ''اب بھی مانوگی یا نہیں ورنہ میں اس سے بھی بھیانک عہدہ اپنا کر تمہیں ڈراؤں گا۔'' ابھی ان کی دھمکی سے ہم جانبر نہ ہو پائے تھے کہ عابد راؤ صاحب سے ملاقات ہوگئی شاعرانہ چال ڈھال کے مالک پاک فضائیہ کے کلیدی عہدے پر فائز جناب عابد راؤ۔ اگر صرف ڈی آئی جی کی طرح چہرے کے خطوط ہی نرم رکھتے تو کوئی بات نہ تھی وہ تو باقاعدہ شاعر بھی ہیں۔ ہماری زندگی میں آنے والے یہ تیسرے فوجی تھے جن کا انجام شاعری تھا۔ چوتھے فوجی ابھی ویٹنگ لسٹ پر ہیں۔

راؤ صاحب کام کے بھی آدمی نکلے صرف شاعری کو وجۂ شناخت نہیں بنایا بلکہ مطالعہ اور بے حد مطالعہ کرکے آخر کار ایک انتہائی نازک موضوع پر ریسرچ کرنے لگے۔ مذہب اور قومیت میں تعلق اور اس کی پیچیدگی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی یوں پی ایچ ڈی کرکے ڈاکٹر بھی بن گئے۔ اس سے قبل War Studies میں ایم اے بھی کیا ہم نے ابھی تک ان کا تحقیقی مقالہ تو نہیں پڑھا لیکن ایک نہایت مشّاق نقّاد کی طرح بغیر پڑھے یہ کہہ سکتے

ہیں کہ انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں اردو بولنے والے عابد راؤ صاحب کی تحریر بھی یقیناً اتنی ہی شگفتہ، سچی اور گہری ہوگی۔ اگر کتاب ہاتھ میں آ گئی تو پوری ختم کئے بغیر چین نہ آئے گا۔ یہی تو کسی اچھی تحریر کی خوبی بھی ہوتی ہے۔

اپنی گفتگو کے درمیان انہوں نے کئی بار چاکلیٹ کیک کی پلیٹ ہم تک سرکائی لیکن ہر بار چھری ان کی ہی جانب جا گرتی۔ ہم ان کی گفتگو کے سحر میں گرفتار تھے چاکلیٹ کیک کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

ہمارے دل میں دبی دبی یہ خواہش اب زیادہ سرکش ہوتی جا رہی تھی کہ ہم ان کی شاعری بھی سنیں کہ ہم تو ایک پی ایچ ڈی ڈاکٹر سے گفتگو کرنے نہیں بلکہ ایک فوجی شاعر سے ملنے آئے تھے۔

جب چوتھی یا پانچویں بار انہوں نے چاکلیٹ کیک ہماری جانب سرکایا تو ہم یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ پہلے کلام پھر کیک۔

ہر شاعر کی طرح عابد راؤ کے اندر کا شاعر مچل اٹھا۔ انہوں نے جھٹ اپنی فائل کھولی۔ اور یکے بعد دیگرے اشعار سنانے شروع کر دیئے کم فہم ہم بھی نہ تھے۔ شعر سمجھ میں آ رہے تھے پھر داد کیوں نہ دیتے؟ گو شاعری کے میدان میں وہ نو وارد ہیں لیکن ان کی شاعری ایک شاعر کی مرحلہ وار پروان چڑھتی ہوئی سوچ کی غماض ہے۔ ان کے شعور نے انہیں جن مراحل سے دو چار کیا انہوں نے بعینہ اس کو بیان بھی کیا ہے جو کہ شاعری کی فنی سچائی کا ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عمل کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنے کے جذبے کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

بہت بولا ہوں تیرے حق میں پہلے
ابھی یہ چپ بغاوت کا نشاں ہے
ہے سانسوں کی بدولت دلکشی عابدؔ
وگرنہ جسم مٹی کا مکاں ہے

سچ کے بارے میں ان کی سوچ کیا ہے:

سچ کی مقدار تو معین ہے
جھوٹ البتہ گھٹتا بڑھتا ہے
حافظہ اس لئے ضروری ہے
جُھوٹ کو یاد رکھنا پڑتا ہے

عابد راؤ صاحب اپنا کلام سناتے جا رہے تھے اور میں ان کی شخصیت کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتی جا رہی تھی ہوا باز ہونے کے ناتے ہواؤں سے لڑنا ان کی تربیت کا حصہ ہے۔ اسی لئے وہ اپنی بات میں بولڈ بھی ہیں۔ ڈرتے بھی نہیں نتیجے کی پرواہ نہیں کرتے اچھے اختتام کی دعا کرتے ہیں۔ حصولِ علم، تہذیب و شائستگی کے علاوہ بہادری سرکشیٔ زندہ دلی اور شوریدہ سری میں بھی ان کا جواب نہیں۔ کوئی پریشانی انہیں پریشان نہیں کر سکتی۔ وہ بے تکان بولتے ہیں اور خوب بولتے ہیں لہجے میں اعتماد بھی ہے۔ انہیں چوٹ جتنے زور سے لگتی ہے ان کا باغیانہ جذبہ اتنا ہی شدّت سے ابھرتا ہے مجھے یقین ہے راؤ صاحب اپنی ملازمت کے دوران بھی اسی طرح غیر مشروط طور پر ہر دلعزیز رہے ہوں گے۔ ان سے ملنے والے ان کی سحر انگیز شخصیت کے گرویدہ ہو جاتے ہوں گے وہ ذہنی اور ظاہری ہر لحاظ سے سرتاپا جمال ہی جمال ہیں بلکہ سچ بولیئے تو یوسف جمال ہیں۔ یوسف بھی جمال بھی۔

آخری قطعہ سناتے سناتے انہوں نے چاکلیٹ کیک کی پلیٹ پھر میری جانب سرکائی۔ میں نے پھر چھری ان کی ہی جانب گرتے دیکھی جسے اٹھا کر انہوں نے حسبِ سابق کیک کے ساتھ سجا دی۔ اسی دوران میں نے ان کی کچھ کمزوریاں بھی محسوس کیں۔

طبیعت میں خلوص ہی خلوص، رہن سہن میں قلندرانہ شان، ناداروں کیلئے عملی ہمدردی، ظالموں کیلئے نفرت ہی نفرت۔

اگر کسی انسان میں ان میں سے کوئی ایک بھی خرابی موجود ہو تو اسے اچھا کہتے اور اس

سے بار بار ملنے میں کون کوتاہی برت سکتا ہے؟

انہوں نے پھر چاکلیٹ کیک کھانے کیلئے اشارہ کیا میں نے نہ اسے کاٹا نہ کھایا بس ان کی خرابیوں کو ڈھونڈنے کے بعد میں نے انہیں فوج کے چاکلیٹ ہیرو کا خطاب بخشا اور ان کے گھر سے چلی آئی۔

(4 اگست 2007ء ہوٹل ریجنٹ پلازہ کی تقریب میں پڑھا گیا۔
صدارت: یوسف جمال، مہمان خصوصی: معین الدین حیدر)

☆☆☆☆

سُورج کی گواہی، حالات اورتُم

یہ ایک دلچسپ تقریب ہے جس میں کئی ایک مہمانانِ گرامی مدعو ہیں ایک شاعر کی دو کتابیں موضوعِ گفتگو ہیں اور ایک ادیب کی نثری تصنیف ہے جو اپنے طور پر کسی ایک شخصیت سے متاثر ہے اور اس کے حق میں مختلف ٹھوس دلائل دے کر اپنے نظریئے کی پختگی بھی ظاہر کر رہا ہے۔ دوسروں کو مثالوں اور موقعوں کی مناسبت سے ماضی میں ہونے والے واقعات کی آ گاہی بھی دے رہا ہے۔ اور حال کی ساری بے چینیوں کو ماضی کی ان ہی وارداتوں کے ذریعے ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے اور اس آ گہی کے ذریعے اپنے اردگرد رہنے والوں' اپنے معاشرے' اپنے شہر دیگر شہروں کے رہنے والوں اور مجموعی طور پر پورے ملک کو بتا رہا ہے۔ سمجھا رہا ہے کہ دیکھو جو کچھ ہم پر گزرا ہے۔ گزر رہا ہے اسے معمولی نہ جانو' اسے صرف ایک دکھ اور کرب سمجھ کر صرف ہنسنا مت سیکھو کہ یہ تم پر نہیں بس ہم پر ہی گزرے گا بلکہ سوچو' ذہن سے بھی دل سے بھی کہ ہم تم ایک ہی ہیں۔ اپنے عمل کے ذریعے مستقبل کو تابناک بنانے کیلئے آ ؤ مل کر اس بڑھتے ہوئے۔ امنڈتے ہوئے کالے بادلوں' شعلہ برساتی ہوئی آگ اور آتش فشاں سے بچنے اور اپنے ملک کو بچانے کیلئے متحد ہو جاؤ اس کا فلسفہ سنو۔ اس کی سوچ جانو جو تم سے پہلے بیدار ہو چکا ہے۔ جس نے کمر باندھ لی ہے کہ اب تو کمر کس کر میدان میں آنا ہے ظلم ختم کرنا ہے۔ سارے منفی رجحانات کو مثبت میں بدل دینا ہے۔ کالی آندھی کا رخ موڑ دینا ہے اور مراعات یافتہ طبقے کے چند فیصد لوگوں سے سونے کا نوالہ چھین لینا ہے۔ اپنے لئے نہیں۔ اپنے ملک کی اکثریت کیلئے ان محروم

مجبور مفلس، لیکن سمجھ بوجھ والے عاقل، لائق، اور حیثیت وعلمیت رکھنے والوں کے لیے جنہیں کچل دیا گیا ہے کیونکہ وہ ان چند فیصد لوگوں کے مدمقابل تھے۔ علمیت میں کہیں آگے اور معیشت میں کہیں پیچھے۔ تہذیب ومعاشرت کا سارا شاندار ماضی لیے وہ مستقل کی کھائیوں میں دھکیلے جارہے ہیں کیونکہ انہیں مسائل میں الجھا دیا گیا ہے۔ ارشد حسین کے پاس قلم تھا۔ سوچ تھی۔ جذبات تھے۔ ذہنی ابال تھا۔ دل میں درد تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اس نے اپنے آس پاس مسائل کا انبار دیکھا۔ اپنے لوگوں کو ظلم و زیادتی کا شکار ہوتے دیکھا۔ لاشیں دیکھیں۔ اپنوں کی دیکھیں اور جنہیں ڈھٹائی سے ان کا ہی قاتل ٹھہرا دیا جاتا رہا۔ ایک ہی ملک کے مختلف صوبے کچھ خوشحال کچھ بدحال دیکھے۔ ایک کو آقا ایک کو محکوم دیکھا۔ ریاستی آپریشن دیکھا اپنے لوگوں پر لگتی ہوئی تہمتیں دیکھیں۔ اسٹیبلشمنٹ کی کارستانیاں دیکھیں۔ جمہوریت کی پامالی دیکھی۔ ایک صوبے میں خونریزی ایک میں چپ کا سماں دیکھا خواتین پر تشدد ہوتے دیکھا۔ بچوں کی چیخ و پکار سنی، حتیٰ کہ قومی پرچم کی پامالی دیکھی۔ اسے نذرِ آتش ہوتے دیکھا۔ اپنے عزیزوں کی لاشیں اٹھائیں۔ قاتلوں کو دندناتے پھرتے دیکھا۔ پھر ان کے دل اور ذہن میں طوفان بپا ہوا۔ ہلچل تو شہر کے باشعور شخص کے دل و ذہن میں مچ رہی تھی طوفان تو چارسُو تھا۔ لیکن قلم کسی کسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ارشد حسین، نے ایسے میں قلم سنبھال لیا۔ اور اس محاذ پر ڈٹ گئے۔ یوں ''حالات کے تقاضے'' منظر عام پر آئی۔ اخباری کالم یا خبر صرف ایک دن کی زندگی لیکر آتی ہے۔ لیکن کتاب کی عمر صدیوں کی ہوتی ہے۔ آنے والی نسلیں جب یہ کتاب پڑھیں گی تب ہمارے عہد کے گزر جانے والوں کو دُعائیں دیں گی جو گزرے دنوں میں ظالم کے آگے سینہ سپر ہوکر کھڑے ہوئے اور اگلوں کو اچھا مستقبل دینے کی ٹھانی میں اس پس منظر میں لکھی جانے والی کتاب کے مصنف ارشد حسین کو ان کی جرأت آمیز کوشش پر مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ واقعات سے تو ہم سب ہی واقف تھے لیکن جزئیات سے انہوں نے واقف کرایا۔

خورشید اقبال حیدر کی کتاب ''سورج کی گواہی'' ارشد حسین کے جذبات کا منظوم ترجمہ ہے۔ جو جذبات خود خورشید حیدر کے بھی ہیں میری اس رائے کو آپ یوں نہ سمجھیں کہ خورشید اقبال کے کام کسی نوعیت سے کم ہیں یا ان کی سوچ مستعار ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص ایک جیسے حالات میں مختلف طریقے سے React کرتا ہے۔ کوئی رو دیتا ہے۔ کوئی سہم جاتا ہے۔ کوئی حوصلے سے برداشت کر جاتا ہے۔ کوئی ذہن جھٹک کر بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کو چُپ لگ جاتی ہے۔ کوئی چیخ پڑتا ہے کوئی اپنا اظہار لفظوں میں کرتا ہے۔ وہ مقرّر ہو جاتا ہے۔ وہ مفکّر ہو جاتا ہے۔ وہ لیڈر ہو جاتا ہے وہ سیاستدان ہو جاتا ہے۔ وہ رہنما ہو جاتا ہے۔ اور کوئی قلم لیکر کاغذ سیاہ کر دیتا ہے۔ کسی کی فکر نثر میں پھیلتی پھولتی ہے۔ اور کوئی وارداتِ قلبی کو نظم کر دیتا ہے۔ خورشید اقبال حیدر بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ غزلوں کے نظموں کے، جذبات کے، فکر کے، لیکن وہ اپنے اردگرد کی ان کربناک کہانیوں کو شعر میں ڈھالے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ ''سورج کی گواہی'' کے عنوان سے انہوں نے اپنے دور کے لوگوں کو اپنا موضوع بنایا۔ یہ کوئی بُری بات نہیں، یہ ایک بڑی بات ہے۔ ہمارے سامنے ہمیشہ ایک رول ماڈل ہونا چاہیے۔ تب راستے آسان اور فکر کو توانائی ملتی ہے۔

جب ہی تو وہ کہتے ہیں

کس طرح زندگی کے پہرے سے
تیرگی کم ہو، سوچتے ہی رہے

یا جب وہ اپنے ہیرو کو دیکھتے ہیں تب کہتے ہیں

ظلم رکتا نہیں مصلحت سے کبھی
ظلم کے سامنے سرکشی چاہیئے
جن سے لرزاں ہوں ایوان کے بام و در
اپنے لہجوں میں وہ برہمی چاہیئے

وہ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں ایک سوگوار فضا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہے۔ بُرا ہُوا ہے۔

پھول سے خوشبو ہوا سے تازگی چھینی گئی
شہر کے دیوار و در سے زندگی چھینی گئی
ہر گھڑی اندیشۂ جاں سائے کے مانند تھا
موت سے پہلے بدن سے تازگی چھینی گئی

وہ ایک حسّاس شاعر ہیں۔ کبھی کبھی سپر ڈال دیتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں

مکانِ جسم میں غم کا الاؤ دہکا ہے
مٹا رہا ہے مجھے کوئی مٹ رہا ہوں میں

یہ کیفیت خاصی تشویشناک ہے مگر پھر وہ فوراً ہی اپنے آپ کو تلاش کرتے ہیں۔

بھٹک جاتا ہوں میں خورشید حیدر
مگر اپنا ٹھکانہ جانتا ہوں

کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ دشمن بس ان کے اپنے اردگرد ہے۔

یہ خدشہ پردۂ ادراک میں ہے
کوئی تو ہے جو میری تاک میں ہے
مرے دشمن خبر دیتے ہیں مجھ کو
مخالف خود مری پوشاک میں ہے

وہ تو شہر میں عید کے دن کو بھی آنے سے منع کر دیتے ہیں۔ یہ کیسا شہر ہے آنے والا زمانہ سنے گا کہ شاعر نے کس طرح اس شہر میں زندگی بسر کی ہے۔

عید کے چاند مرے شہر میں تو مت آنا
عید کی شب یہاں زخموں سے اجالا ہوگا
عید کے دن یہاں شہدا کے جنازے ہوں گے
عید کے دن یہاں مظلوموں کا جلسہ ہوگا

وہ شاعر بڑا شاعر ہوتا ہے جو اپنے عہد کو قلمبند کرتا ہے دراصل وہ اپنے عہد کی تاریخ لکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں کی سوچ کا گواہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے آنسوؤں کی داستان لکھتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں واقعات ہوتے ہیں شاعر کے کلام میں جذبات ہوتے ہیں۔ خورشید حیدر جذبات کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اور سورج کو گواہ ٹھہرا رہے ہیں کہ سورج آنے والی صدیوں میں بھی یوں ہی روز نکلے گا اور ڈوبے گا۔ بس یہی ہوگا جو شاعر کی صدی کے نوحے کا سچا ترجمان اور آنکھوں دیکھا گواہ ہوگا۔

میرے ناچیز خیال کے مطابق خورشید حیدر کی ''سورج کی گواہی'' کچھ اس اہتمام کے ساتھ اور ان ہی ضرورتوں کے تحت رقم کی گئی ہے۔

اب رہ گئی۔ ''تمُ'' کی شاعری یہ شاعر کا مجموعۂ کلام ہے۔

مجھے اس کا نام پسند آیا کہ اس میں اپنائیت اور جاذبیت ہے۔ ''تمُ'' 160 صفحات پر مشتمل ہے جس میں تاثرات، غزلیں، اور نظمیں ہیں اس کا شماریاتی جائزہ ہمیں بتاتا ہے کہ تاثرات 17 فیصد، نظمیں 9 فیصد، غزلیات کا حصہ 74 فیصد پر مشتمل ہے۔ جن کے مطالعے سے ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

خورشید حیدر نے ''تمُ'' میں شعری رعایت کو ایک حُسن کے ساتھ برتا ہے۔ الفاظ تراکیب کے خوش آہنگ دروبست میں انہوں نے خاصے فنکارانہ اہتمام کا مظاہرہ کیا ہے۔

انہوں نے اپنے تخلص کی معنویت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اردو غزل میں مومن کو اس میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ خورشید حیدر کی وجدانی کیفیتیں بھی اس باب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

یہ چاند تارے یونہی ہیں رواں دواں خورشید
ہم ایسے لوگ تو پانی پہ بس حباب ہوئے

روشنیوں کی حدّت جاتی ہے خورشید کے ساتھ
کالی راتیں اکثر آتی جاتی رہتی ہیں

میں نے خورشید زمانوں کو اجالے بخشے
میں رہوں گا تو رواں ہوگا ستاروں کا سفر

گزشتہ نصف صدی کے دوران اس خطۂ ارض میں جس نوعیت کے بھونچال آتے رہے ان کے نتیجے میں تمام انسانی اقدار اور ان اقدار کی روشنی میں مرتّب کردہ مربوط اخلاقی و سماجی نظام جس انداز سے ملیا میٹ ہوا ہے وہ ایک پوری نسل کی محرومی کی دردناک داستان ہے۔ خورشید حیدر اس صورتِ حال سے دل گرفتہ ہیں۔

ہمارے کام نہ آئی کسی کی ہمدردی
جو حادثات گزرنے تھے وہ گزر بھی گئے

آج ہر شخص گزرتا ہے بچا کر نظریں
مجھ کو اس موڑ پہ لے آئی ضرورت میری

اب تو یہ بھی یاد نہیں رہتا ہم کو
دن ڈوبا، کب شام ہوئی شب کب گزری

بعض لوگوں کو ملی ناکردہ جُرموں کی سزا
جو ہمارے شہر کا مجرم تھا وہ بخشا گیا

کہتے ہیں زندگی جب بھی فن میں منتقل ہوتی ہے اس کی سطح معمول سے بلند ہو جاتی ہے اسی لئے نقاد مبالغہ کو آرٹ کا حُسن بھی کہتے ہیں۔ لیکن مبالغہ ایک مناسب حد کے اندر رہے تو گوارا ہے۔ ایسا مبالغہ جس سے حقیقت کے تمام رنگ تصویر سے غائب ہو جائیں کسی طور بھی لائق تحسین نہیں۔ خورشید حیدر کی شعری تصویروں میں مبالغے کا Touch نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی لئے وہ جس طرح اپنی ذات کی سچی تصویر پینٹ کرتے ہیں اسی طرح اپنے ماحول کی مصوّری بھی سادگی سے کرتے ہیں اسی باعث ان کے شعروں کی دلکشی اور جاذبیت قائم رہتی ہے۔

زمیں کا قرض کسی دن اتارنا ہے مجھے
میں خاک ہوں سو یہی روپ ڈھالنا ہے مجھے
چُھپا ہوا ہے مرے ذہن میں جو مدّت سے
غزل میں اب وہی چہرہ ابھار نا ہے مجھے

''تُم'' کی شاعری پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ خورشید حیدر نہ علم کے زور پر شعر کہہ کر دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ لفظی شعبدہ بازی سے حیران و پریشان کرتے ہیں۔ وہ نہ عروض کے تنے رسے پر چلنے والے بازی گر ہیں نہ تاریخ و فلسفہ اور اساطیر کے تھیلے سے عجیب وغریب چیزیں نکال کر سامنے رکھنے والے فنکار وہ تو فطرت کی طرح کھرے اور سچے شاعر ہیں۔

بولتی آنکھ اور سمٹا بدن
یہ ادھورا حجاب رہنے دے
کنکروں سے نہ آبلوں کو پھوڑ
پانیوں پر حباب رہنے دے

مجھے ان کی شاعری میں ایک تیکنیک بڑی پُرکشش اور جاذبِ توجہ محسوس ہوئی کہ انہوں نے کئی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر شعر کا پیکر تراشا ہے۔ مثلاً

کچھ ایسے لوگ تھے جو سوچتے رہے گھر کا
ہوئی جو شام تو کچھ لوگ اپنے گھر بھی گئے

کتنے سادہ لوگ ہیں یہ لوگ بھی
رہزنوں کو پھر قیادت سونپ دی

تیری چاہت تیری خواہش تیرا غم
عمر ڈھلی تو ماند پڑے جذبے سارے

وہ عجیب تیور سے بات کرتے ہیں لیکن بےساختہ پن باقی رہتا ہے۔

اس نے بھی پوچھا نہیں تھا میرا حال　　میں نے بھی یہ فاصلہ رہنے دیا
دونوں کھل کر کہہ سکے نہ دل کی بات　　دل میں دل کا معاملہ رہنے دیا

ان کے اشعار میں غم جاناں کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔

میں اپنے لیے کیسے خوشیوں کی طلب کرتا
دکھ درد بسے ہوں جب بستی کی فضاؤں میں

اس نے بھی خورشید چھوڑی ہچکیوں میں گفتگو
میں نے بھی نظریں جھکائیں اور وہ رخصت ہوا

''تُم'' کی شاعری میں غضب کی روانی ہے۔ شدّتِ جذبات کے باوجود سنبھلی ہوئی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی اور نئی نئی ردیفیں ہیں۔ کچھ اشعار بظاہر بڑے سادے ہیں لیکن ان کے پیچھے برسوں کی ریاضت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے جیسے میؔر کے یہاں ملتی ہے۔

جھلتی دھوپ بھی اب چاندنی ہے　　محبت میں عجب تاثیر سی ہے
ابھی اک شکل جو گزری یہاں سے　　مرے خوابوں کی وہ تعبیر سی ہے
ادھورے لفظ بے ترتیب سطریں　　مرے اشعار کی تفسیر سی ہے

آج کی تقریب میرے لئے اس طرح اہم ٹھہری کہ مجھے ایک اچھا شاعر پڑھنے کو ملا۔ میرا اس سے تعارف ہوا کہ وہ میرے ہی شہر کا دل و دماغ رکھنے والا میرا ہمسایہ ہے۔

ارشد حسین کی کتاب اس شہر کی کہانی ہے۔ میرے ہی شہر کی کہانی۔ دونوں اگر مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں تو انہیں میں دعائیں دیتی ہوں اور فن میں تو یقیناً بڑے ہی ہیں اللہ کرے اپنے قلم کو اسی طرح استعمال کرتے رہیں۔

(2 نومبر 2007ء ادارہ عزم نو کی جانب سے ٹی کلب کراچی میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

عندلیب صدّیقی — چاند کی طلبگار

کراچی شہر کی تقریباً ہر شام ایسی ہوتی ہے کہ اگر کسی صاحبِ ذوق کو وقت گزارنا ہو تو اسے ایسے لمحات آسانی سے میسر آجاتے ہیں۔ کسی بڑے شخص سے ملاقات کا موقعہ۔ کسی فنکار کے فن سے تعارف۔ کسی موضوع پر گفتگو کسی کتاب اور صاحبِ کتاب سے آشنائی۔ بس اک طلب کی ضرورت ہوتی ہے مختلف ادارے یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ بھوپال انٹرنیشنل فورم کے اویس ادیب انصاری اور شگفتہ فرحت تو لگتا ہے ہر وقت ایئر پورٹ پر کھڑے رہتے ہیں۔ شہر میں رہنے والی شخصیات تو ان کی جیب میں ہوتی ہی ہیں لیکن بیرونِ شہر اور بیرونِ ملک سے آنیوالوں کو یہ ایئر پورٹ پر ہی گھیر لیتے ہیں۔ اور یہ ضروری بھی نہیں کہ ان لوگوں۔ ان کتابوں۔ ان فنکاروں کا تعلق بھوپال سے ہی ہو۔ ایک دن یہ دونوں ایئر پورٹ پر تاک جھانک رہے تھے کہ آسٹریلیا سے آئی ہوئی ایک خاتون جہاز سے اترتے ہی دھرلی گئیں۔ یہ عندلیب صدیقی تھیں۔ دونوں بھوپالی ان کی شکل سے بھی واقف نہ تھے مگر شاید شخص سے پہلے کام ان تک پہنچ جاتا ہے۔ ویسے ان کے متعیّن کردہ لوگ بھی اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ یہ گرفتار اُن کے کسی رکن کی معرفت ہوئی تھیں اور فون پر اُن کی ملاقات اویس سے کرادی گئی۔ انہوں نے انٹرویو لیا اور یہ پوری اتریں۔ بس آج کی شام ان کے نام منسوب کردی گئی۔

ایک فون اویس کا میرے پاس آیا۔ میں یہاں بتاتی چلوں اویس سے میری دُہری رشتہ داری ہے۔ وہ ہمارے کالج کے سامنے والے اسکول کے فارغ التحصیل ہیں اور ہماری

ایک بہت ہی عزیز دوست کے شاگرد ہیں۔ شائستہ فرحت' شگفتہ فرحت کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور وہ میری شاگرد ہیں۔ گویا اویس کے میکے اور سسرال دونوں مجھ سے منسلک ہیں۔

اویس کے فون سے انکشاف ہوا کہ آسٹریلیا سے آئی ہوئی اور نوگرفتار خاتون جن کے اعزاز میں آج کی شام منعقد ہو رہی ہے میری شاگرد ہیں اور کراچی آ کر میری کھوج میں ہیں۔ استادی ایک ایسا منصب ہوتا ہے جہاں نشہ ہی نشہ ہوتا ہے۔ فتح کا' غرور کا۔ جہاں خرچ صرف علم ہوتا ہے جو جتنا خرچ ہوتا ہے اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے گویا ہاتھ بہت کچھ آتا ہے۔ جب اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے لئے کوئی نوکری کی طلب رکھتی تھی تب یہ جانتی بھی نہیں تھی کہ جس کوچے میں بغیر سوچے سمجھے اور خواہش کے بغیر جا رہی ہوں وہ دنیا بھر کی نوکری میں سب سے افضل ہے۔ ہمارے استادوں نے ہمیں بہت کچھ دینے کی کوشش کی تھی۔ ہم ان سے کتنا کچھ لے پائے یہ اپنے اپنے بساط کی بات ہوتی ہے۔ کس کی جھولی سلامت اور کس کی جھولی میں کتنے چھید ہوتے ہیں۔ ان کا دیا ہوا درس مجھ جیسی معمولی طالبہ کی جھولی میں تھوڑا بہت اٹک ضرور گیا تھا۔ میں صحافت میں جانا چاہتی تھی۔ ذہن رکھتی تھی ادب کا۔ اور پڑھانے پہنچ گئی معاشیات۔ گویا زندگی میں کوئی ترتیب' باقاعدہ سوچ تھی ہی نہیں۔ شاید رہنمائی کی بھی کمی تھی۔ لیکن جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ وہ ہم جیسوں پر بھی مہربان ہو جاتا ہے اور بتاتا بھی نہیں کہ کیوں مہربان ہے؟ کالج پروفیسری نے زندگی میں مجھے اتنا کچھ دیا کہ کوئی اور شعبہ دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں پڑھاتی معاشیات تھی اور اپنے طالبعلموں کو لکھنا' بولنا اور اسٹیج پر لانا میری اضافی ذمّہ داری تھی۔ یہ بات تو طے ہے درسگاہ کا اسٹیج بعد کی زندگی کو بامعنی بنانے کا پہلا اور ضروری ذریعہ ہوتا ہے اور انگلی پکڑ کر اس تک لانے والا استاد اپنے شاگردوں کے حافظے سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ بات میری سمجھ میں آ چکی تھی اور میں نے اپنے طالبعلموں کی انگلی تھام لی۔ یوں طالبعلم مجھ سے بہت قریب ہو گئے۔

جب اویس نے عندلیب کے بارے میں بتایا کہ یہ دو مجموعوں کی مالک اور خالق

ہیں۔ تب میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ عندلیب کو بنانے میں، میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں یا نہیں؟ مجھے ہر وقت یہ خوش فہمی رہتی ہے۔ لیکن حقیقت ہے کہ میں نے کوشش ضرور کی ہے کہ طالبعلموں کا ہاتھ تھامے رہوں اور اگر وہ کچھ بن سکتے ہیں تو میری ذرا سی کوشش سے ان میں لگن پیدا ہو جائے۔ میرے چالیس سالہ تدریسی دور کے تقریباً 80 ہزار طالبعلم اس کی گواہی دیں گے۔

میں نے اپنا محاسبہ شروع کیا۔ اور ساری رات پریشان رہی کہ اگر ایسا نکلا کہ عندلیب کی انگلی میں نے نہیں تھامی۔ اس میں شاعری کے جراثیم رہے ہوں اور میں نے اسے دریافت نہیں کیا ہو۔ اس کی صلاحیتوں کے پروان چڑھانے میں میں نے کوئی کردار انجام نہیں دیا ہو۔ نفی میں اگر جواب آیا تو یہ میری ہار ہوگی۔ میں چُوک کیوں گئی؟

لیکن جب عندلیب مجھ سے میرے گھر آ کر والہانہ ملیں تو گلے لگاتے ہوئے مجھے اپنی اس طالبہ پر جتنا پیار آیا اتنا ہی یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں نے کالج میں باقاعدگی سے ہونے والے بڑے اور عظیم الشّان مشاعروں میں کالج کے طالبعلموں کو اساتذہ کے ساتھ شرکت کا جو موقع دیا اور دیتی رہی اس میں عندلیب شامل تھیں۔ عندلیب نے بتایا کہ انہوں نے اسٹیج پر اپنا کلام پڑھنے کا پہلا تجربہ کالج کے ہی مشاعرے سے کیا۔ یہ جان کر ایسا لگا کہ بس عندلیب کو تو میں نے ہی شاعرہ بنایا ہے۔ یہ اطمینان اُس استاد سے پوچھئے جو صورت گری کا فریضہ جی جان سے ادا کرتا ہے۔

عندلیب شاعری کے ننھے ننھے جراثیم لیکر شادی کے بعد آسٹریلیا روانہ ہوگئیں۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بڑی محنت اور جدوجہد کی زندگی گزاری اور اس میں اتنی محو ہوئیں کہ اپنے شہر، اپنے لوگوں اپنے اساتذہ اور اپنی درسگاہ سے بھی غافل ہوگئیں۔ اور پھر دس برس بعد جب پہلی بار پلٹیں تو شہر اور حالات بہت بدل چکے تھے۔ لیکن جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور شوہر دُور چلے جاتے ہیں تب ہر عورت اپنے شہر اپنے والدین۔ اپنے لوگوں اور اپنی درسگاہ میں ضرور واپس آتی ہے۔ عندلیب بھی آئیں۔ مجھے اچھا لگا جب انہوں

نے پھول میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے فرطِ خوشی سے لپٹ کر کہا میں نے آپ کی یاد کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور آج مل کر سچ مچ میں بہت خوش ہوں۔

میں عندلیب کو اس وقت تو کوئی جواب نہ دے پائی سوائے اس احساس کے کہ تم نے 35 سال بعد مل کر مجھ پر بڑا احسان کیا کہ تم آئیں بھی تو خالی ہاتھ نہیں۔ تمہارے دونوں ہاتھوں میں علم کا دریا تمہارے احساسات، محسوسات، مشاہدات کا مجموعہ ہے۔ تم چاند چاہتی ہو تمہارا ہاتھ اوپر کی جانب ہے۔ تمہاری نظریں بلندی کی جانب ہیں۔ تم چاند کو اپنے آنچل میں اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتی ہو۔ چاند چاہنا علامت ہے بلندی کی طرف بڑھنا اور اس خواہش کا رکھنا عزم اور ہمت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ میں نے آپ ہی آپ کہا عندلیب تم جیسے شاگرد استاد کی زندگی بڑھاتے ہیں۔ اُن کے خون کی روانی تیز کرتے ہیں۔ ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ اُن کا اعتماد اور اُن کا غرور ہوتے ہیں۔

میرے 80 ہزار بچے دنیا بھر میں پھیلے اور بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ کمسن نقش و نگار لیکر درسگاہ میں آتے ہیں۔ اور پھر بعد میں ان کے چہرے کی لکیریں بدل جاتی ہیں ان کی صورتوں اور ناموں سے پہچاننا استاد کیلئے مشکل ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اپنا کوئی کام لیکر واپس آتا ہے تب استاد کو اس کی شناخت کرا دیتا ہے۔ استاد کو وہ پہچان لیتا ہے جس کے چہرے کے نقوش بس وقت کے ساتھ ڈھلک جاتے ہیں لیکن پہچان میں رہتے ہیں۔

امریکا کی عشرت آفرین، لندن کی نور جہاں نوری، کراچی کے ثروت حسین اور اب برِّاعظم آسٹریلیا کی عندلیب میری قوّت میرا اعتماد اور بھروسہ ہیں کہ میں نے زندگی ضائع نہیں کی۔ میں نے ساری زندگی نوکری نہیں کی درس دیا اور اسٹیج پر انگلی پکڑا کر صلاحیتوں کو بٹھایا اور منافع ہی منافع کمایا یعنی منصب پر فائز رہی۔ اپنے بچوں کی کامیابیوں پر خوش ہو کر اپنا قد بڑھانا ہے تو ہاں اپنے شاگرد بنائیے آپ کو عندلیب جیسے بچے بڑی خوشیاں دیں گے۔

حاضرین آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ساری تعریفیں اپنی جیب میں ڈال لیں اپنا قد بڑا کر لیا۔ اپنی ستائش کرتی رہی تو میرا جواب ہے کہ ہاں میں نے غلط کیا کیا؟

کیا آپ اپنے بچوں کے قد اپنے آپ سے بلند ہوتا دیکھ کر اپنی پرورش پر ناز نہیں کرتے۔ اسے اپنا Credit نہیں مانتے۔

اس کی شاعری پر گفتگو کرنے بڑے بڑے لوگ آئیں گے۔ میں تو اپنی شاگرد عندلیب کا تعارف کرانے آئی تھی کہ یہ علاّمہ اقبال گورنمنٹ کالج میں ستر کی دہائی میں میری شاگرد تھی اور طالبات کے ایک ایسے گروپ کی اچھی اور سلجھی ہوئی سمجھدار طالبہ تھی جہاں ادب و آداب کے ساتھ طالبعلمانہ شرارت اور اس کے ہی ساتھ زندگی میں کچھ نہ کچھ کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی تھا۔ اگر میری زندگی کچھ اور رہی اور کوئی اور عندلیب کہیں سے چاند کی آرزو لیکر مجھ تک آئی تب میں پھر اسی طرح مائیک پر آؤں گی۔ اسے اپنا بتاؤں گی۔ اپنا قد اونچا کروں گی اور اسے دعا دوں گی کہ اللہ اس کے آنگن میں چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی بکھیرے رکھے۔ اس کا وہ چاند جسے وہ چاہتی ہے کبھی نہ گہنائے اور وہ اس عارضی دنیا میں اپنا مستقل اور خوبصورت عکس چھوڑ کر جائے۔

(''میں چاند چاہتی ہوں'' کی تعارفی تقریب میں 17 مارچ

بروز ہفتہ 2007 صادقین لان میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

رسالہ تہذیب کی سلور جوبلی کے موقع پر

یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اتنے بزرگ اور قد آور علیگیر ینز کی موجودگی میں مجھے تہذیب کے قاری کی حیثیت سے یہاں کچھ کہنے کیلئے کہا گیا ہے۔ میں جو بس اتنی ہی علیگر ینز ہوں جو علم کے اس مقدس شہر میں پیدا ہوئی لیکن میرے پاؤں کے نشان بھی اس سرزمین پر نہیں پڑنے پائے تھے کہ مجھے وہاں سے جدا ہونا پڑا ہاں میں نے اپنا سب سے قیمتی رشتہ وہاں کی دوگز زمین کے ضرور حوالے کر دیا۔ اور میری ولدیت آج تک وہیں سے جڑی ہوئی ہے۔ اور اسی لئے علی گڑھ یونیورسٹی کا ان دیکھا قبرستان میری نظروں میں بسا رہتا ہے۔

''تہذیب'' وہاں ہی کی تہذیب کا ایک منہ بولتا شاہکار ہے جسے وہاں کے فارغ التحصیل طالبعلموں نے اپنا قرض اتارنے کیلئے جاری کیا جنہوں نے وہاں سے نہ صرف تعلیم پائی۔ تربیت حاصل کی۔ بلکہ وہاں کی تہذیب کو اپنی زندگیوں کا جزو بنالیا اور اسی کے باعث وہ آج خود تناور درخت بن کر اپنی چھاؤں میں اس شہر کے بچوں کو تہذیب کا وہی درس دینے کی کوشش کر رہے ہیں جسے سرسیّد احمد خان نے ان کی پھیلی ہوئی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اب بات اس کی ہے کہ کس کی جھولی میں کتنی وسعت ہے اور کس کی جھولی میں سو سو چھید ہیں۔

رسالہ تہذیب سید احمد خان کی وہ نشانی ہے کہ جس کی حفاظت جس نے کی وہ مراد پا گیا اور سرخرو ہوا۔ زندگی بامعنی گزاری اور اپنا نام بھی بڑے لوگوں کی فہرست میں لکھوا

گیا۔ 138 سال پہلے تہذیب الاخلاق نامی رسالے نے سرسید کی نگرانی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اوران کوترقی کی طرف مائل کرنے کیلئے جاری کیا تھا اور ہراچھی اورنئی بات کی طرح انہیں بھی بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

سرسید شاعر کی اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے اورتن من دھن کے پکے تھے سو انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کیلئے اسے لازمی جان کر ایسے ایسے مضامین لکھے جو آج شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں اوران کے زمانے میں بھی لوگوں نے اسے جھوم جھوم کر پڑھا اور عقیدت سے ان کی باتیں سن کراور پڑھ کراپنی اصلاح کرنے لگے۔

سید کی پیروی میں اولڈ بوائز نے اکابرواسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کرنے ان کی قدیم علمی اورعملی ترقیات کی یاد دہانی کیلئے اور مردہ دلوں کو ازسرِنو زندہ کرنے کی کوشش کرنے کے لیے کراچی سے تہذیب کا اجراء 1983 میں کیا اور آج 25 سال مکمل ہو جانے پراس کی سلور جوبلی منا رہے ہیں۔

تہذیب کے پہلے مدیراعلیٰ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔ میں پھر یادوں کو ان سے جوڑ کرمعتبر بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ جو میرے والد کے کلاس فیلوٗ دوست اور پڑوسی تھے۔ یونیورسٹی کیمپس کے یہ دوگھر صرف ایک دیوار سے جُڑے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کے آم ہمارے آنگن میں گرتے اور ہماری جامن کی شاخیں ان کے صحن میں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اور میں اپنے والد کی گود سے ان کی گود میں دن بھر میں بارہا منتقل ہوتی رہتی۔ کراچی میں پھر وہ میرے استاد بنے اور ان کی صورت میں میں نے اپنے والد کو یاد کیا جنہیں ہم لوگ علی گڑھ ہی میں امانتاً رکھ آئے تھے۔

تہذیب نکالتے ہوئے اولڈ بوائز بطورِ خاص جناب ذاکرعلی خان صاحب جناب

زیڈ اے نظامی صاحب۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اور دیگر نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ اس کے قاری کہاں سے آئیں گے۔ تب علم معاشیات کا یہ اصول یقیناً ان کے زیرِ نظر رہا ہوگا کہ Supply creates its own demand اور یہی ہوا بھی اس کے قاری نہ صرف علیگیر ینز رہے بلکہ دیگر بھی اپنی محرومی دور کرنے اور بہت کچھ اچھا پڑھنے اور جاننے کی چاہ میں اس کے قاری ہوگئے۔

نفع نقصان کی پرواہ کیے بغیر یہ اہم فریضہ آج تک پروان چڑھتا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ذاکر صاحب' نظامی صاحب اور اس پرچے سے جڑے ہوئے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ ابھی اور بہت سال اس کی خدمت پر مامور رکھے تاکہ یہ فریضہ وہ اسی تندہی سے انجام دیتے رہیں اور ہم جیسے معمولی اور کم علم لوگ اس کے قاری بن کر اپنی اپنی زندگیوں میں کچھ روشنی مستعار لے سکیں اور ہم بھی ایسے ایسے جیّد اور بڑے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل بنیں جنھوں نے دنیا میں آنے۔ سرسیّد احمد کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے اور حصولِ علم کے بعد اسے بانٹنے کا گرانقدر فریضہ انجام دیا ہے۔

پرنٹ میڈیا سے ہمارے نوجوانوں کی دلچسپی اب نہ ہونے کے برابر ہے اور الیکٹرانک میڈیا میں ریڈیو نے بھی دم توڑ دیا ہے۔ ان دونوں ذرائع نے ماضی میں علم کی ترویج کے لیے وہ کام کیے ہیں جن سے پاکستان کی اولین نسل نے فائدے اٹھائے لیکن اسی ذرائع کے ٹیلی ویژن نے نوجوانوں کی دلچسپی کے زاویئے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طاقتور ذریعہ ابلاغ ہے اور نوجوانوں کی اصلاح کرنے پر اگر کمربستہ ہو جائے تو دور کی بات نہیں کہ وہ بھی اکابرین کے کارناموں کو جانیں اور ان کی پیروی میں اپنی زندگی میں بھی کم از کم ایک شمع روشن کریں۔

ادبی' علمی اور تہذیبی پروگراموں کی کمی نے اس ذریعۂ ابلاغ کی پیشانی پر صرف تفریحی ذریعہ لکھ کر اس کی وقعت کم کردی ہے۔

کاش تہذیب اور اس جیسے اور رسالوں کی پیروی اور ان کی خدمات کے اعتراف

میں یہ ذریعۂ ابلاغ ایسے ایسے پروگرام ترتیب دے کہ اس کے دیکھنے والے پڑھنے کی جانب بھی مائل ہوں اور ذاکر علی صاحب اور دیگر ایڈیٹر صاحبان کے وہ اداریئے اور مضامین پڑھیں کہ جن کے پڑھنے سے دماغ روشن، دل منوّر اور زندگی جینے کا قرینہ پاتی ہے۔

تہذیب کے مضامین نئی نسل کے لیے رہنمائی کا وہ منارہ ہیں کہ جن سے ان کی زندگی کو منزل اور بہتر منزل ملنے کی نوید مل سکتی ہے یہ وہ رسالہ ہے جسے درسگاہوں کی لائبریری اور طالبعلموں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جسے پڑھنا شاملِ نصاب ہونا چاہئے۔ کاش ایسے اساتذہ بھی پیدا ہوں جو اصل نصاب پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایسے رسالوں کو موضوعِ گفتگو بنائیں اور اپنے اپنے طالب علموں میں جستجو پیدا کریں کہ وہ اپنے دن بھر کے گزارنے کے اوقات میں اس کے مطالعے کو لازمی محسوس کریں۔ ان کی طلب ایسی ایسی تحریروں میں رسد کے بڑھنے کا ذریعہ بنے گی اور رسد بڑھنے کے بعد معاشیات کا اصول پھر سچا ثابت ہوگا کہ Supply creates its own demand

میں آج کے اس رُوپہلے موقع پر تمام علیگیریز کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس فریضے کی بجا آوری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اور ہماری رہنمائی اپنی تحریروں سے کر رہے ہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات میں انہیں کیا مبارکباد دوں۔ ہاں اپنے رب سے دعا مانگتی ہوں کہ اللہ ان کی زندگیوں میں کئی کئی دہائیوں کا اضافہ کرے۔ یہ رسالہ ان کی نگرانی میں گولڈن جوبلی، پلاٹینیم جوبلی اور پھر صد سالہ سالگرہ بھی منانے کا اعزاز حاصل کرے۔ آئندہ صدی پھر اپنا ذاکر اور اپنا نظامی خود پیدا کر لے گی۔

آپ کی سماعتوں کا شکریہ!

(2 مئی 2005 رسالہ تہذیب کی سلور جوبلی کے موقع پر
علی گڑھ اولڈ بوائز کے لان میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

انسانوں کی تازہ فصل کی کہانی

یہ محفل ایک کہانی نویس کیلئے سجائی گئی ہے اور ایسی کسی محفل کے آداب میں یہ بات شامل نہیں کہ کوئی اور یہاں آئے اور اپنی کہانی سنائے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ کہانی نویس کے دوست اور ادب پسند ہیں۔ اسٹیج پر تشریف فرما شخصیات کہانی نویس کے فن پر گفتگو کرنے آئے ہیں۔ پھر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟

بس اس استدعا کے ساتھ کہ ہماری بھی ایک کہانی سن لیجیے۔

یہ 60 کی دہائی ہے بارہ تیرہ اور پندرہ برس کے چند بچے ایک جگہ جمع ہیں۔ یہ بچے شکل سے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ بس نام سے واقف ہیں۔ تعارف ہوتا ہے۔ یہ ہارون ہیں' یہ طاہر ہیں' یہ الیاس ہیں' یہ ظفر' انور' قدسیہ' عالیہ' فصیح' سکندر' کشور' شاہد' بدر نورالدین' نعیم' رشید' شکیب اور یونس اور یہ سلمان ہاشمی ہیں۔

بچے اس تعارف پر شوق بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں چھریرے بدن' شفقت سے بھرپور چہرے والے اچھے بھیّا ان بچوں کو دائرے کی شکل میں بٹھا رہے ہیں۔ درمیان میں ایک کرسی رکھی ہے جس کے بارے میں بچوں کو بتایا گیا کہ یہاں ایک بابا صاحب تشریف رکھیں گے اور تم لوگوں کو ان سے ملوانے کے لیے یہ اہتمام کیا گیا ہے۔

چند لمحوں بعد سفید کپڑوں میں ملبوس بابا صاحب تشریف لے آتے ہیں جن کی داڑھی اور سر کے بال بھی سفید ہیں۔ آنکھوں پر عینک اور عینک سے جھلکتی ذہین آنکھیں۔ ان بچوں کے سارے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں۔

چھریرے بدن والے نو عمر سے اچھے بھیّا نے ان بچوں کا تعارف بابا صاحب سے کرایا۔ ہر نام پر بابا صاحب گہری محبت بھری نظر ڈالتے پھر اچھے بھیّا نے ان بچوں سے کہا۔ بچو یہ ہمارے بابائے اردو مولوی عبدالحق ہیں۔ یہ وہی مولوی عبدالحق ہیں جنھوں نے تم سے اور ساری قوم سے اُردو یونیورسٹی کے لیے چندہ مانگا ہے۔

سب نے اشتیاق بھری نظروں سے بابائے اردو کو پھر دیکھا۔ گویا یہ بچے گزری ہوئی اور آنیوالی تاریخ کو اپنی آنکھوں میں سمولینا چاہتے ہوں۔

اچھے بھیّا نے 213 روپے کی ننھی سے تھیلی بابائے اردو کے کانپتے ہاتھوں پر رکھ دی۔ ''یہ رقم تو معمولی ہے۔ مگر بزمِ امروز کے بچوں نے یہ رقم اپنے جیب خرچ سے بچا بچا کر جمع کی ہے۔'' ہر بچے نے اپنی رقم کا حصہ یاد کیا۔ کسی نے ایک روپیہ کسی نے دو روپے کسی نے پانچ اور چند ایک بچوں نے دس روپے کی رقم اس مد میں دی تھی۔ بچوں نے یہ تفصیل بزمِ امروز کے صفحے پر پڑھ بھی لی تھی۔ اور آج وہ ان بچوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جنھوں نے دس روپئے کی بڑی رقم دی تھی۔ بابائے اردو کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ انہوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کپکپائی آواز میں کہا۔

''سرسید کو چندہ جمع کرنے کا فن آتا تھا۔ اور وہ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر اسٹیج تک آ گئے۔ اور مسلم یونیورسٹی بنا ڈالی۔ لیکن میں اس فن سے ناواقف ہوں۔ ملک کے امیر کبیر لوگوں نے میری بوڑھی آواز اور جوان ارادوں پر کان تک نہ دھرا۔ بزمِ امروز کے بچوں نے 213 روپئے کی اتنی بڑی رقم جمع کر لی ہے۔ میرا دل خوشی سے جھوم رہا ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ اردو یونیورسٹی جب بھی بنی تمہارے 213 روپئے کی تختی نام بہ نام وہاں ضرور نصب ہوگی۔''

بابائے اردو کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ اور وہ اسے ایک مخصوص طریقے سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ذرا اور بلند کیا اور بچوں سے مخاطب ہوئے۔

تم سب لکھنے والے بچے ہو۔ جانتے ہو قلم کیسے پکڑا جاتا ہے پھر انہوں نے پہلی دو

انگلیوں اور انگوٹھے کی گرفت میں قلم دیدیا اور سب بچوں سے باری باری اس کا مظاہرہ کرنے کیلئے کہا۔

''بچو بس قلم ایسے ہی پکڑنا۔'' بچے خوش ہوگئے۔ محفل تمام ہوئی۔ کچھ ہی عرصے بعد بابائے اُردو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ دو دہائی اچھے بھیّا یعنی افضل صدیقی نے ان بچوں کو قلم کی حرمت سکھائی۔ بچے بھی بڑے ہوگئے۔ وہ ان کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ اور سب بچوں کو متحد رکھتے رہے۔

پھر افضل صدیقی روزنامہ امن نکال کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے نہ روزنامہ امروز رہا۔ نہ بابائے اردو نہ افضل صدیقی یہ بچے شہر کی بھیڑ میں گم ہوگئے۔ ہارون رشید اسلامیہ کالج کے پرنسپل بنے ظفر مسعود اوتھ کمشنر ہوئے۔ الیاس قلم لیکر ڈٹ گئے اور کہانیاں لکھتے رہے فصیح چغتائی جناح اسپتال میں دواؤں کی بُو کا شکار ہوگئے۔ قلم ان کی جیب سے کہیں گر گیا۔ بدرُالدُّجیٰ جام مشورو یونیورسٹی میں استاد بن گئے۔ کتابیں لکھتے رہے۔ طاہر نقوی افسانے لکھتے اور ٹیلیویژن پر ڈرامے کی دھوم مچاتے رہے۔ قدسیہ کم عمری میں قضا کا شکار ہوگئیں شاہنواز کے ایم سی کے راستوں میں گم ہوگئیں۔ رشید شکیب نے بہادر یار جنگ اکیڈمی اپنالی۔ لکھتے بھی رہے اور لکھاتے بھی رہے۔ نورالدین شاہد بھی قلم کو نہ بھولے۔ یونس نے شاعری میں دھوم مچائی۔ نعیم نگار قانون کی کتابوں میں گم ہوگئیں۔ شاہد بخاری بھی لکھنا لکھانا نہیں بھولے۔ سلیمان ہاشمی جہاز کی کپتانی پر فائز ہوئے اور سمندروں کی سیر پر نکل گئے۔ انور افسراب انور شعور بن کر جنگ میں قطع لکھ رہے ہیں لکھ تو اور بھی بہت سے بچے رہے ہیں۔ جواب بڑے ہوگئے ہیں اور شہر کے طول وعرض میں کھوکر رہ گئے ہیں۔

ہاں عرفان جو اس وقت ایک سانولا سلونا سا بچہ تھا بڑا ہو کر ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ میں نوکری کر رہا ہے۔ اور افسانے لکھ رہا ہے۔

علی عرفان عابدی بزمِ امروز کا ہمارا ساتھی ہے۔ چار دہائیوں سے ہم مل رہے ہیں۔ ایک بے نام، گمنام اور مضبوط رشتہ ہمارے درمیان ہمیشہ رہا ہے۔ ہم ہر محفل میں ایک

دوسرے کو دیکھ کر قریب آ جاتے ہیں۔

نوشابہ صدیقی اور عرفان عابدی اور دیگر بچوں کی یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ اب تو انسانوں کی تازہ فصل بھی آ گئی ہے۔ ابھی تو ہم نے زندگی کی شاہراہ پر چلتے پھرتے' محنت کرتے' اپنا مقام بناتے' ایک دوسرے سے محبت کرتے' خلوص برتتے گزارے ہیں' اب ہم بچے زندگی کی اس شاہراہ' پر ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں اپنے اپنے بچوں کے ہاتھ ہیں اور ہم اپنی اپنی جگہ بابا صاحب اور اچھے بھیا بن کر اُن کے ہاتھوں میں قلم تھما رہے ہیں ہم کہہ رہے ہیں کہ بچو تم بھی کہانیاں لکھو کہ کہانی کی دنیا کے اجنبی چہرے بھی بڑے مانوس ہوتے ہیں۔

ہم نے اور عرفان نے تقریبات میں ملاقات کی ہے۔ اور اپنے دل میں ایک دوسرے کے لیے بچوں جیسا انمول پیار سمیٹا ہوا ہے۔ جو کسی غرض سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔

عرفان عابدی ہمارے تمہارے بچپن کے وہ تمام بچے جو زندگی کی بھیڑ میں اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ میں ان تمام قلمی ساتھیوں کی طرف سے تمہیں ان کی محبتوں اور فخر و غرور کا ایک چھوٹا سا تحفہ پیش کرنے یہاں آئی ہوں۔ تمہیں تمہاری کتاب کی مبارکباد دینے آئی ہوں۔

ڈرو نہیں میں تم سے اپنے اس قلم کا تقاضا نہیں کروں گی جو تم نے بابائے اردو کی محفل میں قلم پکڑنے کے مظاہرے کے سلسلے میں میرے ہاتھ سے لیا تھا اور پھر واپس بھی نہیں کیا۔

مجھے اس خوش فہمی میں رہنے دو کہ تم نے آج تک سارے افسانے اسی قلم سے لکھے ہیں۔

میں جب یہاں آ رہی تھی تو بزمِ امروز کے تمام بچوں نے مجھے گھیر لیا۔ انہوں نے کہا بزمِ امروز سے اپنا قلمی سفر شروع کرنے والے عرفان عابدی کو ہماری طرف سے مبارکباد پہنچا دو۔ اس سے کہو ہم سب تمہیں دعا دیتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ میں آگے بڑھی۔ تو بابا صاحب' میرے تمہارے اچھے بھیا سامنے آ گئے۔ قلم پکڑنا میں نے سکھایا' بابا صاحب نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ میں بہت دور تک راہ دکھاتا رہا۔

بابا صاحب اور اچھے بھیا باری باری مجھ سے مخاطب ہوئے۔ نوشابہ جارہی ہو تو ہماری طرف سے بھی عرفان کے لیے دعائیں لیکر جاؤ۔ تو عرفان عابدی' میری طرف سے اور ان دونوں محترم ہستیوں کی طرف سے دعائیں لو' اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

بس حاضرین مجھے یہی کہانی سنانی تھی، سننے کا شکریہ!

(22 نومبر 1999ء ''انسانوں کی تازہ فصل'' کی تقریبِ تعارف کے موقع پر)

☆☆☆☆

شبِ ماہتاب

کراچی شہر میں اونچی اونچی عمارتوں اور روز بروز سکڑتی ہوئی سڑکوں نے کشادگی کا سارا احساس ختم کر دیا ہے۔ یہاں ہر بڑے شہر کی طرح موسموں کے تبدیل ہونے کا کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ برسات کی آمد' بارش کا حُسن' بہار وخزاں سے بے نیاز یہاں کے لوگ صرف گرمی اور سردی کے دو موسم جانتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فلیٹ ہوں یا بڑے بڑے بنگلے۔ کہیں سے بھی آسمان دکھائی نہیں دیتا۔ آنگن اور آنگن میں اترتا چاند اب خواب کی باتیں اور ماضی کی کہانی ہے۔ چاند' تارے بادل بجلی دیکھے بغیر نسلیں پل کر جوان اور اب بڑھاپے کی جانب چل پڑی ہیں۔ سمندر سے باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ سو اس کی لہریں چاندنی رات میں چپ چاپ آسمان کی جانب لپکتی ہیں اور چاند سے اس کی محبت کا تماشہ دیکھنے والا اب کوئی نہیں۔

گھر میں ٹیلی ویژن نے بچے بڑے ہر ایک کو اپنے گرد سمیٹ لیا ہے۔ اور یہی وہ مکمل تفریح ہے آسانی سے میسر بھی ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہاں کے لوگوں میں شعری ذوق یا حُسن سے محبت ہی نہ ہو۔ یہاں بھی لوگ چاندنی کے متوالے ہیں۔ جب بھی کہیں ایسی محفلیں سجتی ہیں۔ روح تک کو گرما اور تڑپا دیتی ہیں۔

27 ستمبر 99ء اور چاند کی سولہویں رات یعنی شبِ مہتاب فرزانہ رحمٰن نے سجائی۔ بیچ لگژری چاروں طرف پانی اور بیچ میں ایک چھوٹے سے جزیرے کی مانند ہے۔

آسمان پر پورا چاند' بادلوں سے آنکھ مچولی۔ کبھی مطلع صاف ہو جاتا تو کئی جلتے بجھتے چراغ کی مانند تارے دمک جاتے۔ اور آسمان کی چادر جھلملانے لگتی۔ چاند کا ساتھی ایک تارا تھا جو چاند کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ ہم کبھی پانی میں اس کا عکس دیکھتے اور کبھی آسمان پر۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی۔ چاند کی دھیمی اور ٹھنڈی روشنی چاند سے چہرے والے شفیق دوستوں کی ہلکی ہلکی سے جھلک دکھا رہی تھی۔ شہر کے لوگ اپنی آدھی نیند پوری کر چکے تھے۔ مگر ماہی گیر اپنی کشتی میں روزگار کی تلاش پر تھے۔ جال بکھیر کر مچھلیاں سمیٹ رہے تھے۔ میں نے غور سے ان مچھیروں کو دیکھا ان میں رومانویت نام کی کوئی لہر موجود ہی نہیں تھی لیکن وہ خود دوسروں کے لیے انتہائی شاعرانہ ماحول پیش کر رہے تھے۔ دور تک پھیلا ہوا جال سمندر کی سطح پر ایک سفید لکیر کی مانند تھا۔

ایسے میں ظفر رامے خوبصورت دھن بجانے والوں کے نرغے میں بیٹھے غزلیں بکھیر رہے تھے۔ ظفر رامے کا شعری ذوق' غزلوں کا انتخاب لفظ کی ادائیگی اور مفہوم سمجھ کر دل کی آواز اور ساز کے ساتھ ان کا گانا ہمیں کسی اور انجانی اور سہانی دنیا میں پہنچا چکا تھا۔

نثار میرے ساتھ بیٹھے تھے اور آگے پیچھے بے شمار شناسا چہرے' لیکن ایسا جیسے ہم اکیلے ہوں اور صرف چاند ہمارے ساتھ ہو۔

ہم پر نشہ طاری تھا۔ ایک کے بعد ایک غزلیں چاند کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چاند ایک تارے کے ہمراہ اب قریب آ چکا تھا۔ ظفر رامے گا رہے تھے

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے
ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

خوبصورت احساس' خوبصورت الفاظ اور خوبصورت آواز ماحول پر سکوت طاری تھا۔

اور پھر

مجھے اپنی چادر میں یوں ڈھانپ لو
زمیں آسماں کچھ دکھائی نہ دے

ہم آنکھیں موندے بس احساس کے جھولے میں جھول رہے تھے۔

ہمارے دن، مہینے، سال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے چاند دیکھنا ہم مسلمانوں کی روایت میں بھی شامل ہے۔

ہماری خوشی غم چاند کی تاریخوں سے عبارت ہیں۔ گویا چاند تو ہماری زندگی میں شامل ہے۔ خواہ وہ چاند آسمان کا ہو یا اپنے پیاروں کے چاند جیسے چہرے۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے میری تنہائی پر مسکراتے رہے اس غزل کے ساتھ ہی موڈ اور ماحول بدل گیا۔ غزل کی دنیا نے چاروں طرف سے ہمیں نرغے میں لے لیا۔

نہ جانے کس لئے آتی ہیں چاندنی راتیں
یہ چاند ڈوب کے رہ جائے چاندنی نہ رہے

اسی کے ساتھ ساتھ ہم نے گنگنانا شروع کر دیا۔

سہانی چاندنی راتیں ہمیں سونے نہیں دیتیں
تمہارے پیار کی باتیں ہمیں سونے نہیں دیتیں
کہیں ایسا نہ ہو لگ جائے دل میں آگ پانی سے
بدل لیں راستہ اپنا گھٹائیں مہربانی سے

ہم اپنی عمر کا وہ حصہ بے شک پیچھے چھوڑ آئے ہیں جو رومانویت کا دور کہلاتا ہے مگر دل میں ایسے سارے احساس سدا جاگتے رہتے ہیں۔

پیار بھرے دو شرمیلے نین

پھر

تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں

جیسے گاتے ہمیں اور ہم سب کو تڑپا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

چاند، چاند، ظفر رامے فوراً بولے۔ فکر نہ کریں ڈیڑھ سو چاند غزلیں ساتھ لایا ہوں۔ اور ساتھ ہی انہوں نے دھن چھیڑی

بادلوں میں چُھپ رہا ہے چاند کیوں
اپنی زلف کی گھٹا سے پوچھ لو

سامنے کون بیٹھا تھا ہمیں یہ تو نظر نہ آیا لیکن ظفر رامے کے اشارے سامنے ہی کے لئے تھے۔

چاندنی پڑی ہوئی ہے ماند کیوں
اپنے حُسن کی ضیاء سے پوچھ لو

اس بار ہم نے ضیاء الحق قاسمی کی طرف دیکھا۔ مگر ضیاء صاحب سر جھکائے جانے کسے یاد کر رہے تھے۔

آسمان پر پھٹے پھٹے بادل تھے اور چاند بیچ کے راستے طے کرتا ہوا کبھی بدلیوں میں چُھپ جاتا اور کبھی سامنے آجاتا۔ وہ اپنے ہی کھیل میں لگا ہوا تھا۔

رامے صاحب کی آواز گونج رہی تھی

ہم تم ہوں گے بادل ہوگا　　رقص میں سارا جنگل ہوگا

انہوں نے یہ بول کچھ یوں گائے کہ ہماری کرسی ہمیں ڈولتی محسوس ہوئی مچھلیوں کی اٹھکیلیاں، پانی میں ان کا ابھرنا اور پھر چُھپ جانا اپنی جگہ ایک رقص تھا۔ وہ دھیمی سی آواز جو ان کے غوطہ لگانے سے پیدا ہوتی ہماری جان لے لیتی۔ پانی ہلتا اور لگتا چاند رقص کرتے کرتے گود میں آگرے گا۔ کہ مشہور گیت کی دھن نے غضب ڈھا دیا۔

محلے کی سب سے پُرانی نشانی
وہ بُڑھیا جسے بچے کہتے تھے نانی

یہ محفل اب اپنی آب و تاب بڑھاتی جا رہی تھی کہ محسن بھوپالی کی خوبصورت غزل کی

دھن چھڑ گئی۔

چاہت میں کیا دنیا داری عشق میں کیسی مجبوری
لوگوں کا کیا سمجھانے دو ان کی اپنی مجبوری

گلبہار بانو کی آواز اپنی جگہ لیکن ظفر رامے نے محفل لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عدیم ہاشمی کی غزل سونے پر سہاگہ تھی۔

آنکھوں میں آنسوؤں کو ابھرنے نہیں دیا
مٹی میں موتیوں کو بکھرنے نہیں دیا
جس راہ پر پڑے تھے ترے پاؤں کے نشاں
اس راہ سے کسی کو گزرنے نہیں دیا
چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے گزر گئے
نشۂ محبتوں کا اترنے نہیں دیا
ہر بار ہے نیا ترے ملنے کا ذائقہ
ایسا ثمر کسی بھی شجر نے نہیں دیا
ساحل دکھائی دے تو رہا تھا بہت قریب
کشتی کو راستہ ہی بھنور نے نہیں دیا
اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے عدیمؔ اس کو مکرنے نہیں دیا

یہ غزل، ظفر رامے کی آواز، چاندنی رات، پانی کا کنارہ، مچھلیوں کی آواز اور باذوق ساتھیوں کی مدہوشی مجھے ایک لمحے کو ایسا لگا کہ جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔

بے ہوشی اور مدہوشی نے مجھے جانے کہاں پہنچا دیا

چاروں طرف سے واہ واہ کی آواز آئی تو لگا کہ میں میلوں کا سفر پل بھر میں طے کر کے واپس اس محفل میں آ گئی ہوں۔ لیکن وہ دنیا جہاں میں پہنچ گئی تھی۔ میرا دل اپنی

مٹھی میں لئے ہوئے تھی۔

میں جو رات دیر سے گھر کے باہر رہنے پر اپنے آپ کو مجرم سمجھنا شروع ہو جاتی ہوں۔ اور ہر محفل سے بھاگ کر جلدی گھر جانا چاہتی ہوں۔ بچوں سے رات کی دوری کبھی اچھی نہیں لگی۔ یوں رات کی ہر محفل میں ادھوری چھوڑ آتی ہوں۔ مگر اب نہ تو مجھے وقت کا ہوش تھا۔ نہ بچے یاد تھے۔ شاید صبح تک بھی یہ محفل چلتی تو میں یوں ہی نیند سے کوسوں دور لیے آنکھیں اور سوچوں سے دور لیے ذہن، غزل کی اس محفل میں بیٹھی رہتی محفل میں شاید یکسانیت آ گئی تھی یا یہ کہ کلیجہ اب پھٹ پڑنے کو تھا کہ ظفر رامے کو ان کی جگہ سے اٹھا دیا گیا۔ ہماری جان میں جان آئی۔ یوں بھی ہم اس کرسی پر تھے جہاں ایک رسی درمیان میں تھی اور دور تک گہرا سیاہ پانی تھا۔ ہمارے ہی برابر بیٹھے ضیاء الحق قاسمی نے محفل کی شان میں قصیدہ سنانے کا سوچا۔

شب مہتاب کتنی ضو فشاں ہے
یہ فرزانہ کے گھر میں میہماں ہے

لب ساحل یہ کیسی کہکشاں ہے — کہ فرزانہ ہی اس کی میزباں ہے
زمیں پر چاندنی اتری ہوئی ہے — بہت پُرجوش بحرِ بیکراں ہے
ہوائیں گنگناتی پھر رہی ہیں — کہ جیسے کوئی بلبل نغمہ خواں ہے
فضا میں روشنی پھیلی ہوئی ہے — بہت ہی روح پرور یہ سماں ہے
یہ سورج منہ چھپائے پھر رہا ہے — ہمارا چاند میرِ کارواں ہے
زمیں زادوں پہ رشک آتا ہے اس کو — بہت خاموش نیلا آسماں ہے
یہ کتنا لگژری ہے بیچ ہوٹل — اسی کے بیچ ہی جائے اماں ہے
یہاں تجدید ہوتی ہے وفا کی — یہی وہ اجتماعِ دوستاں ہے
سرِ ساحل یہ محفل جو سجی ہے — محبت کا یہی سیلِ رواں ہے
فرشتے بھی اترتے ہیں یہیں پر — یہی تو بے گماں رشکِ جہاں ہے

قاسمی صاحب نے اپنے تاثرات نظم میں سموئے تو ہمیں لگا کہ یہی احساسات ہمارے بھی ہیں۔

ظفر رامے پھر اپنی گدی پر آ بیٹھے۔ شاید وہ چائے پانی سے لطف اندوز ہو کر آئے تھے۔ جی تو ہمارا بھی چاہا کہ گرم گرم چائے ہو جائے کہ فرزانہ کی میزباں بھری آواز مائیک سے سنائی دی۔

چائے حاضر ہے پیجئے صاحب۔

فرزانہ دلوں کو چھو لینے کا فن جانتی ہیں اور ذہنوں کو پڑھنا بھی جانتی ہیں۔ بروقت چائے ملی اور گرما گرم ملی جی ہی جی میں ہر ایک نے فرزانہ کو دعا دی۔

جیئو اور محفلیں سجاتی رہو۔ خلوص لٹاتی رہو۔ وفا بانٹتی رہو۔ دعائیں لیتی رہو۔ ہم نے پیاری فرزانہ کی شان میں یہ چھوٹی سی نظم اسی وقت کہہ ڈالی۔

تب ہی فرزانہ میرے قریب آئیں۔ چائے تو پی لو۔

مجھے یہ بتاتے اچھا نہیں لگا کہ میں چائے پیتی نہیں صرف دوسروں کو پیتا دیکھ کر تازہ دم ہو جاتی ہوں۔

ظفر رامے نے پھر تابڑ توڑ غزلیں سنانی شروع کیں۔ ہم نے عبید اللہ علیم سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

اب اس قدر بھی نہ گاؤ کہ دم نکل جائے۔

دم نکلنا اپنے عروج پر تھا کہ فرمائشی پروگرام شروع ہوگیا۔ اقبال بانو کے عشق میں میں کمر کمر ڈوبی ہوئی ہوں۔ فوراً ہی ان کی غزل کی فرمائش کر دی۔

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے۔

ظفر رامے نے اقبال بانو جیسی خوبصورت ادائیگی کے ساتھ غزل گائی۔ دوسری فرمائش تھی حکیم ناصر کی غزل کی۔

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔

ظفر رامے جیسے ایسے گانے کیلئے تیار ہی بیٹھے تھے۔

چند اضافی شعروں کے ساتھ اس غزل نے بڑا مزہ دیا۔

دُور کے چاند سے مٹی کا دیا ہی بہتر
جو غریبوں نے سرِ شام جلا رکھا ہے
جاگ جائے نہ کہیں چاند کی آہٹ سُن کر
لوریاں دے کے سمندر کو سُلا رکھا ہے
صرف تیرا ہی تو اک نام ہے میرے دل میں
اور اس گھر کے درو بام میں کیا رکھا ہے؟

جس طرح مچھلیاں ابھرا بھر کر پھر غوطہ لگا رہی تھیں اسی طرح میرا اور میرے خیال میں سب کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

کہ ایسے ہی میں مچھیروں کی کشتی جال پھینکتی ہوئی پھر برابر سے گزری۔ جال میں پرویا ہوا سفید سفید پتھر دور تک سمندر کی سطح پر پھیل کر اک لکیر سی بنا رہا تھا۔ یہ سماں بڑا سہانا تھا کہ ظفر رامے کی آواز پھر گونجی۔

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چُرالوں اگر بُرا نہ لگے
جو ڈوبنا ہو تو پھر اس سکون سے ڈوبو
کہ آس پاس کی لہروں کو بھی پتہ نہ چلے

میں آواز کے دھارے میں بہہ رہی تھی۔ جذبات کے غلبے میں آ کر میں نے رسی پر سر ٹکایا تو نثار ہوشیار ہوگئے۔ انہیں میرے پاگل پن پر کوئی شک کبھی نہیں رہا ہے۔ ہاتھ تھام لیا۔

بس بس ہوش میں آ جاؤ!

ظفر رائے گا رہے تھے۔

حُسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
اُن کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

اور یہی غزل اختتامی غزل بھی تھی۔

اس محفل کے وہ تمام شاعر جن کا کلام گایا گیا تھا اور ظفر رائے کی آواز اور محبوبؔ راحت اور امید علی کی موسیقی نے زندگی کی بہت ساری خوبصورت راتوں میں اس ایک رات کا اضافہ کر دیا کہ اس کی یاد مدتوں بھی ذہن سے محو نہیں ہوگی۔ اور جب جب یہ رات یاد آئے گی تو اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ ساتھ فرزانہ رحمٰن کی دوستی کی گرہ بھی دل میں مضبوط سے مضبوط ہوتی جائے گی۔

ہم نے ماہتاب کو الوداع کہا اور پھر سے ملنے کا وعدہ کیا رات کے دو بج رہے تھے اور ہم سنسان سڑک پر گاڑی بھگاتے گھر کی جانب رواں دواں تھے۔ چاند ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں گنگنا رہی تھی۔

میں ایک شام چُرا لوں اگر بُرا نہ لگے

(27 ستمبر 1999 چودھویں کے چاند کے سلسلے میں شبِ ماہتاب کے نام سے منعقد ہونیوالی ایک محفل۔ جو بیچ لگژری ہوٹل میں منعقد ہوئی۔)

☆☆☆☆

یادگار پکنک معاشیات والوں کی

کراچی کے مختلف کالجوں کے معاشیات کے اساتذہ نے نیا تعلیمی سال پکنک سے شروع کیا۔ اس کا اہتمام اکنامکس ٹیچرز فورم کے چند سرگرم اساتذہ نے کیا۔

یہ اعتراف انتہائی ضروری ہے کہ قائدِ ملّت کالج کے ریاض قادری اور شوکت آرا سینٹ پیٹرکس کالج کے مذکور الرحمٰن اور سرسید کالج کی شاہجہاں حمید نے پروگرام کو کامیاب بنانے میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔

سینڈز پٹ کے مقام پر 22 ستمبر کی ابر آلود صبح ایک خوبصورت ہٹ میں اس وقت رونق آ گئی جب اساتذہ کا قافلہ معہ اپنی اپنی فیملی کے پہنچا۔

صبح دس بجے کے قریب ساحلِ سمندر پر جب اساتذہ کا قافلہ پہنچا تو سمندر کی لہریں مون سون کے باعث تند و تیز ہو رہی تھیں۔ سمندر کے تیور دیکھتے ہوئے فوراً ہی فیصلہ کیا گیا کہ کوئی فرد بھی گھٹنے گھٹنے پانی سے آگے نہیں جائے گا۔ اور بچوں کو بطورِ خاص اس بات کی تاکید کی گئی۔

سامان رکھتے ہی تمام اساتذہ اور دیگر افراد خانہ نے سمندر کا رخ کیا۔ ہنسی مذاق اور جملے بازی کا ایک طوفان تھا جو موجوں کی طغیانی سے بھی زیادہ غضبناک تھا۔

چند اساتذہ خصوصاً ہنسی مذاق اور برجستہ جملوں کے تند و تیز طوفان کی زد میں تھے۔ اساتذہ کی فیملی نے آپس میں تعارف کے بعد اپنا ایک الگ گروپ بنا لیا۔ بچوں کی ٹولی الگ بن چکی تھی۔ جو مختلف کھیلوں کے ساتھ ساتھ لہروں کے اتار چڑھاؤ کے مزے بھی

لے رہے تھے۔ ایک طرف کچن انچارج مذکور اور ریاض قادری نے دیگیں سنبھالیں۔ کولڈ ڈرنک کی بوتل ٹھنڈی کرنے کیلئے بڑے ٹب میں برف ڈالی گئی پانی کے کولر اس موقع پر اپنے تنگئی داماں پر ندامت محسوس کر رہے تھے۔ اور اپنی قسمت سے شاکی بھی تھے کہ ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر پانی کا اچھال اور خوبصورت لہریں جو آزاد فضا میں سورج' اور رات میں چاند سے باتیں کرتی ہیں اور جنہیں دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں تو دوسری طرف کولر کا بند ماحول جہاں پانی کی زندگی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ نہ لہریں' نہ موجیں' نہ آفتاب کی گرمی نہ چاند کی ٹھنڈی روشنی' نہ ستاروں کا جھلمل شوخ چنچل انداز ان سب سے محروم کولر میں بند پانی بس اس بات کا منتظر کہ کب کوئی آئے ٹونٹی دبائے اور گلاس میں ڈال کر غٹ غٹ پی جائے۔ کولر کے اندھیرے کے بعد انسان کا اندھا پیٹ۔ بس یہی قسمت ہے ہماری اور جو کسی نے گلاس کا پانی چھلکایا بھی تو گرم گرم ریت میں دو بوند پانی کا وجود ہی کیا۔ نہ زمین کو ٹھنڈک ملی نہ دو بوند پانی کو سکون۔ اسے تو ریت کی آغوش میں جا کر فنا ہی ہو جانا ہے۔ ایک طرف کچھ لوگوں نے شلوار اور پتلون کے پائینچے چڑھائے اور سمندر کی جانب یوں بڑھے گویا تیر کر کنارے پر لگ جانے کا عزم ان میں پختہ ہو چکا ہے۔ اسی لمحے اقبال کا یہ شعر اچانک میرے لبوں پر آ گیا۔

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

سمندر کی تیز تیز اٹھنے والی لہریں ساحل تک بڑھتیں۔ ریت مٹی اور پتھروں کا ریلا ساحل تک آتا اور پھر جب وہی لہریں دوبارہ سمندر کا رخ کرتیں تو جیسے پاؤں اکھڑنے لگتے۔ پیر کے نیچے سے نکلتی ریت سے وجود کا برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے میں آواز آتی ''ذرا مدثر کو سنبھالنا' ننھا مُنا وجود کہیں بہہ کر سمندر کا نہ ہو جائے۔'' مدثر اپنا سارا زور لگا کر ریت میں پاؤں دبائے جواب دیتے۔ ''دیکھو مجال ہے جو پاؤں میں لرزش بھی آئی ہو۔ ایسی ایسی بے شمار لہریں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔''

یہ صحیح ہے مدثر کا عزم اب تک جوان ہے اگرچہ اب انہوں نے جوانی کو بے دلی سے خیر باد کہہ ہی دیا ہے کہا جاتا ہے کہ لڑکے کی ماں کبھی بوڑھی نہیں ہوتی سو بن بیاہا مرد بھی سدا جوان ہی رہتا ہے۔

مذکور کو قورمے کی دیگ کے علاوہ صرف اپنے چشمے کی فکر تھی کہ کہیں وہ سمندر کی نظر نہ ہو جائے۔ وہ بار بار اپنی بیگم کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔ ایک نے کہا بھی کہ یہ تمہاری بیگم ہیں چشمہ تو نہیں بن سکتیں۔ مگر مذکور کو شاید وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بیگم کا ساتھ پا کر پہلا پہلا وعدہ کیا تھا۔

''تم میری آنکھوں کا نور بن کر رہو گی اگر چہ میں چشمے کا ساتھ بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

دوسری جانب مسز مذکور کا حافظہ بھی کام کر رہا تھا۔ وعدہ تو انہوں نے بھی ایک کیا تھا۔ ''میں تمہاری ساتھی ہی نہیں لاٹھی بھی بن کر رہوں گی۔''

ریاض قادری تو آج نہ اپنے بس میں تھے نہ دوسروں کے جیسے ہی کوئی لہر انہیں اکھاڑنے کا بندوبست کرتی وہ بیگم کو آواز دیتے۔ ''سنئے آپ کہاں ہیں؟'' بیگم میاں سے بے نیاز اپنی بیٹی اور بہو کو بانہوں میں سمیٹے سمندر کے خطرناک عزائم سے نبرد آزما تھیں۔ ویسے بھی ان کا کہنا تھا ''تم جہاں رہو خوش رہو'' ہم نے بھابھی سے بی جمالو کے انداز میں کہا۔

''ریاض کسی کے خیالوں میں گم ہیں۔'' دھیمے سروں میں گا رہے ہیں۔ اور سمندر کی طغیانی میں اپنے گمشدہ ماضی کا کوئی ورق پلٹ رہے ہیں۔ حالت نازک ہے جائیے اور انہیں ماضی سے حال میں لے آئیے۔ ورنہ آج ان کا خوبصورت پوشیدہ ماضی سب کچھ تہہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔''

مگر بھابھی اپنے عشق میں پکی نکلیں۔

''رہنے دیں وہ کہاں جائیں گے۔'' شوکت نے جھٹ کہا اب ریاض ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔ ''شوکت حق کالج نبھا رہی تھیں۔''

''جی نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ میرے میاں صرف مجھے چاہتے ہیں۔''

''واہ واہ'' ہر طرف سے دادو تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ ''بیوی ہو تو ایسی ہو۔''

ایسے میں ہم نے پھر بی جمالو کے کردار کو اپنایا۔ شاہجہاں سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ''کیا خیال ہے آج بھابھی کو وہ بات بتادی جائے۔'' شاہجہاں بھی ایک نمبر نکلیں۔ ریاض قادری ان کے کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ کبھی کا بدلہ لینے پر وہ بھی آمادہ ہوگئیں۔ ''رہنے دو نو شاید بلاوجہ بھابھی ڈسٹرب ہو جائیں گی اب تو ریاض شاید اسے بھول بھی چکے ہوں۔''

بھابھی کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر بھئی ان کا عشق بڑا پکا اور سچا ہے۔ ''مجھے معلوم ہے ریاض ایسے ویسے نہیں۔ انہوں نے تو صرف مجھ سے عشق کیا ہے۔''

واہ واہ کا ایک اور نعرہ گونجا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ اس شور میں سمندر کی لہروں کا شور بھی دب کر رہ گیا ہے۔

غلام علی بھی ہمارے ساتھ آئے تھے پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ ایسے گم ہوئے کہ ہم سب نے مل کر سنجیدگی کی چادر اوڑھ لی۔ اور قریب تھا کہ آنسوؤں کے سمندر کے سیلاب میں بہہ کر ہم انہیں مرحوم قرار دیدیتے اور سمندر کی بے رحم موجوں کو کوستے کہ ایک جانب سے شور اٹھا۔

''وہ رہے غلام علی۔''

سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔ پتہ چلا وہ چند مچھیروں کے جال میں پھنسے سمندر کے وار سہہ رہے تھے۔

جی کو ذرا قرار تو آیا لیکن پھر وہی سوچ ہم سب کو گھیر لے گئی۔ جانے ماضی کا کونسا حسین ورق اس جال سے وابستہ ہے۔ کیا وہ جل پری تھیں کہ جن کے خیال میں وہ تنہا ڈوب رہے تھے یا ابھر رہے تھے۔ کئی لوگ اس طرف دوڑے۔ مگر انہوں نے کسی سوال سے پہلے خود ہی جواب دے دیا۔ ''جی نہیں میں تو اپنی بیگم کی کمی محسوس کر رہا تھا۔''

کاش وہ بھی یہاں ہمارے ساتھ ہوتیں۔'' ان کی کاش میں اتنا درد تھا کہ کئی ایک کی

آنکھیں لبریز ہوگئیں مگر غلام علی نے پھر بھی تنہا ہی رہنا مناسب سمجھا اور واپس آنے سے انکار کر گئے۔

ایک بار پھر یہ جملہ دہرایا گیا۔ ''خیر جاؤ جہاں رہو خوش رہو۔ سمندر کے اندر یا سمندر کے باہر۔''

مگر کچھ لوگوں نے منت سماجت جاری رکھی۔ کوششیں تو ان کی بھی رائیگاں گئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اور جب وہ کسی بے رحم تھپیڑے کی زد میں بھی آ جائیں تو ان کی مدد کو کوئی نہ دوڑے وہ جانیں اور لہریں جانیں۔

میں نے تو اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ زندہ بچ بھی گئے تو کوئی سخت سا بدلہ لئے بغیر نہیں رہوں گی۔

ہمارے ساتھ سعید صدیقی بھی تھے۔ اگرچہ وہ ہم سے جونیئر ہیں لیکن بالوں کی سفیدی اور چہرے کی سنجیدگی نے اب کچھ ایسا روپ دھار لیا ہے کہ ہم انہیں تم سے آپ کہنے لگے ہیں۔ ہمارے اس تخاطب پر وہ پہلے تو حیران ہوئے پھر پریشان' پریشان کچھ اس لئے کہ ہم نے نثار سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ سعید صدیقی ہیں ہم سے دس سال سینئر۔ نثار نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اخلاق برتا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور فوراً عادتاً ہاتھ بڑھا دیا مصافحہ کیلئے۔

سعید صدیقی نے مجھ سے سرگوشی کی۔

''تم نے نثار کو اپنی عمر کیا بتائی ہے؟''

خبردار! جو تم نے اب کسی سے یہ کہا بھی کہ ہم یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ تمہارے بال اور چہرے کی ویرانیاں ہمیں پریشان کردیں گی بات آئی گئی ہوگئی مگر سعید صدیقی کے چہرے پر پھیلی اداسی نے ہم سب کو چونکا کر دیا۔

''تزئین بولی شاید بھابھی سے لڑ کر آئے ہیں۔''

''شوکت کا خیال تھا شاید بھابھی کو چھوڑ ہی بیٹھے ہیں۔''

شاہجہاں نے کہا پریشانی کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؟
کچھ اور...... اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تزئین نے پوچھا مگر تزئین کو اس کا کوئی جواب نہیں مل پایا۔
جب دوپہر کے کھانے پر ہم سب جمع ہوئے تو پھر ہم نے انہیں بھرپور نظروں سے دیکھا۔ پریشانی تو ہے اور ضرور ہے معلوم کر کے رہیں گے۔
کھانے سے فارغ ہوتے ہی غلام علی منگی میں ایک نئے منگی نے جنم لیا اور ہم سب دم بخود رہ گئے۔
''چلو لوگو میں تمہیں گانا سناتا ہوں۔''
ہم سب دائرہ بنا کر بیٹھ گئے اور غلام علی منگی نے گنگنانا شروع کیا۔ سندھی لہجہ اب غائب تھا۔ وہ اردو لہجے میں خوبصورت غزلیں سنا رہے تھے۔
ہم سب مسحور بھی تھے اور پریشان بھی منگی کا یہ رخ ہمارے لئے بالکل نیا تھا۔
اسی دوران سعید صدیقی کے دل کی اداسی کچھ اور ابھر آئی۔
میں بھی آپ کو ایک غزل سناتا ہوں۔
اب پھر ہمارے چونکنے کی باری تھی۔ یہ غزل میری اپنی لکھی ہوئی ہے۔ ہم تیسری بار چونکے۔
بھئی سعید صاحب دو انکشاف اور ایک ساتھ شاعر بھی ترنمؔ بھی۔
کون ترنمؔ؟ تزئین نے اپنی روائتی بھول پن سے پوچھا۔
ایسا قہقہہ پڑا کہ کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑ گئے۔
سعید صاحب شروع کریں اپنی غزل اور اپنا ترنمؔ۔ شعروں کے انتخاب سے سارے راز فاش ہو جائیں گے۔ میں نے لقمہ دیا۔
اور واقعی یکے بعد دیگرے جب انتہائی مغموم غزلوں کی تکرار ہوئی تو تشویش لاحق ہوئی۔
''سعید صاحب سب خیریت تو ہے؟''

اب کے وہ برس پڑے۔ بھئی یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے آپ کے درمیان میں بالکل خیریت سے ہوں۔" ہم سب ان کے گرجنے پر سہم کر رہ گئے اسی دوران فصیح اللہ نے مدثر کی طرف اشارہ کیا جو کرسی میں کچھ اس طرح دھنسے ہوئے تھے کہ اب کرسی سے ان کی علیحدگی مشکل تھی ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ وہ ہمیشہ سمندر کی طرح گہرے رہے ہیں بلکہ سمندر تو پھر بھی اپنا سب کچھ ساحل پر آ کر اگل دیتا ہے۔ مگر مدثر کا دل تو سمندر سے بھی گہرا نکلا۔ جانے اس میں کیا کیا دفن ہے مگر مجال ہے کہ کوئی اُچھال آئے۔ اور اسی جھنجھلاہٹ میں ہم نے مدثر کی پھر سے کھینچائی شروع کر دی۔ خاصی دیر کی جدوجہد کے بعد ہم پسپا ہو چکے تھے۔ مدثر نے نہ ایک بھی کروٹ بدلی اور نہ چہرے کے سونے پن میں کوئی تبدیلی آئی۔ عجب جماجمایا انسان ہے بھلا کوئی سمندر کوئی لہر کوئی تلاطم تو اس کے پاؤں میں جنبش لائے۔ کچھ نہیں تو احتجاج کرے غصہ کرے، چیخے چلائے، مگر نہیں صاحب وہاں ایک چپ تھی ہم سب کے بے شمار وار پر بھی۔

حسن اکبر کی سمجھ میں اب بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہم لوگوں کو اُن کا فون نمبر ملا کہاں سے؟ وہ بے شمار بار یہ سوال کر چکے تھے۔

مگر سمندر کنارے انہوں نے یہ سوال پھر کرنا ضروری سمجھا۔ وہ میری جانب غضبناک نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ فون کر کے مدعو کرنے کی میں گناہگار تھی۔

بھائی میرے، میں ان پے در پے سوال سے اکتا چکی تھی۔

تم جو یہ روز روز گھر بدلتے ہو، بتاؤ کیوں؟ قرار کیوں نہیں ہے تمہیں میں نے کتنے گھر بدل لیے۔ صرف تین چار ہی تو بدلے ہیں اس عرصے میں۔ اعتراف زبان پر آ گیا۔

"صرف تین چار! اُف میرے اللہ! اتنے گھر تو ہم نے پوری عمر میں نہیں بدلے۔ شوکت بولیں۔

"ابھی آپ کی عمر ہی کتنی ہے؟" میں نے جملہ کسا۔

شوکت کے پاس دو ہاتھ ہیں اور ایک ہاتھ کا استعمال میری پیٹھ پر انہوں نے کر دیا۔

اپنی دونوں آنکھوں میں سے ایک آنکھ کا استعمال میں نے بھی کیا۔

میرا فون نمبر؟ حسن اکبر نے ہمارے ہاتھ اور آنکھ کے عمل کو دخل در معقولات سمجھا۔ وہ پھر موضوع کی طرف ہمیں لے آئے۔

تو بھائی حسن اکبر ہوا یوں کہ کسی مالک مکان کے علم میں یہ بات آ گئی کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ اور وہ مجھے جانتا تھا۔ بس پھر کیا تھا اس نے میرا گھر دیکھ لیا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ تمام کرایہ دلواؤں جو تم مختلف مالک مکانوں کا لے کر بھاگے ہو۔

زوردار قہقہہ پڑا۔ موقعہ قہقہے کا نہیں ہے قرار دادِ مذمت کا ہے ہماری سبکی ہوئی ہے۔ معاشیات کے تمام اساتذہ کی ایمانداری مشکوک ہوگئی ہے۔ شرافت کو بٹہ لگ گیا ہے۔ منہ پر کالک مل گئی ہے۔ عزّتِ نفس مجروح ہوئی ہے...... جتنے منفی جملے مجھے آتے تھے ایک سانس میں ادا کر دیئے۔

حسن اکبر غرّاتے ہوئے میری جانب بڑھے۔ان کے ارادے خطرناک تھے میں نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے ساحل پر دوڑ لگائی مگر بھلا ہو اس تند و تیز لہر کا جس نے حسن اکبر کو چت کر دیا۔ سر سے پاؤں تلک پانی میں شرابور حسن اکبر کا غصہ ہرن ہو چکا تھا۔

''بات یہ نہیں ہے۔'' صفائی پھر بھی وہ پیش کرنا چاہتے تھے'' سب ایک ساتھ چیخے ہمیں نوشابہ کی بات کا یقین ہے۔''تم کچھ نہ بولو'' بے چارے حسن اکبر پر فائن لگ چکا تھا کہ اب تمہیں آلو کی وہ چاٹ کھلانی پڑے گی جو کبھی تم جوانی میں بیگم سے بنوا کر لایا کرتے تھے۔ ہمیں وہ یاد اس لئے رہ گئی تھی کہ مزے کے علاوہ اس میں برف کے ٹکڑے بھی پڑے ہوتے تھے۔

فصیح اللہ نے مہرِ تصدیق ثبت کی۔ بالکل صحیح ہے ذرا ذکر فصیح اللہ کا بھی ہو جائے۔

بھائی فصیح ہمارے ان ساتھیوں میں سے ایک ہیں کہ ہم نے جب نئی نئی نوکری شروع کی تھی اور جسے اب تیس برس سے اوپر ہو چکے ہیں تو اپنی عمر کے اس خطرناک دور میں صرف فصیح اللہ صاحب ہمیں ایسے لگے کہ اگر ان سے راہ و رسم رکھی جائے تو خطرے کی

کوئی بات بھی نہ ہوگی اور بزرگانہ مشورے بھی ملتے رہیں گے۔

ان کی وجۂ شہرت بھی یہی تھی مگر ہمیں ان کے سفید بال اور پانوں سے بھرا منہ بھلا لگا تھا۔ منہ اس لئے کہ پیک کو منہ میں بھر کر وہ بس خاموشی پر اکتفا کرتے تھے۔ اور ہمیں ان دنوں سننا کم اور بولنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اور ہماری اس ضرورت پر صرف بھائی فصیح اللہ پورے اترتے تھے۔ ہماری نوجوانی اور نادانی' ان کا بڑھاپا اور مُشفقانہ برتاؤ۔ بس زندگی میں مزا آ گیا تھا۔ اس وقت کا ہمارا شرارتی گروپ جو الحمدللہ اب بھی برقرار ہے۔ ہم سب کی مشترکہ پسند بس فصیح اللہ تھے ان میں بڑا ٹھہراؤ ہے۔ وقت کو انہوں نے مٹھی میں دبالیا ہے۔ مجال ہے ان میں کوئی تبدیلی آئی ہو۔ ویسی ہی شلوار قمیض بلکہ شاید وہی شلوار قمیض۔ سفید بال اور پان سے بھرا بھرایا منہ اور چہرے پر دوستی' محبت اور مروّت کی چمک دمک گویا انہوں نے ماضی حال مستقبل کے درمیان کوئی خط کبھی نہیں کھینچا لیکن آج جب ہمارے بالوں میں بھی سفیدی چھلک آئی ہے اور ہم بولنے کے مقابلے میں سننے پر بھی اکثر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ احتجاج کر بیٹھے۔ بھائی پان تھوک دیں۔ مگر سمندر میں نہیں۔ ہمیں لال سمندر سے خوف آتا ہے۔

لیکن بھائی فصیح اللہ کی مجبوری یہ تھی کہ جب تک پان منہ میں رہتا ہے ان کی آنکھیں کُھلی رہتی ہیں۔

بہر حال ان کی موجودگی خواہ خاموشی ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو ہمیں بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اور پکنک کا مزا دوبالا کر رہی تھی۔

ایک آدھ یاران کے جذبات میں بھی طغیانی آئی۔ ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ منہ سے پیک چھلک اٹھی۔

''اُجلے اُجلے کپڑوں پر پیک لال لال'' سب نے ہندوستانی گانا کورس میں گانا شروع کر دیا۔

اسی دوران ہماری نظریں احسان بھائی پر پڑیں۔ یہ صاحب بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔

ان کا بھی مقابلہ سمندر سے ہے۔ گہرے اور ٹھہرے۔ ہم نے تو انہیں نہ کبھی منہ کھول کر ہنستے دیکھا نہ زور سے بولتے پایا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں یا کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بس اپنی مرضی کا ردِ عمل ہم سوچ بیٹھتے ہیں اور انہیں اس بات پر بھی اعتراض نہیں۔

وہ بھی بغیر بیگم کے آئے تھے۔ ہم نے پوچھا بھابھی کہاں ہیں؟ تو احتجاج بھرے لہجے میں پہلی بار بولے۔

آپ لوگوں نے کب بلایا تھا؟

بھائی ہم نے فون تو کیا تھا؟ شاہجہاں بولیں۔

''کب کیا تھا فون؟''

اوہ شاہجہاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

میں نے آپ کی پہلی والی بیگم کو فون کر دیا تھا۔ معاف کریں۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ اب تو آپ دوسری کے ساتھ رہ رہے ہیں احسان کا رنگ متغیر تھا۔

اس صریحاً الزام پر بس نہیں چلتا تھا کہ وہ شاہجہاں کے پرخچے اڑا دیں۔

میں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ شاہجہاں آپ کی کلاس فیلو ہیں اس کی یہ خطا معاف کر دیں۔

معاف کیا کردوں؟ میری صرف ایک بیگم ہیں اور یہ کہہ رہی ہیں......''

بس بس جانے دیں۔ آپ بھی خوب ہیں۔ اب تک صرف ایک بیگم پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں نہ کیا ساتھ لے آئے ہوتے۔ آخر اور لوگ بھی تو لائے ہیں۔ اب کوئی ہم انہیں سمندر میں تو نہیں ڈال دیتے۔

جواباً انہوں نے منہ کھولا ہی تھا کہ شوکت نے ان کی جانب گھور کر دیکھا۔

بس آج کیلئے اتنا ہی کافی ہے

ہم سب نے اور میں نے ذرا زور سے شوکت کی پیٹھ تھپکی جس کی نظروں کی گرمی اور خوف نے احسان کے احتجاج کو پانی پانی کر دیا شوکت بھی ایک نمبر کی خاتون ہیں۔

''لاؤ پان کھلاؤ۔ تمہارے منہ میں آخر پان آیا کہاں سے؟

یہ آئیٹم اکیلا تمہارے پاس کیوں ہے؟''

ہم نے ذرا اور زور زور سے چلاّنا شروع کر دیا۔

خاتون' میں اسے اپنے خاص الخاص پاندان سے بنا کر لائی ہوں یہ پبلک ملکیت نہیں ہے۔ درخواست کرو گی اور شرافت سے کرو گی تو ایک پان عطا کر دوں گی۔؟

پان کی خاطر تو شوکت کی جان بھی چلی جائے تو کم ہے۔''دیدونا ڈیئر ایک پان۔ بس ایک پان کا سوال ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات'' شوکت کو زیر کر کے بڑا مزا آیا۔

مسز عالم اور تزئین سر جوڑے جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ہم نے سننا بھی چاہا مگر احتیاط کچھ زیادہ تھی نہ سن سکے۔

تزئین ہماری بڑی پیاری دوست ہے۔ ملتی ہے تو جی جان سے حاضر اور جو نہ ملے تو سالوں گزر جائے۔

مجھے یاد آیا کہ 20 سال پہلے میرے بڑے بیٹے کی پیدائش پر اس کا فون آیا تھا۔ مبارکباد کا۔ اور اس بات کا بھی کہ میں آؤں گی۔ ہم جب ملتے ہیں۔ فون کا ذکر میری طرف سے ہوتا ہے۔ اور وعدے کی تجدید تزئین کی طرف سے۔ اس بار سمندر کو گواہ بنا کر تزئین نے پھر وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گی۔ اگر نہ آ سکی تو کم از کم اس کی شادی پر تو ضرور آؤں گی۔ اور اگر نہیں تو اس کے پہلے بچے کی پیدائش پر تو ضرور آؤں گی۔ میں نے اسے چھیڑا۔ وہ عادت کے مطابق صفائی پیش کرتی رہی اور ہم سب کا ہنس ہنس کر بُرا حال تھا۔

اچانک ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان دو لوگ کم ہیں ابرار صاحب اور منگی صاحب پتہ چلا سمندر کا سب سے زیادہ استعمال وہی کر رہے ہیں۔

بالشت بھر کی سفید داڑھی والے ابرار صاحب کی نوجوانی اس وقت قابلِ دید تھی۔ وہ بیگم بچوں کو بھول کر لہروں سے نبرد آزما تھے۔ میں نے اسی لمحے سوچ لیا واپسی پر شاید وہی کم ہوں انہوں نے میرے ہاتھ میں کیمرہ دیکھ کر نعرہ لگایا۔''نوشابہ ہماری تصویر ہماری

بیگم کے ساتھ بنا دو۔"

"ابرار صاحب آپ کی بیگم کدھر ہیں۔ آپ تو لہروں کے ساتھ ہیں۔" انہوں نے بیگم کو آواز دی۔

ہم نے کیمرہ ان کی جانب کیا۔ بٹن دبانے سے پہلے ہی غلام علی اپنی خفگی بھری صورت لیے سامنے سے گزرے تو میں نے انہیں فوکس کیا مگر فوراً ہی ایک تند و تیز موج نے میرا توازن بگاڑ دیا۔ کیمرہ اور اپنے پرس سمیت میں پانی میں گر چکی تھی۔ کیمرے میں پانی بھر گیا اور تمام ریل بیکار گئی۔ پرس میں رکھا موبائل بھی جام ہو چکا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا نقصان پروفیسر غلام علی میں تم سے نہ وصول کروں تو میرا نام بدل دینا۔ میں نے بھیگے بھیگے اپنا یہ عزم دُہرایا۔

کیمرے کی خرابی کے بعد پکنک کا مزا آدھا ادھورا ہو کر رہ گیا اور اسی وقت سمندر کو گواہ بنا کر قسم کھائی گئی کہ ایک اور پکنک عنقریب منائی جائے گی۔

ادھر غلام علی کا غصہ اب تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

اور جو میں ڈوب جاتی تب؟ کیا پھر بھی وہ مجھ سے یونہی ناراض رہتے؟ میں نے سوال کیا۔

کہو تو چار آدمی پکڑ کر سمندر میں ڈال دیں۔ شاہجہاں بولیں شوکت میں ماما کوٹ کوٹ کر بھری ہے ایک رسی غلام علی کی کمر سے باندھ کر ہٹ کی جالی میں باندھ دینا تا کہ ڈیڈ باڈی کو گھر پہنچایا جا سکے۔

اسی ہنسی مذاق میں یاد آیا کہ چائے پی جائے ریاض قادری کی باورچی کی روح پھر بیدار ہوئی۔

مذکور اور ریاض نے ملکر چائے بنائی۔ ہم سب تھک کر بیٹھ چکے تھے۔ شلوار نچوڑ کر پانی نکالنے کی ناکام کوشش ہو رہی تھی۔ چپس کے ساتھ گرم گرم چائے اور پھر مزا یہ کہ خود کچھ نہیں کرنا پڑا۔ سامنے چائے آ گئی۔ ہم نے اعتراف کیا" چائے اچھی ہے"

ریاض بولے۔ گواہ رہنا ہم نے کسی خاتون کو کچن میں جانے کی زحمت نہیں دی۔ آج ہم گھر کے کچن کا قرض چکا رہے ہیں بہت اچھے۔ سب نے تائید کی۔

بچے چائے سے بے نیاز چپس، اور کولڈ ڈرنک کے مزے لوٹ رہے تھے کہ اچانک سعید صدیقی کو اپنے بیٹے کی یاد آ گئی۔ ''مجھے ایئر پورٹ جانا ہے۔''

سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر شفق کے رنگ نمایاں تھے۔ سمندر میں ڈوبتا سورج حسین نظارہ پیش کر دیا تھا۔ سمندر کا اچھال اور بھی بڑھ رہا تھا۔ سمندر سے چاند کا عشق ویسے بھی مشہور ہے۔ چاند کی 16 یا 17 تاریخ تھی اگرچہ چاند اب گھٹنے پر تھا مگر سمندر کی لہریں اچھل اچھل کر اسے آسمان میں ڈھونڈ رہی تھیں۔

بُھٹّے والے کے ٹھیلے سے سارے بُھٹّے ریاض اٹھالائے ہم نے بُھٹّے کھاتے ہوئے سامان سمیٹنا شروع کیا تو گیلے کپڑوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ جو ہمارے تھے اور اب ہم صاف ستھرے سوکھے کپڑے پہنے ساحل کو خیر باد کہنے والے تھے۔ مگر اچانک یکلخت یہ فیصلہ ہو گیا کہ ایک صاحب کو اس بات پر انعام دیا جائے کہ سمندر کے کنارے آ کر مجال ہے ان کے پاؤں بھی بھیگے ہوں صاف سفید براق کپڑے لئے نثار صاحب ہم سب کی بھیگی حالت دیکھ کر صرف ترس کھاتے رہے۔

مگر ترس ہمیں ان پر آ رہا تھا کہ شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے نثار صاحب سمندر کو صرف دور دور ہی سے کیوں دیکھتے رہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

مسئلہ سارا یہ تھا کہ ہٹ کے منتظم وہی تھے۔ اور ہم سب ان سے تعلقات بگاڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ کہ اگلی پکنک بھی ان ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ ویسے بھی ہم ان کا کیا کر سکتے تھے۔ لاکھ جملے کستے۔ سناتے وہ تو اپنی ایک دھیمی سی مسکراہٹ سے ساری بلا ٹال دیا کرتے ہیں۔

لیکن ایک سوال میرے ذہن میں موجود تھا۔ کیا ان کے ماضی میں بھی کوئی سمندر، کوئی کنارا۔ طوفان یا لہریں پائی جاتی ہیں؟ میں نے اس سوال کو اپنے ذہن میں قید کر لیا۔ میں جانتی تھی کہ اگر یہ پوچھا گیا تو شیطانوں کا یہ ٹولا پورا پنڈورا باکس کھول دے گا۔

مگر صاحب یہ مسئلہ اپنی جگہ رہا کہ سمندر کی گہرائی زیادہ ہے یا نثار صاحب کی سوچیں؟ اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں بھی نہیں جو ان کے ساتھ پورے چوبیس برس سے رہ رہی ہوں۔ اور انشاء اللہ اگلے سال زندگی رہی تو اسی ساحل سمندر پر اپنے ان ہی ساتھیوں کے ساتھ اپنی شادی کی سلور جوبلی مناؤں گی۔

صبح سے شام تک کی پکنک کا احوال اپنی جگہ لیکن واپسی پر شاہجہاں کی پکنک بس نے جو تیور دکھائے وہ بُھلائے نہ بُھلایا جا سکے گا۔ اِدھر کا قافلہ اُدھر اور اُدھر کا اِدھر دھرا رہ گیا بس ریت میں کچھ ایسی دھنسی کہ میں نہ مانوں کے مصداق گل محمد ہو کر رہ گئی۔

اس لمحے بس اور بس ڈرائیور سے لیکر شاہجہاں کی چوائس تک سب موضوع پر گفتگو ہوئی لیکن حکومت پر نکتہ چینی اپنے عروج پر تھی۔ جو لوگ سینڈز پٹ گئے ہیں وہ جانتے ہیں اور جو نہیں گئے وہ سن لیں کہ وہاں کی سڑک صرف ان بچوں کے لیے بنائی گئی ہے جو تین پہیوں کی سائیکل چلاتے ہیں۔ لیکن اگر دونوں جانب سے سائیکلیں بیک وقت آ جائیں تو انہیں بھی کراس کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔

اگر اس سڑک کی تصویر کھینچ کر میں الفاظ کی شکل دوں تو یہ کہنا کافی ہوگا کہ سڑک نہیں بلکہ معشوق کی مانگ ہے حکومت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا جا رہا تھا کہ اسے یہ بات جان لینا چاہیے کہ پکنک کنبوں اور گروپ کے شکل میں منائی جاتی ہے۔ اور زیادہ لوگوں کے لیے بڑی بس ہی یہاں لائی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کے سب فیصلے صحیح ہوتے ہیں۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ لوگ بڑی گاڑیاں کیوں لاتے ہیں۔؟

سڑکیں بنانا حکومت کی ذمہ داری ضرور ہے لیکن اگر وہ یہ کام نہیں کرتی تو کیا وہ صرف یہ کام نہیں کرتی؟ آخر لوگوں کو سڑکوں پر اعتراض کیوں ہے؟ اپنے آنے پر کیوں نہیں؟

بس ریت میں پھنسی تھی اور اس کے پیچھے ہماری ہائی روف کا راستہ بھی بند تھا۔ لیکن سعید صدیقی کا خیال تھا کہ اس بات میں شاہجہاں کی کوئی چال ہے۔ انہیں تو آج ایئرپورٹ پہنچنا ہے۔

احسان صاحب غالباً ہمیشہ وقت پر گھر پہنچنے کے عادی ہیں۔ یا آج یہ ہم سب کو باور کرانا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی بیگم کو مطلع کرنا تھا کہ وہ وقتِ مقرّرہ پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ پریشان نہ ہونا۔ میرا موبائل تو سمندر میں نہا کر نکلا تھا لہٰذا میں تو بچ گئی سعید صدیقی کے جیب سے زبردستی ان کا موبائل احسان صاحب کی خیریت کیلئے چھینا گیا۔

گھر والوں کو کسی آنے والے فون کا انتظار نہ تھا۔ لہٰذا کسی نے نہ اٹھایا۔ ہونٹوں نکلی بات کوٹھوں چڑھی۔ یہاں سے وہاں تک بات پہنچ گئی کہ مسز احسان نے موقع غنیمت جان کر کہیں اور کا پروگرام بنالیا ہے۔

احسان صاحب بیگم کی وکالت کرتے رہے۔ اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ فون خراب ہوگا۔ بھلا فون خراب ہوتے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟

ان کی دلیل کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور وہ خود پریشان تھے۔

احسان صاحب نے سعید صاحب کی جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ایک اور فون اپنے پڑوس میں کر ڈالا۔

شاہجہاں کا کہنا تھا کہ ہم سب کا کہا کام کر گیا ہے اور انہوں نے بیگم کی ماضی کی سرگرمیوں کی بھی رپورٹ پڑوسیوں سے طلب کرلی ہے۔ اب بے چاری مسز احسان کی خیر نہیں۔

سعید صدیقی مجھے صدیقی ہونے کا واسطہ دے کر کہہ رہے تھے کہ اگر یہ بس ریت سے باہر بھی آ گئی تو خدشہ ہے کہ چلنے کے قابل نہیں رہے گی۔ اس صورت میں جہاز ایئرپورٹ پر پہنچ جائے گا مجھے چاہیے کہ انہیں اس ویران راستے سے نکال کر کسی آباد جگہ چھوڑ دوں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ میرا سلوک سعید صدیقی کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے؟

شاہجہاں پر اعتراضات کی بوچھاڑ تھی۔ مگر ان خاتون کی یہ صفت ہے کہ اپنی ایک مسکراہٹ سے بڑے سے بڑا طوفان ٹال دیتی ہیں۔ سوال پر ذرّہ برابر بھی کوئی اثر نہ پڑا ہاں کبھی کبھی وہ میرے کان میں پھونک دیتیں۔

''سمجھ لوں گی میں اس سے''

''اس سے ان کا اشارہ کس کی طرف تھا۔'' اس کے جملہ حقوق محفوظ تھے۔ بہرحال سعید صدیقی کے موبائل نے کام دکھایا اور جواب میں ایک نئی بس ہمیں لینے آ پہنچی۔

پرانی بس کے باعث جو ٹریفک جام ہونے کے متاثرین تھے انہوں نے مل جل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور آخر کا اس چیونٹی کی مانند جو بار بار چڑھتی تھی اور گرتی تھی۔ پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ یہ لوگ بھی کامیاب ہو گئے۔

اس سلسلے میں متضاد دعوے تھے۔ حسن اکبر نے اسے اپنی طاقت کا کمال قرار دیا۔ تو منگی نے اپنی مردانگی کا۔ ابرار صاحب کا کہنا تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور جو خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی تھی وہ قبول ہوئی ہے۔

مدثر بے چارے نے اپنے جُثّہ پر نظر ڈالی اور کسی دعوے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر فصیح اللہ نے سچ کہا یہ سعید صدیقی کے دل سے نکلی فریاد ہے۔ یا احسان کے وسوسوں کا کمال ہے۔

بہر حال وقتِ رُخصت آ پہنچا بڑی گاڑی میں سارا قافلہ اور ہائی روف میں ہم حقیر فقیر۔

جب ہم دونوں کی منزل مختلف ٹھہری تو اس اکیلے راستے پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے انتقامی جذبے کو تقویت دی۔ غلام علی سے بدلہ لینا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں پہل کرتی پہلا فون گھر پہنچ کر جو مجھے ملا وہ غلام علی کے گھر سے تھا۔

بھابھی کے لہجے میں پریشانی تھی۔ ''وہ ابھی تک نہیں پہنچے'' میں نے جلے لہجے میں جواب دیا ''اور پہنچیں گے بھی نہیں۔''

بھابھی کی چیخ نکلنے سے پہلے میں نے اپنا لہجہ مدھم کیا اور یہ انکشاف کر ڈالا کہ وہ

خیر النساء کے ساتھ کہیں گئے ہیں ہمارے ساتھ تو گئے ہی نہیں تھے۔

کون خیر النساء؟ بھابھی نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو معلوم نہیں بھابھی؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے جواب دیا۔ پھر تو بھابھی آپ مجھے بیچ میں نہ ڈالیں۔ یہ معاملہ بہت پرانا ہے۔''

بھابھی کی پریشانی اب یہ نہیں تھی کہ وہ اب تک نہیں پہنچے بلکہ یہ تھی کہ خیر النساء کون ہیں؟

آج پکنک ہوئے مہینہ ہونے کو آ رہا ہے۔ ہم سب نے فون پر پکنک کی یادوں کو کئی بار ایکسچینج کیا ہے لیکن غلام علی نے ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔

اور ہم نے بھی طے کر رکھا ہے کہ جب تک وہ کیمرہ اور موبائل کا جرمانہ ادا نہیں کریں گے۔ ہم افواہ سازی کا اپنا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ شاہجہاں کا ارادہ تو یہ بھی ہے کہ ایک خیر النساء ان کے گھر بھیج کیوں نہ دی جائے۔ میں نے اپنا دل موم کرلیا۔ نہیں شاہجہاں بھابھی بس ایک ہی اچھی۔

(24 اپریل 2000ء سینڈز پٹ ہٹ میں پڑھا گیا دوسری پکنک کے موقع پر)

☆☆☆☆

کالج کی یادیں ـــــ ساتھیوں کی باتیں

آج کی شام اپنے پیارے کالج کے پرانے ساتھی طالبعلموں کو خوش آمدید کہتی ہوں ساتھیو! سابق طلباء انجمنوں کے جہاں دوسرے اور بہت سے فوائد ہیں وہاں سب سے خوشگوار پہلو یہ ہے کہ ہم وقت کی قید سے آزاد ہو کر ماضی کے اُن دنوں میں پہنچ جاتے ہیں جب ہمارے چہرے کے خدو خال دلکش ہوتے تھے۔ ہم نوعمر ہوتے تھے۔ خواہشات اور خوابوں کا طوفان ہوتا تھا جو ہمارے اندر توڑ پھوڑ کرتا رہتا۔ امنگیں' آرزوئیں' حوصلہ اور طاقت ایسی کہ بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا جانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ لڑ پڑتے اور جیت کر دم لیتے۔ خواب دیکھتے اور خوش رہتے۔ مستقبل کے سہانے دنوں کے تانے بانے بُنتے جی چاہتا کلاس روم کے تھکا دینے والے دن جلد ہی ختم ہو جائیں۔ خالی جیب میں ڈھیر سارے پیسے آ جائیں۔ ٹیسٹ ٹیوٹوریل کے آزار سے بچ جائیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھنے کے دن گزر جائیں۔ گرمی کی طویل دوپہروں میں امتحان دینے کی تیاریاں ختم ہو جائیں۔ پیر پھیلا کر خوب سوئیں۔ اپنی مرضی سے اٹھیں اور اساتذہ کے خوف سے آزاد ہو جائیں۔ لیکن ان دنوں ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ طویل دو پہریں۔ یہ اساتذہ کے تھکا دینے والے لیکچر اور کالج میں گزارے دن جب چلے جاتے ہیں تب کبھی لوٹ کر نہیں آتے اور یہ دن زندگی کے خوبصورت دن ہوتے ہیں۔ روزانہ کے چند آنے دو آنے تنگی سے گھبرا کر کینٹین سے نکل آنے کی راحتیں پھر میسر نہیں ہوتیں۔ ہم ان دنوں مستقبل کے سہانے دنوں کے تانے بُنتے ضرور ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ جب ہم اپنی اپنی منزلوں پر پہنچیں گے تو کس قدر تھک چکے ہوں گے اور اس تھکن کا اثر ہمارے شگفتہ چہروں پر بھی پڑے گا ماتھے کی

لکیریں گہری اور بڑھتی عمر کی تمام تر تیب وار شکنیں عیاں ہو جائیں گی ہمارے خواب تو پورے ہو چکے ہوں گے مگر ماضی ہمارے سامنے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اکڑ کر کھڑا ہو جائے گا۔ "کیا تم ہمیں بھول سکو گے؟ اس کا یہ سوال گرمی کی طویل دوپہروں میں ہمیں بے چین کر دے گا۔ ہمارے تمام ساتھی اپنی اپنی یادوں کے ساتھ راتوں کی نیند چھین لیں گے اور ہم سے پوچھیں گے "خواب تو تمہارے پورے ہو گئے۔ یہ بتاؤ ان خوابوں کو Share کرنے والے راستے کی اونچ نیچ میں جو گم ہو گئے ہیں انہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤ گے۔ وہ کون سا موقع، کونسا مقام ہوگا جہاں سب پھر مل پائیں گے۔

ہاں یہ موقع کسی قدر سابق طلباء کی انجمنیں فراہم کرتی ہیں۔ اور ایسی انجمنوں کے خالق اور رکھوالے کوئی ایک دو ہی جنونی ہوتے ہیں جو اسے بناتے ہیں۔ چلاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً وقت کو مٹھی میں لیکر کچھ شناسا دوستوں کو ایک مقام پر جمع کر دیتے ہیں۔ اور ان دنوں میں جب بالوں میں چاندی جھلک چکی ہوتی ہے اور چہرے کے خدو خال بدل کر پہچان میں رکاوٹ بن جاتے ہیں تب جمع ہو کر ایک دوسرے کو ماضی کے حوالے سے پہچانتے ہیں اور ایسا کرنا انہیں بہت اچھا لگتا ہے۔

ساتھیو! آج ہم بھی ماضی کی تمام تر داستانوں اور گزرے خوبصورت دنوں کو اپنے اردگرد محسوس کرنے جمع ہوئے ہیں۔ آپ سب اپنے اپنے دور کے ان دنوں میں پہنچ جائیے جہاں اپنے شفیق پرنسپل کی گرجدار آواز سنائی دے۔ اور آپ کے عزیز اساتذہ کے لیکچرز کی گھن گرج سے آپ دہل جائیں۔

چھوٹا سا ابتدائی نیشنل کالج جو سوسائٹی کے فیشن ایبل علاقہ کی ایک کوٹھی میں واقع تھا۔ یہ ایک مکان تھا۔ اوپر مکان دار اور نیچے کے تمام کمرے ہمارا کالج۔ جو آج بھی ہمارا خواب ہے۔ خوبصورت اور سہانا خواب۔ دیواروں پر بیٹھے ہوئے لڑکے اس کی تنگ دامانی کی کہانی سناتے اور اندر کا تنگ و تاریک مختصر سا کمرہ لڑکیوں کی بیٹھک یعنی کامن روم ہوا کرتا۔ جہاں لڑکیاں تلے اوپر بیٹھ کر اتنی باتیں کرتیں اتنے قہقہے لگاتیں کہ گمان ہوتا دنیا

کے تمام قہقہے اور دنیا کی تمام باتیں بس یہاں آ کر ختم ہوگئی ہیں۔

حسن عادل کا کمرہ جو تھا تو پرنسپل آفس لیکن اس مختصر سے کمرے میں اساتذہ کا ہجوم بھی ٹھہرتا۔ یعنی یہی آفس اور یہی اسٹاف روم' دروازے پر لٹکی ہوئی چِک جس کے پار دوڑتی نظریں طلباء و طالبات کی ایک ایک حرکت کو کنٹرول کرتیں۔ گویا حسن عادل صاحب کے پاس کرنے کو اور کوئی کام تھا ہی نہیں۔ حسن عادل کے قہقہے۔ گونجتی آواز۔ ہونٹوں پر پھیلی ڈھیروں مسکراہٹ' ماتھے پر کھنچی گہری گہری غضب ناک لکیریں اور دو خوبصورت ہری ہری کٹورا آنکھیں جن میں اپنے طالبعلموں کیلئے پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔ چند ایک چھوٹے چھوٹے کلاس روم جہاں بڑے بڑے قابل اساتذہ کی لیاقت بھری آواز گونجتی رہتی۔ چھوٹا سا کلرک آفس جہاں موٹے موٹے رجسٹر طالبعلموں کا اندراج لئے کالج کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ خوبصورت اور مکمل لائبریری جو طالبعلوں کے بے شمار سوالات کے جواب لئے ہر وقت اپنے بازو پھیلائے کھلی رہتی۔ اور ٹین کی چھت میں قائم کینٹین جو بے فکروں کا اور بھوکے پیٹ طالبعلموں کی امید و آرزو کا مرکز ہوا کرتا۔ ایک آنے کا سموسہ لنچ کہلاتا اور جسے کھا کر من و سلویٰ ٹھکرایا جا سکتا تھا......

زندگی میں یہ چھوٹا سا مکان نما کالج کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ آنکھیں بند کیجیے اسے یاد کیجیے دل کے تار بج اُٹھیں گے۔

آیئے ذرا شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس اس خوبصورت سے نوجوان سے ملتے ہیں جس کے چہرے پر دنیا جہاں کا سکون تھا۔ لیکن جس کے وجود میں جیسے ذمہ داریوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا۔ اس خوبصورت نوجوان میں ایسی برد باری حسنین کاظمی صاحب کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ استاد مقرر ہوتے ہی جیسے وہ اپنی عمر کا شمار ہی کرنا بھول گئے تھے۔ اکثر طالبعلموں کے برابر اور کئی ایک سے عمر میں کم ہی تھے مگر اپنے مضمون میں سنجیدہ اور اپنی ذمہ داریوں میں پکے تول کے باٹ۔

اس کمسنی میں وائس پرنسپل کا عہدہ غضب ڈھانے کے لیے کافی تھا کانپوری شیروانی پر

مجال ہے جو ذرہ بھر بھی شکن آئے چاہے ماتھا ایسے ویسوں کو دیکھ کر سکڑ سکڑ جائے۔ ظفر عمر زبیری کے سوکس اور ہسٹری کے طویل لیکچر۔ گرمی کی بھری پُری دوپہروں میں کسی جابر بادشاہ کے ظلم یا کسی آمرِ وقت کی گھن گرج سے کم نہ تھے۔ ہر بات کسی تاریخ سے شروع ہوتی کسی عہد پر ختم ہوتی۔ ہزاروں عبدالرحمٰن بن فلاں بن فلاں یاد کرتے کرتے سب تھک جاتے لیکن زبیری صاحب نے تو جیسے ہر عبدالرحمٰن سے سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ ہر نیا دن اور نیا پیریڈ کسی نئے بادشاہ سے شروع ہوتا اور کسی فاتح یا مفتوح عبدالرحمٰن پر ختم ہو جاتا۔ لیکن ہم تو صرف ان کی معصوم صورت اور بے ضرر شخصیت کے باوجود گھنٹہ بجنے کی دعائیں مانگا کرتے۔

ایسے میں اگر حسن مثنیٰ صاحب کی یاد آ جائے تو آنکھیں بند کر لیجیے سہانے سپنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ کالی لمبی شیروانی' سفید سیدھا پائجامہ' کالا بند جوتا' سر پر جناح کیپ اور پتلے پتلے تیکھے نقوش اور ہونٹوں پر پھیلی پان کی لالی ہمارے اور ہم سب کے بے انتہا پسندیدہ حسن مثنیٰ تھے۔ اسلامیات پڑھاتے مگر کونسا دن تھا کہ دنیا جہاں کی باتیں نہ کرتے ان کے پیریڈ میں ہم ایک لیکچر کے عوض ایک سموسے کی فرمائش کرتے جو اکثر پوری کر دیتے۔ آج اُن دنوں کی یاد میں حسن مثنیٰ کی ذات کسی ٹھنڈے میٹھے شربت سے کم نہیں۔ ہم کتنے خوش نصیب تھے جو وہ ہمیں میسر تھے۔ آج کے دن کتنے سوگوار ہیں کہ اتنا بڑا عالم اِس عہد کو محروم کئے ہو۔ بُرا ہے۔

اکنامکس پڑھنے والے حمید سر کو بھلا کیسے بھلا پائیں گے۔ لمبے تڑنگے خوش لباس' نِت نئے سوٹ میں ملبوس وہ یوں کالج آتے جیسے ہینگر پر لٹکے ہوئے کوٹ پتلون ہوں۔ مجال ہے گردن دائیں بائیں گھوم جائے۔ شرٹ کی کالر پر شکن پڑ جانے کا ڈر ہوتا۔ کلاس روم کا لیکچر ایسا ہوتا کہ مارشل اپنی تمام تر تھیوری لیکر جیسے خود آ موجود ہو۔ کالج میں وہ یوں پھرتے نظر آتے جیسے ریکارڈو کے نظریۂ لگان کی عملی توجیہہ پیش کر رہے ہوں۔ شادی کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں جیسے کہ تھامس مالتھس ان کا گہرا دوست ہو۔ کالج کے بانیوں میں سے ایک تھے جیسے کہ آدم اسمتھ سے برابری ضروری ہے۔ جو بات کہتے حرفِ آخر ہوتی یعنی رابنز کی

پیش کردہ معاشیات کی تعریف کے بعد اب کسی کی کیا ضرورت؟

حمید صاحب ان استادوں میں سے ایک تھے کہ جس طالبعلم سے چھو جائیں وہ ان کے مضمون کا جوگی بن جائے۔

نیشنل کالج کی یاد آئے اور یحییٰ سلام اللہ یاد نہ آئیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا ڈھیلا ڈھالا شیکپیئر کے زمانے کا کوٹ کسی اوٹ پٹانگ انگریز فلاسفر کے لمبے بکھرے بال۔ سانولا مگر رومانس سے بھرا رنگ۔ ہونٹوں پر پان کی لالی کے ساتھ خوبصورت دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ چمکتے ہوئے دانت' ذہین آنکھیں۔ پاؤں سے بڑے بڑے جوتے اور کرسی پر بیٹھے ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ کو لڑاتے کرسی ہلاتے اور اپنے وجود کو منواتے ہوئے یحییٰ صاحب' کسی کلاس میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتے۔ کہیں معاشیات اور کہیں انگریزی' گویا انہوں نے اپنی گردن میں ایک بورڈ لٹکایا ہوا تھا۔ ''جو چاہو پڑھوالو''

ہاں وہ اپنے وقت کے سقراط اور بقراط سے ہرگز کم نہ تھے۔ ان کی گفتگو کسی درسگاہ کی حقیقی آواز تھی۔ وہ کتابوں کے آدمی تھے اور زندگی صرف اس لئے جی رہے تھے کہ انہیں کتابیں پڑھنی ہیں۔ پاکستان سے لیکر واشنگٹن تک کی ہر لائبریری کی ہر ہر کتاب تک ان کی رسائی تھی۔ پیچھے وہ حیدر آباد دکن کی وسیع و عریض لائبریریاں بھی کھنگال آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کم و بیش چار پانچ موٹی موٹی کتابوں کا ڈھیر ضرور ہوتا کہ اس کے بغیر ان کی شخصیت نامکمل ہوتی۔ انگریزی پڑھاتے تو ڈوب ڈوب جاتے۔ شیلے' کیٹس کے شیدائی' ڈرامہ پڑھاتے تو آرمس اینڈ دی مین کا خود کیریکٹر بن جاتے۔ Louka کی چالاکیاں۔ Sergius کی ہیرو والی باتیں اور Riana کی ساری اداکاری وہ روسٹرم پر رہتے ہوئے یوں کرتے کہ ہمیں سارا ڈرامہ کلاس ہی میں ازبر ہوگیا۔ زندگی کے اسٹیج کا اتنا اہم اداکار آج ماضی بن گیا۔ مگر ہماری یادوں میں وہ آج بھی پھلجڑیوں کی مانند ننھے منے چمکتے ستارے کی طرح چٹکتا رہتا ہے۔

حق صاحب کو بُھلانا نیشنل کالج کے کسی بھی طالبعلم کے بس میں نہیں۔ چھوٹا سا قد

موٹا سا جُبّہ، سفید چھوٹی سی چھریری داڑھی۔ ململی شیروانی نیچے پینٹ نما پائجامہ یا پائجامہ نما پینٹ، بغیر لیس کے جوتے، چمکتی آنکھیں۔ قہقہے برساتا وجود اور گہری گہری نفسیاتی باتیں۔ حق صاحب ہر طالبہ کے باپ اور طالبعلم کے گارجین تھے۔ کوئی دکھ ہو، کوئی خوشی ہو، کوئی مسئلہ ہو، کوئی سوال ہو، زندگی کی کوئی بھی الجھن ہو۔ ان کے پاس جائیے۔ ان کی جھولی میں ڈال دیجئے چند لمحوں میں تمام فکروں سے آزاد ہو جائیے۔ اپنے مضمون سے عشق کرتے انگریزی اصطلاحات کا مشکل سے مشکل اردو ترجمہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا ہم نہ الفاظ پر عبور رکھتے تھے نہ تلفّظ پر وہ سکھا سکھا کر ہار جاتے ہم نہ سیکھنے کی قسم کھائے بیٹھتے۔ مگر ان کی محبت میں کبھی کوئی کمی نہ دیکھی۔ پڑھنے کا دل نہ چاہا تو ہماری فرمائش پر کلاس ختم کر دی۔ پڑھنے کا دل چاہا تو چھٹی کا گھنٹہ بج جانے کے بعد بھی یکے بعد دیگرے پریکٹیکل ہو رہے ہیں۔ جرنل بن رہے ہیں اور آغاز ہی میں امتحان کے لیے پورے تیار ہیں۔ بھوکے ہیں تو کینٹین کے شہرہ آفاق سموسے ہمیں یوں کھلا رہے ہیں جیسے مامتا سے بھری ماں ہو۔ ہم نے تو اکثر ان کی فیّاضیوں کے سبب یہی سوچا کہ کالج سے ملنے والی تنخواہ بس ہم پر ہی خرچ کرتے ہوں گے۔ ایسی مامتا کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔

کالج ختم ہو جائے شام سہانی آئے تو مَلِک صاحب کا حُسن ہمیں مسحور کر لیتا ہمیں نہ ان کے مضمون سے واسطہ نہ ان کے لیکچر کی سختی ہم پر عائد ہوتی تھی بس ہم تو انہیں خوبصورت مَلِک کا نام دیتے تھے اور ملکہ حُسن کے نام سے پکارتے۔

پروفیسر احمد علی کے شاگرد بن کر تو ہم اترائے اترائے پھرتے۔ وہ جو چلتے پھرتے برٹینڈرسل تھے۔ شلے، کیٹس پڑھاتے پڑھاتے وہ ان ہی کی دنیا میں گم ہو جاتے Ode to the west wind اور Ode to the nightingale آج بھی حرف حرف احمد علی کی سمجھائی ہوئی تعریفوں کے ساتھ ہمیں یاد ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی بھی نظم Casablanka بھول پائے گا۔ احمد علی تو انگریزی ادب پڑھانے کے لیے دنیا پر اور بعد میں ہم پر اتارے گئے تھے۔ پرانے انگریزوں کی چلتی پھرتی تصویر لئے۔ کوٹ اور

پینٹ الگ الگ رنگوں کا۔ تسمے والے جوتے' جن کے تسمے اکثر کھلے ہوتے۔ کالے سفید کھچڑی لمبے بال' آنکھوں پر موٹی سی عینک' نہ زیادہ ہنستے' نہ زیادہ بولتے۔ نہ ہی بہت سنجیدہ احمد علی تو بس پروفیسر احمد علی تھے۔ ہم نے ان ہی دنوں ان کی شہرۂ آفاق ناول دِلّی کی شام اردو میں پڑھی تھی اور ساتھی طالبعلموں پر اکثر اس کے اقتباس دہرا کر اپنی کم علمی چھپاتے۔

اور جب سید مظفرؔ کی یاد آئے تو آنکھیں بند کر لیجیے چھوٹے قد اور ہمیشہ سوٹ میں ملبوس انگریزی بولتے اپنے پیارے سید صاحب کو ڈھیروں دعائیں دیجیے کہ ان جیسا اچھا پڑھانے والا استاد پھر کبھی زندگی میں میسر ہی نہیں آیا کس کس کو یاد کریں کیسے بھول جائیں کہ نیشنل کالج زندگی کا وہ حسین باب ہے کہ جسے کتابِ زیست سے نکال دیں تو زندگی پھیکی روکھی بن جائے۔ ساتھی طالبعلموں نے بھی دل میں ایسا گھر بنا رکھا ہے کہ جن سے محبت اور الفت کی آج بھی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

سارے کالج کے محترم مکرم بھائی۔ ہم جب کالج آتے وہ وہاں موجود ہوتے۔ جب واپس جاتے وہ وہیں ہوتے انہوں نے تو کالج کو اپنا دل بنالیا تھا۔

ظفر عزیز باجوہ' ذہین فتین' شریر اور لمبا چوڑا۔ بولنے پر آئے تو سب کو چُپ کرا دے۔ لڑنے پر آئے تو عالمی جنگ کا نقشہ پیش کر دے۔ مجال ہے کہ ہمارے ذہن سے وہ کبھی نکل پائے۔

مطلوب بھائی' سیدھے سادے پیارے پیارے۔ ساری لڑکیوں کے مطلوب بھائی نفسیات کے سب سے اچھے طالبعلم اور حق صاحب کی آنکھ کا تارہ۔

باری جیلانی الیکشن جن کا مشغلہ۔ اتنے اونچے قد کے کہ ہزاروں کے مجمع میں چُھپ نہ پائیں۔ جونیئر طالبات کی حوصلہ افزائی اور ساتھی طالبعلموں میں بے حد مقبول۔

آپ کو یعقوب بھی یاد ہوں گے۔ ان کا کتا بھی بھلا بھلانے کی چیز ہے؟ چھوٹے سے قد کی نور الصباح مسکراتی مسکراتی ہر طرف لہراتی پھرتیں۔

نسرین کاظمی کی تقریریں۔ ساجدہ کی دل لگی والی باتیں۔ اور ہماری دوست صادقہ' ہماری ساتھی عابدہ۔قمرٗ نسیم جو ہماری کلاس فیلو تھیں' فیروز سنجیدہ سنجیدہ گنگناتے ہوئے۔ اور رحیم کی میمنی اردو کتنے ہی موقع پر مزا دے جاتی تھی۔

اور وہ مَلِک جو اتنا اچھا گا تا کہ سارا ماحول جھومنے لگ جاتا۔ آپ یاد کیجیے اُن دنوں کو جب ہم مباحثے کے میدان میں ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے دلیلیں ڈھونڈ کر لاتے۔

اُن ہولناک راتوں کو یاد کیجیے جو کسی تقریب کے خاتمے پر شروع ہوتی تھیں اور رانا اظہر علی کے خوف سے ساری لڑکیاں سہم سہم جاتیں تھیں افروز انہیں سامنے آتا دیکھ کر باقاعدہ بے ہوش ہو جاتی۔ مگر رانا اظہر علی ان کی ڈھارس بندھا کر بحفاظت گھر پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے۔ پکنک کی اُس خوفناک رات کو یاد کیجیے جب سارا کالج چراغاں تھا اور ہم جنگل میں بس نہ پہنچنے کے باعث ایک کچی کوٹھری میں بند تھے اور لڑکے ہماری کوٹھری کے گرد پہرہ دے رہے تھے اور کبھی کبھی شرارتاً مصنوعی شیروں کی آوازیں نکال کر ہماری جان نکال رہے تھے۔

الیکشن کی بہاریں یاد کیجیے۔ امیدواروں کا ہارنا جیتنا۔ ان سے ٹریٹ لینا ان سے ووٹ دینے کے جھوٹے وعدے کرنا۔

آپ کے حافظے میں جانے کتنے ہی چہرے گھوم جائیں گے جو آج مرحوم ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہم نے بے مقصد کالج کے ڈھیروں چکر لگائے تھے۔ اور خیال کیا تھا کہ ہم کبھی بچھڑ نہیں پائیں گے۔ اور جو حیات ہیں اور دنیا کے نامعلوم کونوں میں جا چھپے ہیں ہم تو انہیں بھی یاد کرتے ہیں۔

کالج کی خاموش آوازیں۔ اس کے در و دیوار۔ کینٹین کی چائے' لائبریری کی خاموشیاں' مختصر سے لان میں پلنے والی اَن گنت کہانیاں۔ چھوٹا سا کامن روم' نوٹس بورڈ پر لکھی اہم باتیں اور مشکل ترین فیگرز' چپراسی عشرت اور سفید داڑھی والے بابا۔ ان کی روک ٹوک اور نصیحتیں ہر روز جنم لینے والی کہانیاں اور ہر روز بچھڑنے کے نئے اسباب

میگزین کا نکلنا۔ کہانیاں لکھنا' شاعری کرنا اور ساتھیوں کو جمع کر کے سنانا' داد لینا اور تخلیق کاروں کا حوصلہ بڑھانا' قد سے اونچی ٹرافی جیتنا اور کھیل کے میدان میں چھکے چوکے مارنا۔ الوداعی پارٹیوں کے دھوم دھڑکے' ٹیسٹ کے ہولناک پیریڈز امتحانوں کے عذاب ناک دن' آپ یقیناً ماضی کی یادوں میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکے ہوں گے اور میں' میں تو اپنی اس اوٹ پٹانگ شاعری کے بارے میں سوچ رہی ہوں جب ہم لڑکیوں کو الیکشن میں ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں نے عادل صاحب کے اُس ظالمانہ اور جانبدارانہ فیصلے کے خلاف نظم لکھی تھی۔ نوٹس بورڈ پر لگاتے ہوئے پکڑی گئی تھی آفس میں لائی گئی اور حکم ملا اسے خود پڑھ کر سناؤں۔ ٹانگوں کا کانپنا ہونٹوں کا بہکنا' تلفظ کا بگڑنا اور آفس کے باہر ساتھی طالبعلموں کا بے تحاشہ ہنسنا۔ سزا کا خوف' مگر نظم تو سنانی تھی۔ سو سنائی۔ آج بغیر ڈرے اس کا ایک شعر ذہن میں گردش کر رہا ہے۔ اور بغیر تلفظ بگاڑے میں اسے سنا بھی سکتی ہوں۔ اگرچہ قافیہ ردیف کی کمزوریاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ میں اُس وقت کس پائے کی شاعرہ تھی اُس واقعے کے پس منظر میں یہ شعر سن لیجئے۔

نام تو ہے آپ کا عادل جناب!
عدل کرتے آپ کو آج ہم نے دیکھا ہے!

محترم استاذ' محترم حسن عادل' آپ نے اُس دن بھی مجھے بغیر سزا دیئے معاف کر دیا تھا۔ آج بھی اس گستاخی پر آپ سے معافی چاہتی ہوں۔

مجھے اس اعتراف کا موقع دیجیے کہ آپ کا بنایا ہوا کالج اور آپ کے بتائے ہوئے جینے کے سنہری اصول' آپ کے مقرر کردہ تمام اساتذہ ہم سب طالبعلموں کی زندگی بنانے میں سرفہرست ہیں اور اگر ہم میں کوئی خامی ہے تو بس یہی کہ ہم اپنے اس گلشن سے اپنی جھولی میں شاید کچھ کم کلیاں اور پھول سمیٹ پائے کہ یہ تو صرف ہمارا ہی قصور ہے۔

(20 فروری 2002 کراچی جم خانہ نیشنل کالج اولڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے جلسے میں پڑھا گیا۔ صدارت حسن عادل نے کی۔)

ڈبلن اسپیشل اولمپک سمر گیمز 2003ء

وہ بچے جو قدرتی طور پر ان محرومیوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جو انہیں دیگر بچوں سے جدا بنا دیتے ہیں ان کی دنیا ہی مختلف ہوتی ہے ان کی پیدائش پر ان کے والدین اداس ہوتے ہیں اور معاشرہ خوش دلی سے قبول نہیں کرتا۔ ہمارے اردگرد ایسے بے شمار بچے ہیں جن کا نہ حال آسودہ ہے نہ مستقبل محفوظ ہے۔ لیکن جوں جوں دنیا ترقی کرتی جا رہی ہے کچھ لوگوں کے دلوں میں ان بچوں کیلئے ہمدردی بھی پیدا ہوئی امریکا کی Eunicedl Kennedy Shriver' 1963ء جون میں ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ وہ بچے تھے جو پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے لیکن ان میں کسی نہ کسی اعتبار سے کوئی صلاحیت ضرور موجود تھی کہ انہیں معاشرے کا قابلِ قبول فرد بنایا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے تو ان بچوں کا خوبصورت نام تجویز کیا گیا۔ اب یہ بچے ذہنی اور جسمانی معذور بچے نہیں بلکہ اسپیشل بچے کہلائے جانے لگے۔ یہ بچے جن کے لیے یہ نعرہ تجویز کیا گیا یہ پیدا ہوئے ہیں جیتنے کے لیے یعنی Born to win کینیڈی شرائیور نے پہلے پہل 20 جولائی 1968ء کو شکاگو پارک میں پہلا اسپیشل اولمپک منعقد کیا۔

اس اولمپک میں صرف امریکا کے بچے شریک ہوئے جو 26 اسٹیٹس اور کینڈا سے آئے تھے ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔

اس کے بعد دسمبر 1968ء میں با قاعدہ ایک تنظیم کی بنیاد پڑی۔ دوسری بار 1970ء میں دوسرا عالمی اولمپک منعقد ہوا اس میں 50 مما لک شریک ہوئے۔ اور دو ہزار بچوں نے حصہ لیا یہ اولمپک بھی شکاگو ہی میں ہوا۔

1972ء میں تیسری بار یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں دو ہزار پانچ سو بچوں نے حصہ لیا۔ یوں یہ تعداد بڑھتی رہی اور ممالک کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اب ہر ملک ان بچوں کو اہمیت دینے لگا اور ان کے لیے کھیلوں کا خصوصی انتظام ہونے لگا۔ پاکستان نے بھی اس طرف توجہ دی اور اسپیشل اولمپک آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے سارے سال اپنا کام انجام دیا۔ مختلف شہروں میں پاکستان بھر کے بچے جمع ہوتے اور مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے انہیں میڈل ملتے۔ مختلف کمپنیوں نے امداد دینی شروع کی یوں ان بچوں کے لیے کھیل کے یونیفارم اور تحائف کا انتظام کیا گیا کئی سالوں سے ان بچوں کو امریکا اور چین بھی بھیجا جاتا رہا ہے۔ اسپیشل اسکولوں نے ان بچوں کو SOP سے متعارف کرایا اور سہولیات بہم پہنچائیں۔ بچے خوش ہوئے کہ انہیں ایک پلیٹ فارم میسر ہوا اور والدین اس بات پر خوش تھے کہ ان بچوں کو اہمیت دی جا رہی ہے اور کھیل کے ذریعہ ان بچوں میں خود اعتمادی آ رہی ہے۔ انعام حاصل کرنے پر ان بچوں میں حوصلہ پیدا ہونے لگا اور پھر وہ ہوا جس کی امید بھی نہیں تھی۔ ان بچوں نے مل جل کر رہنا سیکھا۔ نئے نئے دوست بنائے اور اپنی محنت کا صلہ پا کر اعتماد کی دولت حاصل کی۔ یوں وہ اپنے بہن بھائیوں میں بھی معتبر ہوئے۔

چالیس سال بعد امریکا سے یہ اولمپک باہر نکلا اور پہلی بار آئرلینڈ کی ہریالی نے ان بچوں کو خوش آمدید کیا۔

150 ممالک کے 7000 بچے جب ڈبلن میں ملے تو ڈبلن ایئرپورٹ پر میلے کا سا سماں تھا۔ سارا شہر خوبصورت بینرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر آئرش ان کے لیے میزبان تھا اور جی جان سے ان بچوں کے آرام کا خیال کر رہا تھا۔ اسپورٹس ویلج میں ان بچوں کا انتظام تھا۔ جوس، پھل اور بہترین غذاؤں سے ان بچوں کو صحت مند رکھا جا رہا تھا۔ ہر روز ان تک مختلف اداروں کی جانب سے تحائف بانٹے جا رہے تھے۔ ان کو آئرلینڈ کے خوبصورت مقامات کی سیر کرائی جا رہی تھی۔

اور جب تقریب کے آغاز کے موقعہ پر انہیں آئرلینڈ کے وسیع و عریض کروک پارک میں لایا گیا تو یہ ننھے اور معصوم سفیر اپنے اپنے ملک کے لباس اور پلے کارڈز کے ساتھ بادِ صبا کے مانند جھومتے گاتے داخل ہوئے بے شمار تالیوں اور خوبصورت نعروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ جہاں اسّی ہزار تماشائیوں نے انہیں والہانہ خوش آمدید کہا۔ تیس ہزار رنگ برنگی جیکٹ پہنے رضا کار مسکراہٹ کا خزانہ لٹا رہے تھے۔ ڈیڑھ سو ممالک کے تین ہزار کوچز اپنی محنت کا ثمر پانے کیلئے اپنے اپنے بچوں کے ساتھ تھے ڈبلن کے Mountjoy Prison کے قیدیوں نے ان کیلئے سترہ ہزار میٹر کپڑے پر 75000 رنگ برنگے جھنڈے بنائے تھے جو کھیلنے والے بچوں کے والدین اپنے ہاتھ میں لہراتے ہوئے اسٹیڈیم میں داخل ہو رہے تھے۔ کروک پارک میں 52 زبانیں بولی جا رہی تھیں دو ہزار مترجم ترجمہ کرنے میں مشغول تھے۔

اسٹیڈیم کی لمبائی اور چوڑائی کو دیکھ کر ہرگز یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ آئرلینڈ ایک بہت چھوٹا ملک ہے۔ جس کی آبادی یورپ کے کسی بھی ملک کے دارالخلافہ میں بڑی آسانی سے سما سکتی ہے یہاں نہ تیل کی دولت ہے نہ ہی کوئی اور قدرتی وسیلہ۔ نہ برف سے ڈھکے اونچے اونچے پہاڑ ہاں آئرلینڈ کا آدھا جادو اس کے لوگوں کے اخلاق میں چُھپا بیٹھا ہے۔

اسّی ہزار کے اس اجتماع میں شرکت کیلئے جوق در جوق قافلے مختلف راستوں سے اس پارک کی جانب رواں دواں تھے ہر گلی کے ہر گھر پر خوش آمدید تحریر تھا۔ گاڑیوں کا داخلہ بند تھا۔ پیدل کا راستہ کھلا تھا۔ ہر شخص خوش خوش جھومتا ہوا پارک کی جانب رواں دواں تھا جہاں انہیں سات ہزار اسپیشل بچوں کا استقبال کرنا تھا۔ رضا کار راستہ دکھاتے جاتے اور مسکراہٹ کے پھول بکھیرتے جاتے۔ میلوں پیدل چلتے ہوئے نہ پسینہ آیا' نہ ٹانگیں تھکیں' نہ ٹھوکر لگی' نہ موڈ بگڑا بلکہ خوشگوار موسم اور بکھرے ہوئے رنگ ہی رنگ زندگی میں ایک نیا کیف گھول رہے تھے۔ پارک میں داخلے کے وقت مختلف حفاظتی راستوں سے گزرنا پڑا اور یوں سرعت سے گزر گئے کہ جیسے ساعتیں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی

ہوں۔ کہیں ہاتھوں میں جھنڈے تھمائے جا رہے تھے۔ کہیں بیج دیئے جا رہے تھے۔ کہیں لائٹیں تقسیم ہو رہی تھیں اور جب تک ہم اپنی الاٹ شدہ سیٹ پر نہیں بیٹھ گئے جیسے رضا کار صرف اور صرف ہماری رہنمائی پر مامور ہوں۔ مسکراہٹ کے بے پناہ خزانے لٹائے جا رہے تھے۔ گلے میں لٹکا فیملی کارڈ کچھ یوں دیکھ رہے ہیں کہ جیسے کہہ رہے ہوں آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ ایک اسپیشل بچے کے والدین ہیں ان بچوں کی اہمیت' ان سے محبت' ان کی عظمت کا ایک ایسا رخ ہم نے ڈبلن میں دیکھا کہ وہ ملال ہی بھول گئے کہ ہمارا بچہ دوسروں سے کمتر ہے یا کسی صلاحیت سے محروم ہے۔ ہماری میزبان فیملی ہمارے ساتھ یوں چل رہی تھی کہ جیسے ہماری ہر تھکن کو وہ اپنے وجود میں سمو لے گی۔

شکریہ اور سوری مغربی ممالک کی دو گردانیں ہیں جنہیں استعمال کر کے انہوں نے اپنی خوش مزاجی کا سکہ جما لیا ہے۔ ہم بھی بھول گئے تھے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں جہاں تیوری پر بل اور مزاج میں برہمی ہماری پہچان ہے۔ ہم نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ہم اس ملک میں ہیں ہم بھی شکریہ اور معذرت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھیں گے۔

شام کے پانچ بج رہے تھے لیکن لگتا تھا کہ دنیا کے ڈیڑھ سو ممالک کے ڈیڑھ سو سورج اور ستارے ہم ساتھ لے آئے ہیں جگمگاتی روشنی میں وہ تازگی تھی کہ ہم سوچ بھی نہیں پا رہے تھے کہ کوئی شام اتنی رنگین اور روشن بھی ہو سکتی ہے۔

اسٹیڈیم کی جگمگاتی روشنیوں کے ساتھ ساتھ آسمان پر سات نہیں ہزار ہا رنگ جمع تھے۔ پھلجڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں اور تین اطراف میں بیٹھے ہوئے تمام حاضرین کے درمیانی حصے میں سات ہزار بچوں کی مسکراہٹ' تازگی' مقابلے میں حصہ لینے کا جوش اور جینے کا حوصلہ ان بچوں کو اتنا حسین بنا رہا تھا کہ لگتا تھا اگر یہ بچے نہ ہوتے تو شاید کائنات اتنی حسین نہ ہوتی۔

جہازی سائز کا اسکرین فنکاروں سے آراستہ تھا جو ان بچوں کو خوشیاں بانٹ رہے تھے۔ آئرلینڈ کی صدر Mary Mcaleace نے بچوں سے خطاب کیا اور اپنی میزبانی پر

فخر محسوس کرتے ہوئے کہا ''بچو آپ کُھلے بازو اور امید کے ساتھ کھیلیں ہم آپ کا کھیل دیکھیں گے اور دنیا کو خوبصورت محسوس کریں گے کہ اسپیشل اولمپک بہترین کھیل، بہترین ہمت، بہترین شرکت، بہترین ٹیم ورک، بہترین خوشی اور ایکشن کا مظاہرہ ہے۔''

شرائیور کینیڈی بانی اسپیشل اولمپک نے اپنے دونوں بازو ان بچوں کے لیے پھیلا دیئے انہیں خوش آمدید کہا اور اپنی آمد سے ان میں ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔

نیلسن مینڈیلا نے کھیل کے آغاز کا اعلان کیا اور ساتھ ہی اسٹیج پر ٹی وی اور فلم کے مشہور ستارے اور گلوکار ان بچوں کو خوشیاں بانٹنے آ گئے۔ بچے تالیاں بجاتے بجاتے تھک گئے۔ مسکراتے ہوئے بے حال ہوگئے۔ گویا ان کے معصوم ذہن ایک نیا جذبہ اور حوصلہ قبول کر رہے تھے اور وہ اپنی صلاحتیں دکھانے کے لیے بے چین ہوگئے اپنے ملک کا نام روشن کرنے کے لیے عزم تازہ کرنے لگے۔ باکسر محمد علی اسٹیڈیم میں آئے بچے تالیاں بجاتے بجاتے تھک گئے پھر ڈبلن اور بلفاسٹ کے مختلف مقامات پر کھیلوں کا آغاز ہوا۔ میڈلز کی بارش ہوتی رہی اخبار اور ٹی وی نے ان کی تصویریں چھاپیں۔ اور مختلف اداروں نے انہیں تحائف سے لاد دیا۔

بچوں کے ذہنوں میں یادوں کا لازوال خزانہ جمع ہوا اور اختتامی اجلاس کی جگمگاتی شام پھر افتتاحی تقریب کو یاد دلانے لگی۔ پھلجڑیوں کی بہار تھی۔ روشنیوں کی چکاچوند تھی۔ غبّارے فضا میں اڑ رہے تھے۔ اور کیمروں کی روشنی سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

میزبان فیملی نے اپنی مہمان فیملی کی آؤ بھگت اور تواضع میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ بازاروں میں دکانداروں نے ان بچوں کیلئے رات گئے تک دکانیں کھول رکھی تھیں۔ اور ہر جگہ ہر بس اور ٹرین پر ان کیلئے خیر مقدمی نعرے تحریر تھے۔ رضا کاروں کے علاوہ ہر شہری سراپا میزبان تھا اور مسکراہٹوں کے پھول بکھیر رہا تھا۔ کھلاڑیوں کیلئے باقاعدہ ایک گاؤں آباد ہوا تھا۔ ٹرینٹی کالج کے ہوسٹل نے اپنے کمرے غیر ملکی کھلاڑی بچوں کیلئے کھول دیے تھے۔ ڈبلن زُو کے دروازے بچوں اور ان کی فیملی کیلئے بلاٹکٹ کھلے تھے۔ ڈبلن کا مشہور و معروف

قلعہ بھی فیملی کے لیے کھول دیا گیا تھا یہ قلعہ آئر لینڈ کی صدیوں کی تاریخ کا حصہ ہے۔ جہاں آئر لینڈ حکومت کے صدر اپنا حلف لیتے ہیں۔

آئر لینڈ کی خوبصورت یادیں' خوبصورت مناظر' لوگوں کی مسکراہٹیں' والہانہ استقبال اور تحائف سمیت بچے اپنے اپنے وطن کو روانہ ہوئے جہاں ان کے ہم وطن انہیں ان کی ہمتوں اور فتح پر خوش آمدید کہنے کے لیے ایئر پورٹ پر جمع تھے۔

لیکن یہ بچے تا حال حکومت کی جانب سے کسی شاباشی کے منتظر ہیں کہ وہ اپنے ہمراہ 89 میڈل لائے ہیں۔ جنہوں نے 89 بار ڈبلن کے وکٹری اسٹینڈ پر جاتے ہوئے پاکستان کا نام پکارنے پر دنیا کو مجبور کیا۔ تالیوں کی گونج میں انہوں نے ہرے جھنڈے کو سر بلند کیا۔ لیکن اپنے ملک میں وہ نظر انداز ہو رہے ہیں کیا صرف اس لیے کہ وہ اسپیشل بچے ہیں وہ شور نہیں مچاتے صرف اپنی کارکردگی دکھاتے ہیں۔

(8 ستمبر 2003ء کراچی جم خانہ کی تقریب میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

جامعہ کراچی شعبۂ ابلاغِ عامہ کی گولڈن جوبلی

جامعہ کراچی شعبۂ ابلاغ عامہ کی پچاس سالہ سالگرہ پر ہم نے اپنی چالیس سالہ یادوں کو تازہ کیا۔ وہی آرٹس آڈیٹوریم جہاں ہم نے روسٹرم پر آ کرتقریر کے جھنڈے گاڑے تھے اور بے شمار تقریبات منعقد کرائی تھیں۔ آج ایک مدّت بعد جب لباس کی سفیدی کے بجائے بالوں کی سفیدی چھا چکی ہے ہمیں اس ماحول میں اپنے طالبعلمی کے دور کو یاد کرنا اچھا لگا۔ ہاں کمی تھی تو اپنے ان تمام ساتھیوں کی جو جامعہ سے نکلتے ہی پر لگا کر اِدھر اُدھر اڑ گئے مگر اپنی اپنی یادوں کو ہمارے ذہن کے کسی کونے میں دفن کر گئے۔ کمی تھی تو اپنے ان تمام مرحوم اساتذہ کی جنہوں نے ہمیں تعلیم دی۔ اُن یادوں اور باتوں کو جب بھی کریدتے ہیں اتنا ہی مزا آتا ہے۔

آج کا دن بھی اُن میں سے ایک تھا۔ ہمارا کوئی ساتھی وہاں موجود نہ تھا۔ ہاں صرف دو استاد ماضی کی نشانی کے طور پر زکریا ساجد صاحب اور صدرِ شعبہ شریف المجاہد صاحب موجود تھے۔

میرا نام جوں ہی اپنی یادیں تازہ کرنے کیلئے بلایا گیا۔ ذہن میں قطار در قطار اتنے واقعات یاد آئے کہ میں پریشان ہوگئی اور اچانک ایک واقعہ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

ہر طالبعلم کی طرح ہم نے بھی جب شعبہ میں داخلہ لیا تو ہمارا بنیادی مقصد ایم اے کی سند حاصل کرنا تھا۔ اور بعدازاں صحافی کے روپ میں اپنے کو دیکھنا تھا۔ ہمارے شعبے میں بس صرف چند طالبعلم زیرِ تعلیم تھے۔

ہمارا پہلا بیج تھا جب ہم 10 لڑکیاں اور 9 لڑکے داخل ہوئے۔ تب اساتذہ نے کہا اس سال تو شعبے میں بھیڑ لگ گئی ہے۔ ہم سب مختلف درسگاہوں سے آئے تھے اور یہاں آ کر منٹوں میں ایک دوسرے سے ایسے آشنا ہوئے کہ چالیس سال گزار کر بھی ذہن میں یادوں کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں ہماری سہیلی جو بنیں وہ طاہرہ تھیں۔ کیمپس میں ہی رہتی تھیں اور انہیں پڑھنے پڑھانے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پیدائشی لیڈر تھیں اور ہر تخریب اور تعمیر کی ذمہ داری ان پر از خود عائد ہو جاتی۔ ہر ایک نے ایک زبان ہو کر کہا اور آج تک کہتے ہیں کہ اتنی غلط جوڑی ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ غیر فطری بھی کہا گیا۔ وہ چُھلا وا اور میں ایک ایک قدم سنبھال کر چلنے والی لیکن یہ دوستی جس کی پیشن گوئی تھی کہ مصنوعی ہے اور دو سال بھی گزار لے تو بہت ہے۔ لیکن آج اتنے بہت سے سال گزر چکے ہیں اور ہمارے دل ایک دوسرے کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ایک دل امریکا میں ہے اور دوسرا پاکستان میں۔

میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ شعبے میں آتے ہوئے ہمارا ہر اچھے طالبعلم کی طرح پہلا مقصد امتحان پاس کرنا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارے مقصد کی اوّلیت پر اب کوئی دوسرا مقصد جگہ لیتا جا رہا ہے۔ اس بات کے واضح آثار اُس وقت نمایاں ہوئے جب طاہرہ نے اعلان کیا کہ ہم جامعہ میں دوسرے درجے کے شہری بن چکے ہیں۔ ہم نے طاہرہ سے پوچھا تمہیں ایسا کیوں کر محسوس ہوا۔؟

طاہرہ کا جواب چونکا دینے والا تھا۔ تم لوگوں نے اب تک کیوں نہیں محسوس کیا۔ ہمارے شعبے کے دائیں بائیں شعبوں کے طالبعلم ہمیں حقیر بلکہ ذلیل بھی سمجھتے ہیں۔ ''مگر کیسے''؟ کیونکہ ہم نے ایسا کچھ محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ طاہرہ کا کہنا تھا بغور مطالعہ کرو۔ ہر ایک کی آنکھیں دیکھو۔ شہر یار نے فوراً کہا منظور، میں لڑکیوں کی طرف دیکھونگا اور ہم لڑکیوں کی طرف دیکھ کر ہماری ڈیوٹی لگائی کہ تم لڑکوں کی طرف دیکھنا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں یہ بات مان لینے میں ذرا بھی وقت نہ لگا کہ مخالفانہ ڈیوٹی پر فائز ہونا ہمیں اچھا

لگا۔ مگر پہلی بار آنکھیں اٹھا کر لڑکوں کی آنکھوں میں دیکھنا تھا ذرا ہمت والا کام' مگر ہم سب نے اپنی اپنی ہمتوں کو جمع کر کے اپنا اپنا کام انجام دینا شروع کر دیا۔ لیکن طاہرہ کی کہی ہوئی باتوں کے برعکس نتیجہ ذرا مختلف نکل رہا تھا۔ اُن شعبوں کے بے شمار طالبعلم ہم سب سے قریب آتے جا رہے تھے۔ اور ہماری وقعت میں بھی خاصا اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک دن گھبرا کر طاہرہ سے کہا۔ ''کھل کر بات کرو ہمارا تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔'' طاہرہ کا کہنا تھا تم لوگ اصل مقصد سے بھٹک گئے ہو اور ذہنی گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ اسی لئے تم بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ لڑکوں کی حالت ہم سے بھی خستہ بلکہ خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ طاہرہ کو بھی اب بات سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس نے ایک خود دار سربراہ کی حیثیت سے نصیحت کی۔ ''ہم یہاں پڑھنے آئے مگر تم نے ہی تو ہمیں انہیں دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی نصیحت کی تھی۔ ہاں وہ شاید میں نے غلط کیا تھا۔ تم لوگوں کو اب مجھے صحیح بات واضح انداز میں بتا دینی چاہئے۔'' اس نے اس دن ایک ارجنٹ میٹنگ بلائی۔ یہ میٹنگ ہمارے شعبے کی راہداری میں عین نکڑ والی جگہ پر تھی جہاں شعبۂ سیاسیات جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ ان دنوں آرٹس فیکلٹی میں واحد راہداری یہی تھی اور اس کے آگے جو آج قطار در قطار بلڈنگ نظر آتی ہے ان کا وجود نہ تھا بلکہ دُھول اُڑاتی ہوئی فراٹے دار ہوا ہمارے دوپٹے اور گاؤن اڑا دینے پر مامور تھی۔ چوتھے پیریڈ کے بعد ہم سب وہاں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے گاؤن پھیلایا اور بیٹھ گئے۔ طاہرہ نے کہا دیکھو میں آج بھی اپنے پہلے موقف پر قائم ہوں کہ ہم ذرا حقیر نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردگرد کے تمام شعبوں کے سربراہ نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ کئی کئی بال بچوں والے اور بعض صورتوں میں کئی کئی بیویوں والے بھی ہیں۔ اور ایک ذرا اپنے شعبے پر تو نظر ڈالو ہمارا سربراہ ابھی تک کنوارہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ اسے آج تک کسی لڑکی نے پسند نہیں کیا۔ بس ہم یوں حقیر گردانے جا رہے ہیں۔ اس نے دھیرے سے یہ بھی کہہ دیا کہ ایسی صورت میں ہمارا بھی مستقبل تاریک ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ سال بعد ہم بھی قد کاٹھ نکالنے والے ہیں گھر میں

بھی کچھ ُگن گُن ایسی ہی ہے۔ سوچو ہمارا رشتہ لانے والے بھی اگر ہمیں حقیر سمجھ کر یہ طعنہ دیدیں گے کہ پہلے اپنے سربراہ کی تو شادی کراؤ۔ پھر ہمارا کیا بنے گا؟ ہم تو کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ساتھ سوچا ہم طاہرہ کے مقابلے میں کس قدر کم فہم ہیں۔ ہمیں تو طاہرہ پر رشک بھی آیا۔

اب ہم نے فیصلہ کرلیا کہ ہماری نظریں اردگرد کے طالبعلموں کے سامنے جھکی رہیں گی۔ ہماری جتنی تذلیل ہونی تھی ہوگئی۔ دوسرے دن سے ہم نے اپنا رویّہ تبدیل کرلیا۔ وہ طالبعلم جو ہمیں اپنی جانب دیکھنے کے عادی ہوگئے تھے مایوس ہوگئے۔ مایوس تو کچھ ہمارے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں وہ بھی حزبِ مخالف کی بے رخی کی تاب نہیں لا پارہے تھے۔ بہرحال اس کے بعد ایک ارجنٹ بلکہ بہت ارجنٹ میٹنگ کا بلاوا ہمیں ملا۔ ہم سب نے چوتھے پیریڈ میں مخصوص جگہ پر گاؤن بچھا کر طاہرہ کا انتظار کیا۔ طاہرہ نے کرسیٔ صدارت جو زمین پر ہی تھی مسند افروز ہوتے ہوئے کہا۔

''دیکھا' میں نے سچ کہا تھانا۔'' ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ میٹنگ دراصل قرار دادِ مذمت کیلئے بلائی گئی تھی۔ طاہرہ نے با آواز بلند زبانی تیار کردہ مسوّدہ دہرایا جو سابق طالبعلموں کیلئے تھا کہ اگر انہوں نے اپنے فرائض سمجھ لیے ہوتے تو آج ہم اس قدر حقیر نہ گردانے جاتے ہم سب نے اس قرار داد پر زبانی دستخط بھی کر دیے۔ اب اگلا مرحلہ ہمارے عملی میدان میں کود پڑنے کا تھا وہ یہ کہ ہم سب یا چند لوگ وفد کی صورت میں شریف المجاہد کے پاس جائیں گے اور دہائی دیں گے۔

یہ بات ہمیں کچھ خوفناک لگی۔ ہم نے کچھ بولنا چاہا کہ طاہرہ نے ہمارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک ایسا جملہ ادا کیا کہ ہم پانی پانی ہوگئے۔ تمہیں شرم آنی چاہئے کہ تمہارے حوصلے کچے اور عزم میں انتہائی کمی ہے۔ ہماری نظریں اپنی کم وقعتی پر جھکی جارہی تھیں اور طاہرہ کے ارادوں میں وہ گرمی پائی جاتی تھی کہ جیسے جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے بلند حوصلہ فوجیوں کی ہوتی ہے۔

آخری پیریڈ کے بعد ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ جب مجاہد صاحب کو ''بیرونی امداد'' ملنے کا کوئی امکان نہ ہو تب ان پر شب خوں ماریں گے۔ شعبے کے واحد چپراسی گل شیر کو ہم نے پہلے ہی گرفتار کرلیا تھا۔

طاہرہ جری نڈر سپاہی کی طرح وفد کی کمانڈر تھیں۔ ہماری ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر ہم سب نے اپنی کیفیت کو طاہرہ پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ طاہرہ میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بات گھما پھرا کر کرنے کے بجائے ایک دم اور بہت جلدی کرلیتیں۔ الفاظ کا چناؤ نشانے پر جا لگتا۔ ''سر ہمیں آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

طاہرہ نے استاد کو اتنا مارجن دیا کہ وہ سننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگرچہ یہ طاہرہ کا انداز نہیں تھا۔ ''آپ شادی کر لیجیے اور بہت جلد۔'' طاہرہ نے اطمینان سے کہا اور ہم سب بے اطمینانی میں ٹانگوں کی حرکت کے باعث گرنے کے قریب پہنچ چکے تھے ''بھئی آپ کو کیا تکلیف ہے طاہرہ'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں طاہرہ کو مخاطب کیا ہم کچھ نہیں جانتے۔ آپ کو شادی کرنی پڑے گی۔ ہم اب مزید خوار ہونے کیلئے تیار نہیں صرف ڈیڑھ سال کا عرصہ باقی رہ گیا ہے۔ وقت کم ہے اور مقابلہ بہت سخت ہے۔''

اس کے بعد مجاہد صاحب اور طاہرہ میں روزانہ کی تکرار رہتی۔ ہم طاہرہ کے طرفدار تھے۔ مجاہد صاحب اکیلے۔ کسی ایک دن انہوں نے ہتھیار ڈالدیے۔ طاہرہ نے اپنے تعلقات کی گٹھڑی میں سے کئی ایک لڑکیاں ان کو دکھائیں۔ کچھ کو وہ پسند نہیں آئے اور کچھ کو مجاہد صاحب نے رد کردیا۔ دن تیزی سے گزر رہے تھے ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ایک لڑکی جس پر ہمیں کامل یقین تھا کہ اس پر دونوں پارٹیاں متفق ہوجائیں گی۔ اس نے ہمارے یقین کو شکست دیدی۔ ایسا کیوں ہوا؟ ہم نے مجاہد صاحب کے چال ڈھال کو آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف سے پرکھا۔ بندہ تو ٹھیک ٹھاک ہے صرف ذرا کلاس میں اس کا رویّہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ گر اس لڑکی کا کلاس روم سے کیا تعلق ہوگا۔ اس صورتِ حال کو ہم ہمیشہ اس سے اس وقت تک چھپا کر رکھیں گے۔ جب تک کہ شادی نہیں ہوجاتی۔

لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ لڑکیاں کم پڑ گئیں تھیں اور اسی حساب سے ہمارے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ اور ہم طاہرہ سے بھی روٹھتے جا رہے تھے جس نے ہمارا دل ٹیسٹ ٹیوٹوریئل کی جانب سے بالکل موڑ کر رکھ دیا تھا۔ بلکہ اب تو وہ دن میں کئی کئی پیریڈ کو نہ لینے پر بھی اکسانے لگی تھی۔ ہمارا وہ مقصد کہ ہمیں مقرّرہ وقت میں ایم اے کر لینا ہے اس پر دوسرا مقصد حاوی تر ہوتا جا رہا تھا اور یہ ہمارے مستقبل کیلئے لال جھنڈی تھا۔

اُس دن پھر ہمیں ایک ارجنٹ بلکہ بہت ارجنٹ میٹنگ کا دعوت نامہ ملا۔ ہم اپنی مخصوص جگہ جا پہنچے۔ اُس دن ہوا کچھ اور تیز اور مٹی کا طوفان نا قابلِ برداشت تھا۔ لیکن کام کی نوعیت بہت اہم تھی۔ یہ بات ہمیں طاہرہ نے ذہن نشین کرا دی تھی۔

طاہرہ نے سب کو دائرے میں بٹھا کر پہلے ہمارے حوصلے پست ہونے پر سخت سست کہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر دائرے کے عین وسط میں رکھا یہ داہنا ہاتھ تھا اور ہمیں حکم ہوا کہ باری باری ہم اس عزم کے ساتھ اپنا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ پر رکھتے جائیں کہ ہمیں یہ مہم چند دنوں میں سر ہی کر لینی ہے۔ دس ہاتھ جو صرف لڑکیوں کے تھے جب رکھے جا چکے تب لڑکوں نے گاؤن سے اپنے اپنے دائیں ہاتھ کو چمکانا شروع کیا اور دل میں خداوند تعالیٰ کے حضور خشوع و خضوع سے یہ دعا مانگی کہ آخری لڑکی کے ہاتھ پر پہلا ہاتھ اس کا ہو۔ مگر جہاں طاہرہ ہو وہاں مرضی صرف طاہرہ کی ہوتی ہے انہوں نے ہر لڑکے کی دلی دُعا کا فوری اندازہ لگاتے ہوئے سلیم مُراد کی فائل سے اپنے بائیں ہاتھ کی مدد سے ان کا ٹیوٹوریئل نکال لیا جو حسبِ روایت کسی دوسرے کا نکلا جسے سلیم مُراد چرا کر نقل کر لیا کرتے تھے اور پکڑے جانے پر معصومیت سے کہتے یہ خود میری فائل میں آ گیا تھا۔ یقین کرو۔

ہم لاکھ اُن دنوں معصوم تھے پر اتنے بھی نہیں کہ سلیم مراد کی اس بات پر یقین کر لیتے۔ انہیں سخت سست کہتے فائن کرتے اور اگلی چوری تک معاف کر دیا کرتے۔ بہرحال اس ٹیوٹوریئل کو جو شہریار کا تھا زلیخا کے اوپری ہاتھ پر رکھ کر شہریار سے کہا کہ اپنا چمکایا ہوا

دایاں ہاتھ اس ٹیوٹوریئل پر رکھ دو اب تو شہریار کو سخت غصہ آیا کہ ایک تو یہ کمبخت ٹیوٹوریئل چوری ہوگیا دوسرے یہ اس وقت پردے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت کو کوسا جس غلط وقت اس نے اسے تحریر کیا تھا۔ اس کے بعد بقیہ لڑکوں کے ہاتھ رکھے گئے۔ طاہرہ نے کہا، خلوص دل سے عہد کرو کہ اب ہم سب کی زندگی کا اوّلین اور واحد مقصد مجاہد صاحب کی شادی ہی ہوگا۔ اوّلین پر تو ہم سب فوراً متفق ہوگئے لیکن واحد مقصد پر کچھ ہچکچاہٹ اور بے چینی دیکھنے میں آئی لیکن ہم سب کو با آوازِ بلند یہ عہد کرنا تھا جو ہم نے چارو ناچار کیا۔ ہوا اور مٹی کے علاوہ اُس وقت دُور دُور راہداری میں بھی کوئی نہیں تھا اور ابھی تو میجر آفتاب کی لاٹھی بھی ٹک ٹک کرتی جلوہ افروز نہیں ہوئی تھی جو اس بات کا اعلان ہوتی کہ لڑکے لڑکیو درمیان میں تین فٹ کا فاصلہ رکھو یہاں تو ہاتھ پر ہاتھ اور دائرہ خاصا تنگ بلکہ شانہ بہ شانہ تھا۔

جانے ہوا نے یا مٹی نے اس لڑکی تک یہ پیغام دیدیا کہ اب تیار ہو جاؤ تم ''استانی'' بننے والی ہو۔ مگر طاہرہ کا کہنا تھا کہ یہ دراصل ہماری خشوع و خضوع کا پھل تھا۔ ہم نے ہمیشہ کی طرح طاہرہ کی باتوں پر ہی یقین کیا۔ چند ہی دنوں میں شادی طے بلکہ ہو بھی گئی۔

اُس پہلے دن ہم نے جامعہ میں سکھ کا سانس لیا۔ اور طاہرہ کی حالت تو ایسی تھی کہ جیسے بیٹی بیاہنے پر ماں باپ گھوڑے بیچ کر سو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سکون وقتی تھا۔ چوتھے دن گل شیر نے ہمیں آگاہ کیا کہ مجاہد صاحب دفتر میں بیٹھے ہیں۔ ہمارا تو جی ہی ڈول گیا۔ کہیں گاندھی، جناح کی طرح ان دونوں میں ٹھن تو نہیں گئی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ اپنے استاد نے آنیوالی استانی کو پہلے ہی دن تحریک پاکستان کی رُوداد نہ سنا دی ہو۔ تقسیم بنگال کے اسباب، قائداعظم کے 14 نکات اور کیوں 14 ہی نکات۔

کرپس مشن کی آمد، پیسہ اخبار، لیتھو مشین، مولانا حسرت اور مولانا ظفر علی خان کی صحافت کا قصہ نہ چھیڑ دیا ہو اور استانی جی ناراض ہو کر چلی گئی ہوں۔

طاہرہ نے جھانک کر دیکھا وہ اطمینان سے بیٹھے حسب معمول موٹی سی کتاب پر جھکے

رومال ناک پر رکھے غرقِ مطالعہ تھے۔ طاہرہ نے کیا سر پیٹا ہم سب نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن طاہرہ بھی کسی خاص ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً رضیہ بوندرے کو طلب کیا جو بعد میں رضیہ بھٹی بن کر اب مرحوم ہوچکی ہے۔ اس کے والد منوڑا میں تعینات تھے۔ اور ان کے پاس ایک خوبصورت ہٹ اور قبضے میں کئی عدد کشتیاں بھی تھیں۔ حکم صادر ہوا کہ ہٹ فوراً بک کی جائے۔ بوٹ کا انتظام کیا جائے اور ابا جان سے کہا جائے کہ کھانا بہت ہو اور مزیدار بھی ہو۔ طاہرہ کی ہدایات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ہماری کم عقلی سے پہلے ہی آ گاہ تھیں ایک اور فوری طلب کردہ میٹنگ میں ہمیں سمجھایا گیا کہ ان دونوں شادی شدہ جوڑے کو رومانوی مقام تک پہنچانا ازحد ضروری ہے تا کہ یہ شادی کامیاب ثابت ہو۔ استانی جی کی عادت ومزاج، پسند ناپسند کا ہمیں تجربہ کم تھا لیکن اپنے استاد سے خطرات زیادہ تھے کہ جناح گاندھی ملاقات اور اس کی باریکیوں پر طرح طرح سے روشنی ڈالنا ان کا محبوب موضوع تھا۔ اور یہ موضوع جب ہمیں ہی پسند نہیں تھا تو نئی نویلی شادی شدہ استانی کو بھلا کیسے پسند آ سکتا تھا۔ ہم منوڑہ پہنچے۔ حسب ہدایت سب کچھ بہترین تھا۔ ہمیں سارا انتظام پسند آیا۔ رضیہ بوندرے کی فوری ترقی ہوگئی اب وہاں جا کر طاہرہ کی دوستی رضیہ سے زیادہ اور ہم سے کم تھی۔ ہم دوسرے گروپ سے جا ملے تھے۔ مگر طاہرہ بھی شاید ہماری جدائی کی متحمل نہ تھیں کہ اچانک انہوں نے ہم پر بھی عنایت کی کہ جس بوٹ میں ان دونوں کو بٹھایا گیا طاہرہ کے ساتھ ہم بھی شریک سفر ہوئے اور رضیہ کو یہ کہہ کر دوسری طرف جانے کیلئے کہا گیا کہ انگریزی گفتگو سے پرہیز ضروری ہے کیونکہ انگریزی میں رومانی فضا بوجھل ہو جاتی ہے۔ دوسری تمام کشتیاں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم نے راستے میں ڈھول بجا کر فلمی شادی کے کئی گانے گائے کئی بار مجاہد صاحب کی توجہ ان مچھلیوں کی طرف مبذول کرائی گئی جو اُچھل اُچھل کر بوٹ میں آ کر ہماری ساتھی بننا چاہ رہی تھیں۔ دونوں سے کہا گیا کہ ذرا جھک کر سمندر کے پانی میں ہاتھ ڈالیں اور دبی دبی دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں۔ پھر آسمان پر چودھویں

کے چاند پر بھی نظر ڈال کر رہی سہی رومانی کسر پوری کریں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ مجاہد صاحب نے ہماری ہدایت کو بغور سنا ہی نہیں بلکہ اس پر محتاط انداز سے عمل بھی کیا۔ طاہرہ کی واضح ہدایت یہ بھی تھی کہ بھولے سے اپنے ذہن میں جامعہ کی کوئی یاد نہ آنے دیں۔ کلاس روم کے بارے میں سوچنا گناہ قرار پایا انعام الرحمٰن صاحب کو ان خوبصورت لمحات میں حرفِ غلط کی طرح ذہن سے نکال دیں۔ پڑھنے لکھنے کی ہر بات سے گریز کریں ورنہ دوا کا اثر نہ ہوگا میجر آفتاب کی ہدایت تین فٹ کا فاصلہ غیر شرعی قرار دیا گیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ جتنے بھی عاشقانہ شعر یاد ہوں با آوازِ بلند پڑھے جائیں اور تو اور طاہرہ نے تو چودھویں کے چاند کو بھی قسم دیدی تھی کہ آسمان پر مستقل موجود رہنا اور جب تک یہ دونوں ایک جان دو قالب بننے اور ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہ کھالیں ہرگز غروب نہ ہونا۔ سمندر کی لہروں کو بھی ہدایت تھی کہ لانچ سے ٹکراتے ہی چھینٹے اس زور سے اڑانا کہ ہم محفوظ رہیں۔ اور یہ دونوں اس میں بھیگ جائیں۔ ظہور بھوپالی سے کہا گیا کہ کوئی تقریر نہیں ہوگی۔ شہریار کو ہدایت تھی کہ تمہیں مسکرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زلیخا سے کہا گیا کہ اللہ سے رشتہ جوڑو اور دعاؤں میں مصروف ہو جاؤ سلیم مراد کو ہدایت کی گئی کہ بلاوجہ بلا موقع بولنے کی عادت کو کنٹرول میں رکھو۔ عزت اللہ کو کچھ عزت کی ہی قسم دی گئی کہ بولو کم اور سمجھو زیادہ روحی، گیتی، مہر تینوں انگریزی میڈیم سے کہا گیا انگریزی کی سختیوں سے پرہیز رکھو۔ مجھے بار بار ہدایت دی جاتی رہی کہ شعر پڑھو تو عشقیہ اور یہ کہ علامہ اقبال کو قطعاً بھول جاؤ۔ میرے یادشدہ اشعار میں پہاڑ کی بلندی۔ خودی کا اعتراف یا شاہین کی اڑان کا ذرا سا بھی شائبہ ہوتا تو طاہرہ کی غضبناک آنکھیں مجھے یہ دھمکی دیتی محسوس ہوتیں کہ اٹھا کر کالے سمندر میں پھینک دیا جائے گا فاتحہ نہ درود۔

طاہرہ اپنی ہدایت نشر کرنے کے بعد اس جوڑے پر بلاواسطہ نظر رکھے ہوئے تھیں۔ اور اس وقت تو غضب ہوگیا جب مجاہد صاحب نے ایک بے ضرر سی الائچی جیب سے نکال کر استانی جی کے منہ میں ڈالی طاہرہ نے خوش ہو کر تالی بجائی ہم سب کو ان کی تقلید کرنی

پڑی۔ یوں جو سماں پیدا ہوا تو ہم سے قسم لے لیجیے کہ ہم نے زندگی میں اپنے آپ کو اتنا بڑا فاتح محسوس نہیں کیا تھا اور اتنی خوشی کبھی ہمارے حصے میں نہیں آئی تھی۔ چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ماشاء اللہ وہ چار بیٹیوں کے ابا اماں ہیں اور ہماری شادی میں بھی کوئی رخنہ نہیں پڑا کیونکہ پہلے ہم نے اپنے صدرِ شعبہ کی شادی کرا دی تھی۔ جامعہ میں ہماری عزّت دو چند ہوگئی۔ اور بقول طاہرہ کہ اب اردگرد کے شعبے کے لوگ ہمیں بھی عزت کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔

یہ سال گولڈن جوبلی سال ہے 50 سال گزر چکے ہیں۔ ہم دنیا کے کونے کونے میں بکھر گئے ہیں۔ لیکن شعبے کی راہداری میں تیز ہوا اور طوفان کے جھکڑ میں بیٹھے ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے عہد لیتے اب بھی اپنے آپ کو یاد آ جاتے ہیں۔

ہاتھ تو اِدھر اُدھر ہو گئے مگر عہد آج بھی جوان ہیں۔

ہم سب جہاں ہیں اپنے اپنے جہان میں خوش اور آباد ہیں۔ اور ایک دوسرے کی یاد کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اور میں اپنے اردگرد طاہرہ کو اس طرح محسوس کرتی ہوں کہ جیسے وہ کوئی دوسری نہ ہو میرے ہی وجود کا حصہ ہو۔ مگر چھوٹی سی زندگی میں لمبے لمبے فاصلے قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔

(اپریل 2005ء میں سابق طالب علموں اور اساتذہ کے درمیان ہوٹل مہران میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆

زیرِ لب

میں سمجھتی ہوں کہ ہر بچے کا یہ پیدائشی حق ہوتا ہے کہ جب وہ دنیا میں آئے تو اس کے دائیں اور بائیں ہاتھ تھام کر چلانے والے دونوں افراد جو ماں اور باپ کہلاتے ہیں ضرور موجود ہوں۔ بچہ باپ کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر اس کے شجرۂ نسب کا حصہ بن جاتا ہے اور یہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ ماں سے وہ زندگی کے ضروری کام سیکھتا ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو کیوں نہ ہو؟ یوں تو اللہ کے ہر فیصلہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ مصلحت کا علم انسان کو ہو۔ کیونکہ انسان کا علم ناقص ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے یہ جاننے کی زندگی بھر کرید رہی کہ آخر میرا دایاں یا بایاں ہاتھ پکڑ کر چلانے والا میرا باپ کیوں نہیں ہے۔ میں نے زندگی بھر اس بات کا شکوہ اپنے اللہ سے کیا ہے اور کرتی رہوں گی کہ اس کمی نے زندگی کا سب سے خوبصورت اور دلکش احساس مجھے محسوس ہونے نہیں دیا۔

میں دنیا میں آئی۔ میرا نام میرے باپ نے دیا بلکہ میری تاریخ پیدائش درج کرتے ہوئے اپنی ڈائری کا ایک پورا صفحہ میرے نام کیا اور لکھا یہ بیٹی ''نخلِ باغِ آرزوئے دل ہے۔'' مگر پیشتر کہ بیٹی یہ جملہ پڑھنے کے قابل ہوتی یا بیٹی کی آنکھیں پہچانتیں۔ انگلیاں اسے ٹٹولتیں۔ اس کی خوشبو سے لپٹتی۔ وہ شخص ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بعض لوگ بعض کام بہت غلط وقت پر کرتے ہیں میرے باپ نے بھی اپنے لوٹ جانے کا وقت غلط چنا۔ ہندوستان تقسیم ہو رہا تھا۔ ایک نیا ملک بن رہا تھا۔ جس کے بننے میں اس نے بحیثیت ایک طالبِ علم جدوجہد بھی کی تھی۔ صدیوں سے آباد اس کا خاندان ہجرت کر کے اس نئے ملک میں آ گیا۔ مجھے اس کی بھی شکایت نہیں کہ زمانہ اکثر قیامت کی چال چلتا ہے۔ مجھے معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں کی بھی کوئی شکایت نہیں۔ وہ محل دو محلے۔ وہ

باغ، کھیت، کھلیان، عہدے، پیشے، شناخت، پہچان سب سرحد کے اس پار رہ گئے اور یہاں بس ہم اپنا ذاتی نام لے کر ایک نئی شناخت بنانے کے لیے آ گئے۔ مجھے ان محلوں دو محلوں سے واقعی کوئی لگاؤ نہیں۔ مگر میں اُن دیواروں میں رچی بسی اس خوشبو کو سونگھنے کا تو حق رکھتی تھی جو میرے خاندان کی خوشبو تھی۔ میں اس چھت کے نیچے رہ کر کچھ خواب تو دیکھ سکتی تھی۔ وہ آوازیں دالانوں اور صحن میں کہیں نہ کہیں تو موجود ہوں گی۔ انہیں سنتی، وہ آسمان، وہ زمین، وہ موسم تو میں ضرور محسوس کرنا چاہتی تھی جہاں سے میرا خمیر اٹھا تھا۔ میں اس چاند سے باتیں کرنا چاہتی تھی جو میرے آنگن میں روز اترتا تھا۔ میں ان ستاروں کو اپنے آنچل میں سمیٹنا چاہتی تھی جو ساری رات جلتے بجھتے تھے وہ شاید مجھ سے باتیں کرنا چاہتے رہے ہوں۔ میں ان کتابوں کا پیوں اور دیگر اشیاء کو ہاتھ تو لگاتی جس کا لمس میرے لوگوں کا لمس تھا۔ کچھ ورثے میرے لئے تھے اسے مجھے اپنے نام کرنے تھے۔ کچھ تحریریں جو شاید میرے نام ہوتیں۔ جنہیں میں پڑھنا چاہتی تھی۔ میرے آنگن کے درخت جن پر آم، جامن، شریفے، امرود کروندے اور دوسرے پھل لگتے جو ہمارے صحن میں برسوں سے ایستادہ تھے۔ مجھے ان پھلوں کو چکھنا تھا۔ ان کی شیرینی ان کا کھٹاپن۔ ان کا کچّا پن مجھے ان سب کا مزہ لینا تھا۔ مجھے نیم اور پیپل کے سائے میں بیٹھنا تھا۔ مجھے موگرے، گلاب کی کیاری میں پانی دینا تھا۔ رات کی رانی اور ہار سنگھار کے پھول صبح سویرے چاندی کے کٹورے میں بھرنے تھے۔ کچے صحن کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے اپنے وجود میں سمونی تھی۔ گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکے اور صراحی جو چنبیلی کے پھولوں کے ہار پہن کر صحن کی شان بڑھاتے تھے۔ ان کا پانی چاندی کے اس کٹورے میں پینا تھا جو اس پر اوندھا کر رکھے جاتے۔ زنجیر والی کنڈی کو ہلا ہلا کر بجانا تھا، خوش ہونا تھا، رونا تھا، سونا تھا، مجھے حسن منزل کو اپنی ملکیت کہنا تھا۔ اپنے آنگن کے کنوئیں میں اپنا عکس دیکھنا تھا۔ مجھے آبائی حویلی کی دیوار پھلانگ کر گنّے کے کھیت، آم کے باغ، سنگھاڑے کے ڈھیر دیکھنے تھے۔ مجھے غازی پور اور علی گڑھ کی تمام روایتوں کو محسوس کرنا تھا تو کیا یہ سب کچھ میرا حق نہ تھا۔ مگر محسوس کرنے سے پہلے میں وہاں سے جُدا کر دی گئی۔ میں آج تک اس فیصلے کو پورے طور پر قبول نہیں کر پائی۔ میں ہجرت کرتی، میں ضرور یہاں آتی، میں پاکستان کو ہی اپنا وطن

بناتی۔ لیکن اپنے کئے ہوئے فیصلے کے بعد۔ میرے لیے جس نے بھی یہ فیصلہ کیا مجھے زندگی بھر اس سے شکایت رہی اور رہے گی۔ میری زندگی سے جُڑے سارے فیصلے دوسروں نے کیے۔ غلط وقت پر کیے اور مجھے نظر انداز کر کے کئے اور یہ دوسرے مجھے کبھی اچھے نہیں لگے کیونکہ وقت نے ثابت کیا کہ یہ لوگ میرے تھے ہی نہیں۔

میری عمر صرف چند سال کی تھی مجھے نہ اپنے نام کی ہجے آتی تھی نہ مفہوم کہ مجھے تو اسی عمر سے اپنے آپ جینے کا قرینہ سیکھنا تھا۔ اماں جائے نماز پر بیٹھی اللہ سے جانے کیا کیا باتیں کیا کرتیں۔ چھوٹے بھائی اور بڑی بہن سب ہی کٹی پتنگ کی طرح ادھر اُدھر کسی نہ کسی چھت، کسی درخت کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ میں نے اسی عمر سے خواب دیکھنا شروع کئے۔ میرے خواب کی ابتدا میں میری کسی اپنی خواہش کے بجائے ضرورت کا دخل تھا۔ اور ہر ضرورت کا سرا اپنے باپ سے جا کر جُڑ جاتا۔ مجھے پڑھنا تھا، نام کمانا تھا، خاندان کے بنائے ہوئے اصولوں کو برتنا تھا۔ اور بس اپنے آپ کو سڑک کے اس کونے تک پہنچانا تھا جہاں میرا خیال تھا کہ میرے ابا کھڑے ہوں گے اور جب میں سڑک پار کر کے ان تک پہنچوں گی تو وہ مجھ سے پوچھیں گے۔ تم نے کیا پڑھا ہے تم نے آج تک کیا کیا ہے؟ میں اپنے جاننے میں سارے وہ کام کر رہی تھی جو کام انہیں پسند آ سکتے تھے۔ چونکہ کوئی خوبی مجھ میں اللہ کی طرف سے ودیعت نہیں ہوئی تھی اسی لئے جو کچھ بھی کیا بس یونہی سا کیا۔ لیکن یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ میرے ابا کا نام حسن عبداللہ ہے جو کم عمری میں انتقال کر گئے اور جو اپنے عہد اور اپنے شہر کے نامی گرامی شخص تھے۔ جو لوگوں کے دلوں میں بستے تھے جن کی خوبیوں سے ہر شخص واقف تھا اور ہر محفل میں ان کا تذکرہ تھا۔ ہر بڑا اور چھوٹا انہیں جانتا تھا اور ان کے لئے اچھے جذبات و الفاظ رکھتا تھا۔ میں اسی غرور کو لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سیڑھیاں چڑھتی عملی زندگی میں آ گئی۔ معاشیات پڑھی، پڑھائی، ادب پڑھا، صحافت میں چکر لگایا۔ تحریر و تقریر اور پھر ایک درسگاہ میں جا کر پناہ ڈھونڈ لی، زندگی کے چالیس سال اسے دے دیئے۔ ایسے دیے کہ وہ زندگی کا جزو نہیں بلکہ میری زندگی ہی بن گئے۔

ان سب دنوں کے گزارنے میں یہ توفیق نہ ہوئی کہ باپ کی ہاتھ آئی ایک نامکمل

ڈائری پر کچھ کام کرڈالوں۔ فرصت کے رات دن تلاش کرتی رہی جو نہ ملے۔ شادی اور بچوں نے میرے چوبیس گھنٹوں میں سے پچیس گھنٹوں پر قبضہ کرلیا۔ دراصل میں بنیادی طور پر صرف ایک عورت تھی۔ گھر' شوہر اور بچے میری چاہت کے تکون تھے۔ میں نے اپنا رات دن اُن پر لُٹا دیا اور اب۔ اب جب کہ تمام ذمہ داریاں نبھا چکی تو بہت سا پانی پُلوں سے بہہ چکا تھا۔ وہ سب لوگ جو میرے ابا کو جانتے تھے ان سے ملنے ان کے پاس چلے گئے۔ ان پر لکھنے والا اور ان پر بولنے والا کوئی نہ بچا۔ وہ سارے خاندانی رشتے جن میں میری تین پھوپھیاں اور میری ماں شامل تھیں۔ جو میری زندگی کا محور اور عزیز از جان تھیں وہ بھی چلی گئیں۔ یہاں میں کہدوں میں ان سب کی گنہگار ہوں۔ کاش جو کچھ میں آج کرنے چلی ہوں ان کی زندگی میں کر لیتی تو میں اپنی پھوپھیوں کی گود میں سمٹ کر خوب روتی اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر اتنی گہری سانس لیتیں کہ میں ان سانسوں کے ذریعہ اپنے ابا کے لمس کو محسوس کر لیتی۔ اپنی اماں کے ہاتھوں میں یہ کتاب پکڑاتی تو میری اماں اپنے دن بھر کی نمازوں اور تسبیح سے جو چند لمحوں کا خالی وقت پاتیں تو یہ کتاب سینے پر رکھ کر آنکھ بند کرلیتیں۔ اپنی جوانی کے وہ چند سال یاد کرتیں جو انہوں نے میرے ابا کے ساتھ گزارے تھے اور پھر آنکھیں کھولتیں جو بھی سامنے ہوتا کہتیں۔ دیکھا میری بیٹی کو' ابا کی لاڈلی کو' اس نے ہی وہ کام کیا جو کوئی اور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بتاتیں۔ تمہیں ابا بہت چاہتے تھے۔ ہر وقت گود میں لیئے ہوتے مجھ سے کہتے اسے مجھے دے دو۔ بس یہ میری ہے۔ میں کہتی اور بھی تو بچے ہیں اس میں کیا خاص بات ہے۔ تب وہ کہتے ''میری آنکھیں جو دیکھ رہی ہیں وہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔'' میں شرما جاتی' میں ڈر جاتی' ہائے ابا مجھ میں کیا دیکھ رہے تھے۔ کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ میں انہیں کتنا مایوس کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں کتنا دکھ دیا ہوگا۔ میں نے محبت کا وہ سارا زمانہ گزار دیا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ بس میرے اور میرے لوگوں کے بچے ہیں۔ کیا وہ میری قربانیاں سمجھیں گے کہ میں نے اپنے ابا کا وقت بھی ان پر وار دیا۔ اور کیا وہ اپنا وقت مجھ پر گزاریں گے۔ شاید نہیں کہ نسلیں ترقی کر رہی ہیں۔ سمجھ دار ہوگئی ہیں کہ ترقی میں پیچھے نہیں آگے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو وقت دیں گے کہ ہم تو گزرا زمانہ ہوں گے۔ آہ! سارا زمانہ ہمارے ہی

عہد میں بدلنے کو رہ گیا تھا۔

چلیے آگے بڑھیئے آپ مجھ سے پوچھیے تو سہی میرے ابّا کا یہ کلام میرے ہاتھ کیسے آ گیا؟ میں تو اپنے آپ سے یہ بھی پوچھتی ہوں کہ میری ولدیت ہندوستان سے سفر کرتے وقت مجھ سے کسی نے چھین کیوں نہ لی۔ جیسے میرے باپ کے محل دو محلے زمینیں جائیداد باغ، کتابیں، کپڑے، تصویریں، میرا بچپن، غرض کہ میری زندگی، میرا بھرا پُرا گھر۔ میں نے کئی گھروں میں اپنے باپ کے نام سے جُڑی چیزیں دیکھیں ہیں۔ لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ میرے مکان پر اپنے نام کا بورڈ لگائے ہوئے ہیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں کہا یہ تمہارے ہیں۔ تمہارے باپ کے ہیں۔ وہ صرف یہ اقرار کر لیتے ہم ان سے یہ سب چھین تو نہ لیتے۔ چند بوسیدہ کاغذات، پاسپورٹ، مختلف سندیں، تحریریں، شاعری کے صفحات اور ایک بالشت برابر ڈائری، جس کے صفحات کبھی شاید سفید رہے ہوں اب زمانے کی پیلاہٹ کا شکار ہیں مجھے خواب میں یہ تمام چیزیں کسی فرشتے نے چپکے سے دیدیں۔ اور میں نے انہیں اس طرح سنبھالا کہ پھر خود بھی کبھی بھول کر نہ دیکھا۔ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوئی تو اسے یوں تھامے رکھا جیسے یہ ابھی ابھی پیدا ہوا میرا بچّہ ہے۔ اور سواری میں بیٹھ کر یہ دعا مانگ کر دوسرے گھر تک سفر پورا کیا کہ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ میں ان کاغذات سے محروم نہ ہو جاؤں کہ پھر تو میں بالکل ہی مفلس ہو جاؤں گی۔ میں تو بس مر ہی جاؤں گی۔ واقعی میں نے محسوس کیا کہ پھر ہرگز جی نہیں پاؤں گی۔ یہ کاغذات ہمیشہ میرے پاس حفاظت سے رہے اتنی حفاظت سے کہ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔ بس یہ عہد دل ہی دل میں ہمیشہ رہا کہ ایک دن میں اسے ترتیب دے کر ''افکارِ حَسَن'' نام دوں گی۔ شاید وہ وقت اللہ نے اب ہی رکھا تھا کہ میں جیتی رہی، صدی بدل گئی اور میری ماں مر گئی۔

''افکارِ حَسَن'' کی ترتیب میں صفحات پلٹتے وقت میری انگلیوں کی تھرتھراہٹ، میرے دل کی دھڑکنیں اور میری آنکھوں کی برسات، میں شاید ان کٹھن لمحوں کا بیان الفاظ میں نہیں ڈھال پاؤں گی۔

کاغذات کا ایک دوسرے سے چپکنا دراصل اس پر وقت گزرنے کی داستان سے متعلق ہے۔ حرف مٹ گئے ہیں۔ مگر ہر تحریر ہر غزل سے پہلے مقام، موقع، شہر، تاریخ اور

کس کی فرمائش پر لکھا گیا اس طرح درج ہے کہ بند آنکھوں سے کہانی کی روانی پڑھی جاسکتی ہے۔ وہ کب کہاں کس کس سے ملے' کس کے کہنے پر لکھا' کس موقع پر لکھا' کس شہر میں گئے۔ کب کب ہم سے دُور رہے۔ کتنی داد پائی یہ تو ہم نہ جان سکے لیکن اس زمانے کی شاعری کے معیار سے اس کے معیار کو ملایئے اور پھر فی البدیہہ شاعری کو مدِّ نظر رکھ کر ان کی شعر گوئی پر بلا کی گرفت کو محسوس کریں۔ وقت نے مہلت دی ہوتی تو آج تک ان کی زندگی میں کتنے مجموعے آئے ہوتے۔ کتنی تنقیدی کتابیں چھپتیں' ان کا ادب میں یقیناً کوئی مقام بن چکا ہوتا۔ مگر جانے کی جلدی میں بس وہ اپنی یہ چھوٹی سی ڈائری' چند چھپے ہوئے کاغذات اور کچھ ادھوری تحریریں چھوڑ گئے' یا ہوسکتا ہے کہ وہ اور بھی بہت کچھ چھوڑ گئے ہوں۔ اپنے وسیع گھر کی عظیم لائبریری میں ان کی ذاتی کتنی ہی تحریریں دب کر رہ گئی ہوں اور ہم تک پہنچنے سے قاصر رہ گئی ہوں۔ ان کی چیخیں مجھے بارہا سنائی بھی دی ہیں لیکن ملبے میں دبی زندگی زیادہ دیر زندہ کہاں رہتی ہے؟

میں ان بُری اولاد میں سے ایک ہوں جس نے اپنے باپ کی قبر تک نہ دیکھی۔ ان کی گزرگاہوں پر چل کر قدم پر اپنے قدم بھی نہ رکھے۔ اس شہر کو بھی نہ دیکھا کہ جس سے انہوں نے عشق کیا اور جہاں وہ آسودۂ خاک بھی ہوگئے۔ میں شاید آج بھی اس ملک جاؤں' اس شہر جاؤں' علی گڑھ جاؤں' اس گھر جاؤں' یونیورسٹی کے قبرستان میں اس قبر کے سرہانے کھڑی ہوں تو اپنے آنسوؤں کے سمندر میں غرق نہ ہو جاؤں کہ میں بھی تو اپنے اَن دیکھے ابا کے عشق میں دیوانی ہوچکی ہوں۔ میں ایسا عشق پھر کسی سے نہ کر پائی۔ اپنی ماں سے بھی نہیں جو اگر میری زندگی میں دیر تک نہ ہوتیں تو میں اللہ سے باغی ہو جاتی اور کُفر بکنے لگ جاتی۔ اپنے شوہر' اپنے بچوں سے بھی نہیں' اپنی پھوپھیوں سے بھی نہیں' اپنی بہن اور اپنے بھائیوں سے بھی نہیں' اپنے دوستوں سے بھی نہیں جو میری زندگی میں مجھے جینے کا بھرپور حوصلہ دیتے ہیں۔ اور میں جنہیں بہت بہت چاہتی ہوں۔ لیکن میں اپنی ان تمام چاہتوں کا مقابلہ اس شخص کی چاہت سے کیسے کروں جو میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں اور میری ساری زندگی اپنے ساتھ لے گیا۔ ساری چاہت اپنے نام کرا گیا۔

اس نے مجھے اپنا نام دیا شناخت دی' میں اس کی شکرگزار ہوں۔ اس نے مجھے اپنا

جیتا جاگتا وجود اور پھیلی ہوئی بانہیں اور اپنی گود نہیں دی۔ آج میں ان تمام محرومی کے باعث جس قدر کم علم اور کم سمجھ ہوں اس کی ہی مطابقت سے اپنا چھوٹا سا' دیر سے کیا ہوا کام ''افکارِ حَسَن'' کے نام سے اس کے حضور پیش کر رہی ہوں۔ اس کی ''نخلِ باغِ آرزوئے دل'' ہونے کا دعویٰ ہے مگر ایک ایسی کام چور اور نالائق طالبِ علم کے طور پر جس نے اپنا ہوم ورک وقت پر نہیں کیا میں اپنے ابا سے مخاطب ہوں۔

''سینٹ جانس کالج آگرہ کے پروفیسر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کنٹرولر اور اسٹیوارڈ حسن عبداللہ صاحب آپ جو بھی سزا اس کے لیے تجویز کریں' آپ کی اس نالائق بیٹی کو بسر و چشم قبول ہے۔ مگر میرے ابا ''افکارِ حَسَن'' کو میرے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیجیے۔ اس میں باقی رہ جانے والی غلطیوں کو نظر انداز کر دیجیے۔ اس بات کی داد دیجیے کہ وقت کی بہت پابند آپ کی بیٹی نے بہت وقت گزر جانے کے بعد بھی آپ کے افکار کو بے نشان نہیں چھوڑا۔ ذرا سا مسکرا دیجیے اور میری ماں سے کہیے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں سے نہلا دھلا کر اور سفید لباس پہنا کر آپ کے پاس بھیج دیا ہے کہ ان کی مُنّی نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا کام کر دیا ہے۔ میں ان کا جواب جانتی ہوں وہ کہیں گی ''یہ کام تو صرف میری مُنّی ہی کر سکتی تھی۔'' بس یہی تو میری محنت کی اُجرت ہے۔ مگر ابا آپ میری زندگی بھر کے اس واحد کارنامے پر مجھے کس طرح داد دیں گے کہ میں تو آپ کو جانتی ہی نہیں اور ساری زندگی اسی خواہش میں گزار دی کہ میں آپ سے ملی ہوتی اور آپ کو جانتی۔ آپ نے جتنی زندگی گزاری اس میں میں نہیں تھی اور جو زندگی میں نے گزاری اس میں آپ نہ تھے۔ مگر شجرۂ نسب کہتا ہے کہ ہم باپ بیٹی تھے۔ آپ نے مجھے نام دیا آج میں آپ کو اپنا کام دے رہی ہوں۔ آپ کے مرتبے سے بہت کم اور میری صلاحیتوں کے مقابلے میں بڑا کام۔ آپ کے افکار آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں قبول کیجیے۔

(9 اگست 2007ء ''افکارِ حسن'' کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا۔
یہ تقریب زیرِ صدارت جمیل الدین عالی اور ذاکر علی خان منعقد ہوئی۔)

☆☆☆☆

ISBN: 978-969-500-079-9

میرے قلم سے اور بھی

ترجمہ: A Text Book of Economic Theory by Stonier & Hague for BA - MA

کتابِ معاشیات ــــــــــ انٹر کامرس کیلئے

صلیب کے زخم ــــــــــ ناول

افکارِ حسن ــــــــــ مرتب

زندگی بھر کی بات ــــــــــ ناول زیرِ طبع

WELCOME GROUP OF PUBLICATIONS

WELCOME BOOK PORT
Main Urdu Bazaar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 2633151, 2639581
Fax:(92-21) 2638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WELCOME BOOK SHOP
Shop #2, Belhasa Bldg. 1, Sh. Hamdan Colony,
Karama, P.O.Box: 27869, Dubai, U.A.E
Tel: (9714) 396 1016 Fax: (9714) 396 1015
Email: welbooks@emirates.net.ae
Website: www.welbooks.com